ڈاکٹر سید عبدالباری (شبنم سبحانی)
کی ادبی خدمات

(مقالہ برائے پی ایچ.ڈی)

مقالہ نگار

محمد اشہر انصاری

نگراں

ڈاکٹر محمد آصف زہری

مرکز برائے السنۂ ہند

اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔۱۱۰۰۶۷

2017

Litrary Contibution of
Dr. Syed Abdul Bari (Shabnam Subhani)

Thesis submitted to the Jawaharlal Nehru University in partial fulfilment of the requirement for the award of the degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

Submitted By

MOHD ASHHAR ANSARI

Under the Supervision of

Dr. MOHAMMAD ASIF ZAHRI

Centre Of Indian Languages

School Of Language, Literature and Culture Studies

Jawaharlal Nehru University

NEW DELHI - 110067

2017

JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY

Centre of Indian Languages
School of Language, Literature & Culture Studies
NEW DELHI-110067, INDIA

Dated : July/21/2017

DECLARATION

I hereby declare that the research work done in this Ph.D.Thesis entitled ***"Dr Syed Abdul Bari (Shabnam Subhani) Ki Adabi Khidmat" [Litrary Contibution of Dr. Syed Abdul Bari (Shabnam Subhani)] "*** by me is the original research work and it has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/Institution.

MOHD ASHHAR ANSARI
(Research Scholar)

Dr. MOHAMMAD ASIF ZAHRI
(Supervisor)
CIL/SLL&CS/ JNU

PROF. GOBIND PRASAD
(Chairperson)
CIL/SLL&CS/ JNU

انتساب

گلستانِ سوداگر کے سبھی

شاخ وثمر کے نام

نہ جانے کس کی دعاؤں کا فیض ہے مجھ پر
میں ڈوبتا ہوں تو دریا اچھال دیتا ہے

پیش لفظ

ڈاکٹر سید عبدالباری کی ہمہ جہت ادبی شخصیت سے متعلق ابتدا میں مجھے بہت زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ صرف مجھے اتنا علم تھا کہ وہ اردو ادب کی ایک عظیم ہستی اور میرے ہم وطن بھی ہیں۔ایک بار کا واقعہ یاد آرہا ہے میں گھر پر ہر سال عید کے موقعے پر منعقد ہونے والی نشست میں ان کو صدارت کے لئے مدعو کرنے گیا ہوا تھا، اس وقت میں ایم فل کا طالب علم تھا، وہ میرے موضوع کو سن کر کافی خوش ہوئے اور مجھے اپنا ایک تنقیدی مجموعہ ''نئی خوشبو نئے خواب'' عنایت کیا، جس میں ایک مقالہ کیفی کی انقلابی شاعری کے حوالے سے شامل تھا، شاید اسی لئے انہوں نے یہ کتاب مجھے دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ آپ کے کام آئے گی۔ میں نے اس مقالے سے کافی استفادہ کیا۔اس وقت تک میں ڈاکٹر عبدالباری کی ادبی شخصیت سے بہت کم واقف تھا۔صرف اسی کتاب کے حوالے سے انہیں جانتا تھا۔اسی طرح ان سے میری ایک دو ملاقاتیں اور ہوئیں۔ایک بار وہ اپنے وطن ٹانڈہ تشریف لائے ہوئے تھے، اس وقت میں پی ایچ ڈی میں داخل ہو چکا تھا اور ابھی میرا موضوع متعین نہیں ہوا تھا، اس لئے موضوع سے متعلق ان سے مشورہ بھی کیا۔انہوں نے ایک دو عنوانات تجویز کئے اور ایک دو کتابیں بھی دیں۔میری یہ ملاقات جولائی یا اگست میں ہوئی تھی اسی سال ۱۳ستمبر ۲۰۱۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا اور ان سے میری یہ آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے انتقال کے دوسرے دن میں ان کے گھر تعزیت کے لئے گیا۔ جہاں ان کی بے شمار کتابیں ان کے کتب خانے میں لگی ہوئی تھیں اور ان کا پہلا تحقیقی مقالہ ''اردو ادب کا تہذیبی تناظر'' میز پر رکھا ہوا تھا، سبھی لوگ اس کو باری باری سے ہاتھ میں لے کر پڑھ رہے تھے، میں نے بھی اس کو دیکھا اور جب اندر کے صفحات پر ان کی شخصیت اور ان کی تصنیف کردہ تمام کتابوں کا تعارف پڑھا، اس وقت مجھے پہلی بار ان کی غیر معمولی شخصیت کا اندازہ ہوا۔وہاں بڑے بڑے دانشوروں اور موجودہ عہد کے بہت سے ناقدوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔دوسرے دن ملک کے سبھی اخبارات، ہندی اردو اور انگیزی میں ان کے انتقال کی خبر شائع ہوئی اور کئی دنوں تک تعزیتی مضامین کے ساتھ ساتھ ان کی پر مغز شخصیت پر ادبی مضامین متواتر اخباروں اور رسائل میں شائع ہوتے رہے، جن کے مطالعے سے میرے اندر ایک طرح کا

تجسس پیدا ہوا اور مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی غیر معلولی شخصیت ہے جس کے دردوغم میں پورا ادبی حلقہ ڈوب گیا ہے۔ چنانچہ میں نے ان سے متعلق تفصیل سے جاننے کی کوشش کی اور ان کی تمام کتابوں کو جمع کیا نیز ان سے متعلق ان کے ہم عصروں اور ان کے گھر والوں سے مزید معلومات حاصل کی۔

ان کی تمام کتابوں کا مطالعہ کرنے اور ان پر ناقدانہ نظر ڈالنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر سید عبدالباری اردو ادب کی ایک قد آور شخصیت کا نام ہے اور ادارۂ ادب اسلامی کے ایک اہم ستون کی اہم حیثیت رکھتے ہیں بلکہ وہ اس تحریک کے روح رواں اور اس کے کل ہند صدر بھی رہ چکے ہیں اور تاعمر اسی نظریات کی آبیاری اپنی تحریروں میں کرتے رہے۔ انہوں نے شاعری پر بھی طبع آزمائی کی اور با مقصد اور اصلاحی شاعری کے ذریعے وہ قوم وملت کو اپنا مثبت پیغام تاعمر دیتے رہے۔ اس کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین سے بھی اندازہ ہوا وہ اس عہد میں ایک منفرد لب و لہجے اور انداز وفکر کے نقاد ہیں، جس میں ان کی ایک الگ شناخت ہے۔ ان کی تنقید نگاری کا محور ومرکز اسلامی نظریہ ادب اور عمرانیاتی نقطۂ نظر ہے، اسی میزان پر وہ پورے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنی نظریاتی وعملی تنقید میں بھی وہ اسی زاویہ سے ادب کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحقیق میں بھی لکھنؤ کے شعر وادب کا جائزہ اور بیسوی صدی کے اردو ادب کا جائزہ یہاں کی تہذیب وثقافت کے آئینے میں پیش کیا ہے۔ غرض اردو تحقیق وتنقید کی دنیا میں ادب کے تہذیبی، ثقافتی ومعاشرتی تناظر کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے معرکتہ الآرا تصانیف سے اردو ادب کے دامن میں وسعت بخشی۔ تحقیق و تنقید کے علاوہ صحافت کی دنیا میں بھی قابل قدر قلمی خدمات انجام دیں ہیں۔ ان کی صحافتی تحریریں اور اداریے اس عہد میں ایک دستاویز کی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی علمی وادبی خدمات صرف تحقیق وتنقید اور شاعری تک محدود نہیں ہیں ہے بلکہ انہوں نے متعدد جلیل القدر شخصیات کے خاکے بھی قلم بند کئے جن کے سبب ان شخصیات کی سیاسی، ملی اور ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی معاشرتی ثقافتی اور تہذیبی اقدار کی تاریخ بھی مرتب ہوگئی ہے۔ ان سب کے علاوہ ایک سوانح عمری اور سفرنامہ بھی تحریر کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کی ایک شناخت اسلامی اسکالر کی حیثیت سے بھی ہوتی ہے اور اس موضوع پر بھی انہوں نے متعدد کتابیں قلم بند کی ہیں۔ خاص طور سے ’’اسمائے حسنیٰ‘‘ کا شمار ان کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے جس میں انہوں اللہ تعالیٰ کے سبھی ناموں کی خصوصیات اور ان کی صفات کی وضاحت کی ہے۔

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی بیک وقت ایک محقق نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر ،صحافی اور بڑے اسلامی اسکالر ہیں۔آزادی کے بعد تحقیق وتنقید اور صحافت کو ایک نئی سمت دینے میں ان کا اہم رول رہا ہے،ان کی تمام گراں قدر خدمات کے باوجود ان کی کاوشوں اور کوششوں پر اہل فن کی نظر نہیں گئی ہے، جس کی وجہ سے اردو ادب کی دنیا میں ان کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کا کماحقہ اظہار نہیں ہو سکا۔دراصل انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ستائش،شہرت اور نام ونمود کی تمنا کئے بغیر بڑی خاموشی سے لکھا اور ادب کی آبیاری اپنے منفرد فکر ونظریہ سے تاعمر کرتے رہے۔وہ ان سب چیزوں سے بالکل بے نیاز تھے،یہی سبب ہے ابھی تک ادب میں ان کو وہ خاص مقام حاصل نہیں ہو سکا جس کے وہ حقدار ہیں۔اس کمی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور ان کی تمام کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان پر بھی تحقیقی کام ہو سکتا ہے بلکہ ہونا چاہئے ،کیوں کہ انہوں نے جس محنت ،خوش اسلوبی اور سچی لگن سے ادب کی گراں قدر خدمت انجام دی ہیں اس بناء پر انہیں ادب میں وہ مقام ملنا چاہئے ۔اسی وقت میں نے ذہن بنالیا کہ استاد محترم جناب آصف زہری صاحب سے اس موضوع سے متعلق مشورہ کروں گا۔ان سے میری گفتگو ہوئی اور انہوں نے بھی ان کی سبھی کتابوں کا مطالعہ کیا اور کئی دنوں تک غور وفکر کرنے کے بعد مجھے بخوشی اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت دے دی۔جو میرا بھی پسندیدہ موضوع ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کرنے کا مقصد صرف اردو ادب سے ان کی بلند پایہ شخصیت کو روشناس کرانا ہے،جس سے آئندہ بھی ان کے تحقیقی وتنقیدی کارناموں پر ریسرچ نئے نئے زاویئے سے ہوتی رہے اور ادب میں ڈاکٹر سید عبدالباری کی ادبی کاوشوں اور ان کی انفرادیت،مقام ومرتبے اور اہمیت و مقبولیت میں روز بہ روز اضافہ بھی ہوتا رہے۔چنانچہ میں نے اسی مقصد کے پیش نظر ڈاکٹر سید عبدالباری کی ادبی خدمات کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع منتخب کیا تاکہ ان کی تخلیقی ،تنقیدی،تحقیقی صحافتی اور تصنیفی خدمات کا مکمل جائزہ پیش کیا جاسکے اور ادب میں ان کے مقام ومرتبہ کا تعین ہو سکے۔

اس مقالے میں میں نے کافی محنت اور سچی لگن سے ڈاکٹر سید عبدالباری کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے فکر وفن اور نظریۂ ادب کو واضح کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔یہ مقالہ چھ ابواب میں منقسم ہے۔پہلے باب میں ڈاکٹر سید عبدالباری کی شخصیت اور ان کے عہد کا بخوبی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے ابتدائی حالات،تعلیم وتربیت سے لے کر شادی،ملازمت اور وفات تک کے سبھی واقعات جہاں تک میری رسائی ہو سکی

ہے قلم بند کئے گئے ہیں۔اس عہد میں وہ کن کن شخصیات سے متاثر ہوئے اور کس سے کتنا استفادہ ہوا،اور کتنی مشقتوں اور پریشانیوں کے بعد ان کی شخصیت میں یہ پختگی پیدا ہوئی اور بچپن سے لے کر طالب علمی تک ان کی ادبی سرگرمیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔دوسرے باب میں ان کی شاعری کا تنقیدی وفنی جائزہ ان کی نظموں اور غزلوں کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے،جس میں ان کی شاعرانہ اہمیت وانفرادیت کو واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے نیز یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ بحیثیت شاعر خاص طور سے ادارۂ ادب اسلامی یا تعمیری ادب کے شعرا کی صف میں ان کا کیا مقام ومرتبہ رہا ہے۔تیسرا باب جو ان کے تحقیقی وتنقیدی کارناموں پر مشتمل ہے،جس میں پہلے ان کے تحقیقی کارناموں کا تجزیاتی جائزہ پیش کیا ہے اور ان کے چاروں تحقیقی مقالوں پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے ادب میں ان تصانیف کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بحیثیت محقق ڈاکٹر سید عبدالباری کے مقام ومرتبے کا بھی تعین کیا گیا ہے۔اسی باب کے دوسرے حصے میں ان کی تنقید نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے،جس میں ان کی نظریاتی تنقید،ان کے افکار وخیالات اور نظریات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی عملی تنقید کے جابجا نمونے پیش کئے گئے ہیں۔تنقید نگاری جو ڈاکٹر سید عبدالباری کا سب سے اہم کارنامہ ہے،اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس باب میں ان کے نظریۂ ادب اور رجحانات کو خاص موضوع بنا کر موجودہ عہد میں ان کی تنقید نگاری کی اہمیت اور افادیت کو واضح کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

باب چہارم میں ڈاکٹر سید عبدالباری کے غیر افسانوی ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔جس میں ان کے خاکوں،سوانح نگاری اور سفرنامے کا تنقیدی وفنی جائزہ پیش کیا ہے اور اس حیثیت سے بھی ڈاکٹر سید عبدالباری کی خدمات کو واضح کیا گیا ہے۔

پانچواں باب ڈاکٹر سید عبدالباری کی صحافتی خدمات کا احاطہ کرتا ہے،جس میں ان کے ابتدائی زمانے سے لے کر آخری عمر تک وہ جن جن رسائل سے منسلک تھے،ان سبھی پر اظہار خیال پیش کرتے ہوئے ان کی اداریہ نگاری کا فنی وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور اپنی صحافتی زندگی کے دوران انہوں نے ملک کی کچھ عظیم شخصیتوں کے انٹرویو بھی لئے تھے،ان پر بھی مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے اور انٹرویو کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

بابِ ششم میں ڈاکٹر سید عبدالباری کی جملہ ادبی خدمات کی روشنی میں ان کے قدر و قیمت اور مقام و مرتبے کا تعین کیا گیا ہے،جو اس پورے مقالے کا نچوڑ بھی ہے۔

اس تحقیقی مقالے کو پورا کرنے میں مجھے مواد کی عدم موجودگی کے سبب کافی پریشانیوں اور مشقتوں سے گزرنا پڑا۔ دراصل ڈاکٹر سید عبدالباری کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں اور فنی محاسن پر ابھی بہت کم غور وفکر کی گئی ہے۔ بڑی مشکل سے چند مضامین اور مقالے دستیاب ہوئے، مگر وہ بھی زیادہ کارآمد ثابت نہ ہو سکے۔ ان کی تنقید نگاری، شاعری اور تحقیق کے فن پر کوئی ایسا مقالہ نہیں نظر سے گزرا جس سے میری مشکلیں آسان ہوسکتیں۔ اس لئے اس مقالہ کو پورا کرنے میں میں نے زیادہ تر بنیادی ماخذ سے استفادہ کیا ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر سید عبدالباری کی ادبی خدمات اور ان کی تنقید و تحقیق کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ادب میں ان کے مقام و مرتبے کا تعین کرنے کی ایک طالب علمانہ کوشش کی ہے۔ ویسے تو میری حیثیت اردو ادب کی دنیا میں ایک قطرے کے برابر بھی نہیں ہے لیکن اپنے موضوع کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ میرے اس مقالے پر توجہ مرکوز کی جائے گی۔ اس کوشش میں ہوسکتا ہے میری کم علمی کے سبب زبان و بیان کے علاوہ اور بھی کچھ خامیاں در آئی ہوں جو ایک طالب علم کے لئے فطری عمل ہے۔ اس لئے امید کرتا ہوں اہل علم وفن میری کوتاہیوں اور سطحیت کو درگزر فرمائیں گے۔

اس تحقیقی مقالے کو تکمیل میں ڈاکٹر سید عبدالباری کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر شکیب ارسلان نے میری بڑی مدد کی۔ انہوں نے اپنے والد کی شخصیت اور سوانحی کوائف سے متعلق جو باتیں بتائیں ان سے میری مشکلیں کافی آسان ہوگئیں۔ انہوں نے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں میری قدم قدم پر رہنمائی کی جس سے میں ان کے شخصیت کی بہت سے تاریک گوشوں سے روشناس ہوا اور جس کے سبب مجھے یہ مقالہ لکھنے میں کافی سہولتیں فراہم ہوئیں۔ اس کے علاوہ جناب عامل سلطان پوری صاحب جو ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب کے شاگرد ہیں اور ان کی علمی و ادبی شخصیت سے کافی متاثر بھی ہیں، انہوں نے بھی مجھے ان کے حالات زندگی سے متعلق متعارف کرایا بلکہ کچھ مواد بھی مہیا کرائے جس سے میری مشکلیں آہستہ آہستہ آسان ہوتی چلی گئیں۔ رسالہ ''پیش رفت'' کے مدیر جناب حسنین سائر اور ادارۂ ادب اسلامی کے نائب صدر جناب انتظار نعیم، ''ملی اتحاد'' کے نائب مدیر جناب بسمل عارفی صاحب نے بھی میری رہنمائی فرمائی اور ڈاکٹر سید عبدالباری کی شخصیت اور خدمات سے متعلق مجھے نئے نئے گوشوں سے آگاہ کرتے رہے۔ ان لوگوں کی وجہ سے ہی مجھے ان کے تمام اداریوں کی فائل حاصل کرنے میں کامیابی ہوسکی۔ غرض جہاں تک ممکن ہوسکا ان شخصیات نے اپنا قیمتی وقت نکال کر ہر طرح سے تعاون کیا اور متعدد کتابیں فراہم کیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کی تقریباً ۳۵ کتابیں ہیں۔ جن میں ان کے اداریوں کو اگر شامل کرلیا جائے تو ان کے صفحات کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ مجھ

جیسے کم علم اورنو آموز طالب علم کے لئے ان کی سبھی تحریروں کا مطالعہ کرنا، پھر ان کا تجزیاتی وتنقیدی جائزہ پیش کرنا اوران پر اپنی رائے کا اظہار کرنا بڑا دشوار مرحلہ تھا۔مگران لوگوں کی حوصلہ افزائی اور مسلسل تعاون کے سبب میں اس مقالے میں ڈاکٹر سید عبدالباری کی ادبی شخصیت کا تعین کرنے کی کوشش میں کافی حد تک کامیاب وکامران رہا۔اس لئے میں ان سبھی شخصیتوں کا تہہ دل سے مشکور وممنون ہوں انہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر ڈاکٹر سید عبدالباری کی شخصیت اوران کی ہمہ جہت ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں سے مجھے روشناس کرایا، جس سے میری راہیں کافی آسان ہوتی گئیں۔

اس مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مشفق استاد جناب آصف زہری صاحب نے میری قدم قدم پر رہنمائی فرمائی ہے۔ یہ ان کی محبت اور شفقت کا نتیجہ ہے جو آج میں اس مقام پر پہنچا ہوں۔انہوں نے مجھے قلم پکڑ نا سکھایا اور نثر لکھنے کا جذبہ میرے اندر بیدار کیا، ورنہ مجھے نثر لکھنی نہیں آتی تھی۔ان کی رہنمائی میں مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔اس مقالے کو پورا کرنے میں ان کا بھر پور تعاون حاصل رہا۔اس سلسلے میں وہ مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ورنہ میں اس قابل نہیں تھا کہ ڈاکٹر سید عبدالباری جیسی بلند پایہ ادبی شخصیت اوران کی خدمات پر اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرسکوں۔ مجھے جو کچھ بھی ملا ہے انہیں کے شرف تلمذ کا نتیجہ ہے۔اس لئے میں استاد محترم جناب آصف زہری صاحب کا عمیق دل سے متشکر ہوں کہ مجھے تراش کر ہیرا بنا دیا ورنہ میرا شمار پتھروں میں تھا۔

اس مقالے کی تکمیل میں مجھے اپنے والدین کا ہمیشہ بھر پور تعاون حاصل رہا ہے، جن کی بیش بہا قربانیوں اور دعاؤں کے نتیجے میں آج یہاں تک پہنچ سکا ہوں۔میرے والدین کی شروع سے خواہش رہی ہے کہ میں اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کروں۔یہی وہ خواب ہے جس کو پورا کرنے کے لئے میرے اندر تعلیم کا جذبہ اور قوی ہوا اور میری دلچسپی میں روز بہ روز اضافہ ہوتا گیا۔انہوں نے میری تعلیم وتربیت میں کافی پریشانیوں اور مشقتوں کا سامنا کرتے ہوئے ہمیشہ میری رہنمائی کی اور حوصلہ بڑھاتے رہے اور فون پر ہمیشہ میری والدہ اس بات کی تلقین کرتی رہیں کہ وقت سے پہلے کام کر لینا۔جس سے میں اور بھی سنجیدہ ہوکر اپنے موضوع پر مسلسل غور وخوض کرتا رہتا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آج میں ان کا خواب شرمندہ تعبیر کر رہا ہوں۔آج میں جو بھی ہوں، انہیں کی دعاؤں کا ثمرہ ہوں۔اس کے علاوہ میں اپنے کالج کے استاد جناب عتیق احمد عتیق صاحب مرحوم کو کبھی نہیں بھول سکتا جنہوں نے مجھے اس قابل بنایا اور اردو زبان وادب کے تئیں میرے اندر ایک جذبہ بیدار

کیا۔ وہ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہتے۔ جب ان سے میں نے بتایا ڈاکٹر عبدالباری کی ادبی خدمات پر ریسرچ کرر ہاہوں تو کافی خوش ہوئے۔ کاش آج وہ باحیات ہوتے تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ انہوں نے مجھے اس مقام پر پہنچانے میں کافی اہم رول ادا کیا ہے۔ اس لئے میں اس عظیم شخصیت کا تاعمر مرہون منت رہوں گا۔ اس سلسلے میں ایک اور نام مولانا شمشاد علی منظری صاحب کا ہے، جنہوں نے میری سب سے زیادہ ہمت افزائی فون کے ذریعے کی اور ہمیشہ دعاؤں سے نوازتے رہے۔ ان سبھی حضرات کی دعاؤں اور محبتوں کا ایک لفظ میں شکریہ ادا کرنا حق تلفی ہے۔

اس مقالے میں میری بیٹی ام ہانی اور اہلیہ سلمٰی کا بھی خاص تعاون شامل ہے، جنہوں نے میری مصروفیت کو دیکھتے ہوئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ ان سب کے ساتھ ساتھ میں اپنے بڑے بھائیوں اور بہنوں کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور فون کے ذریعے میرا حوصلہ بلند کرتیں رہیں۔ ان سب کے علاوہ میں اپنے بڑے ابا جناب حاجی محمد سرور، حاجی محمد اظہر مرحوم، مشفق چچا جناب جمال احمد سوداگر اور تمام اہل خانہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جو مسلسل میری کامیابی اور کامرانی کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ اپنے تمام دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ہر طرح سے اس مقالے کو پورا کرنے میں میرا تعاون کیا۔ امید ہے اس ادنیٰ سی کوشش میں مجھے کامیابی حاصل ہوگی۔

محمد اشہر انصاری
ہندوستانی زبانوں کا مرکز
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی۔ 110067

باب اول

سید عبدالباری: سوانحی کوائف

مشرقی اتر پردیش کے ضلع امبیڈکر نگر میں دریائے گھاگھرا کے ساحل پر آباد ایک چھوٹا سا قصبہ ٹانڈہ ہے، جو کپڑے کی صنعت کے لئے پورے ملک میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔اسی قصبہ کے ایک چھوٹے سے محلے الہداد پور میں ۷ستمبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر سید عبدالباری قلمی نام ''شبنم سبحانی''ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان مولانا حسین احمد مدنی کا مرید تھا اس لئے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ عبدالباری صاحب کا سلسلہ مولانا سے ملتا ہے۔ان کے والد عبدالوافی اور والدہ شفیق النسا دونوں نہایت پرہیز گار اور متقی انسان تھے۔ یہ لوگ مولانا حسین احمد مدنی کے عقیدت مند ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے مرید بھی تھے۔ عبدالباری کو ابھی اس دنیا میں آنکھ کھولے ہوئے چھ مہینے ہی ہوئے تھے، وہ سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ان کے والد کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا، اس وقت وہ بلیا کے تعلقہ دار کے مختار عام تھے۔ان کی والدہ ماجدہ نے تقریباً تین سال تک یتیمی میں ان کی پرورش ان کے ننیہال موضع صالح پور ضلع بستی میں کی۔ جوگھاگھرا ندی کے اس پار واقع ہے۔سید عبدالوافی نے اپنے چھوٹے بھائیوں سید عبدالکافی اور سید سبحان اللہ کی پرورش ،تعلیم و تربیت میں کافی اہم رول ادا کیا تھا کیوں کہ ان کے والد سید حامد علی کی اچانک جوانی میں موت ہو گئی تھی۔اس لئے یہ لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور باپ کی طرح ان کا حکم بجالاتے۔سید عبدالوافی کا عین جوانی میں انتقال ہونا ایک المیہ تھا، ان کے تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے، جس کے سبب پورا خاندان رنج و غم میں ڈوبا ہوا رہنے لگا یہ ان کے لئے بہت بڑا المیہ ثابت ہوا۔لیکن حوصلہ مند بھائیوں نے خاندان کی عزت و وقار کو قائم رکھا اور عبدالباری کی والدہ سے ان کے چھوٹے بھائی سید سبحان اللہ نے نکاح کر لیا۔ دوبارہ عقدِ ثانی کے بعد عبدالباری کی اپنے آبائی وطن ٹانڈہ میں واپسی اسی گھر میں ہوئی جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ان کے چچا سید سبحان اللہ نے اپنے بھائی کے سبھی بیٹوں کی پرورش کی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے بڑے ناز و پیار سے ان کی تعلیم و تربیت کی۔سید سبحان اللہ نے عبدالباری اور ان کے بھائیوں کو کبھی باپ کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔انہوں نے عبدالباری کی پرورش میں کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔ پیدائش سے لے تعلیم و تربیت تک جہاں تک ممکن ہو سکا ان کا تعاون کرتے رہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے صاحب زادے جناب ڈاکٹر شکیب ارسلان نے لکھا ہے:

> ''چچا نے سر پر آسمان کی طرح سایہ کر دیا۔نہایت محبت و شفقت سے اور اپنی اولاد کی طرح پرورش کی اور کبھی بھی باپ کی کمی کا احساس تک نہ ہونے دیا۔''[۱]

ان کے چچا سید سبحان اللہ کی ٹانڈہ میں کتابوں کی بڑی دکان تھی جو آج بھی چوک میں قائم ہے۔اس

زمانے میں ملک میں جنگ آزادی کی جدوجہد جاری تھی اور سید سبحان اللہ جمیعۃ العلماء کے ایک رکن کی حیثیت سے آزادی کی جنگ میں شامل تھے۔ سبحان اللہ کی دکان پر اہل سیاست اور ملت کے ہمدردوں کا مجمع لگا رہتا تھا، جہاں لوگ بیٹھ کر سیاسی وملی مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

''میرے چچا سید سبحان اللہ کی کتابوں کی قدیم دکان بلکہ دیوان خانہ تھا جہاں گھنٹوں سیاست کی گرہوں کو کھولنے اور ملت کے الجھے ہوئے گیسوؤں کو سلجھانے یہ حضرات گزارتے۔ میں اپنے مدرسہ سے چھٹی کے بعد اپنی قلم دوات اور بستہ سنبھالتے ہوئے جب گھر جاتے ہوئے چچا سے گھر کے احکامات حاصل کرنے دوکان پر آتا تو وہاں نورانی چہروں کی یہ کہکشاں نظر آتی۔''[۲]

سید عبدالباری نے ابتدائی تعلیم مدرسہ کنزالعلوم ٹانڈہ سے حاصل کی۔ جہاں مجروح سلطان پوری بھی زیرِ تعلیم تھے۔ ان کے ابتدائی اساتذہ مولوی محمد نزر محمد خاں، مولوی نصرت علی اور منشی عبدالمجید کو ان سے خاص رغبت تھی۔ جس وقت یہ مدرسے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس وقت ملک آزاد نہیں ہوا تھا انہوں نے انگریزوں کے جبر واستحصال اور عوام میں ان کا خوف بچپن میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایک بار عبدالباری صاحب میرے اسکول قومی انٹر کالج میں مولانا آزاد کی یومِ پیدائش کے موقعے پر مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف لائے تھے، اس وقت میں نویں جماعت کا طالبِ علم تھا، ان سبھی واقعات کی تفصیل انہوں نے مولانا آزاد کے حیات وکارنامے پر روشنی ڈالتے ہوئے، اپنی زبانی اسکول میں تقریر کے دوران بتائی تھی جو مجھے کچھ کچھ یاد ہیں۔ آزادی کے پہلے ہندوستان کی جو صورتِ حال تھی اس سے متعلق انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

''آزادی سے پہلے ہندوستان بڑی ہماہمی، بڑے ایثار وقربانی بڑی سادگی و جفا کشی کا ہندوستان تھا۔ قومی لیڈرشپ نے شہروں سے لے کر گاؤں کی سطح تک زبردست سیاسی بیداری اور اجتماعی شعور پیدا کر دیا تھا۔ لوگ گاندھی جی اور دیگر رہنماؤں کی خود اعتمادی، محنت اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور سادہ زندگی بسر کرنے کے جذبے سے متاثر تھے۔''[۳]

ٹانڈہ جوان کا آبائی وطن ہے وہاں مسلم لیگ کا کافی زور تھا۔مگر عبدالباری جس مدرسے میں زیرِ تعلیم تھے، وہ کانگریسیوں کا اڈہ تھااور وہاں اس زمانے میں چرخہ بنا ہوا ترنگا لہرایا جاتا تھا۔ مدرسے سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے شہر کے مڈل اسکول میں داخلہ لیا جہاں وہ تین سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔اس زمانے میں ملک کو پوری طرح سے آزادی مل چکی تھی۔عبدالباری نے پہلی بار ملک کی آزادی کا جشن مدرسہ کے اندر منایا تھا۔ابھی ملک کو آزاد ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ مہاتما گاندھی کا قتل ہو گیا، جس نے پورے ملک کی فضا سوگوار کر دی۔ملک میں فرقہ وارانہ فسادات برپا ہوئے۔بے گناہوں کے ناحق خون بہائے گئے، پورے ملک میں سناٹا اور خوف طاری ہو گیا اس زمانے میں لوگوں کے اندر جو کرب واضطراب تھا اسے عبدالباری نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا تھا۔جب وہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک مڈل اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے،اس وقت ان کی ذہنی تربیت بھی ہوتی رہی۔اس وقت ان کے گھر پر ان کے ساتھ پھوپھی زاد بھائی سید بدرالحسن، منظر اعظمی اور کوثر یزدانی اور ظفر ہاشمی ایڈٹر ماہنامہ (گلبن لکھنؤ) بھی تعلیم کی غرض سے ٹانڈہ میں مقیم تھے۔یہ تینوں لوگ کافی زندہ دل انسان ہونے کے ساتھ ساتھ خاصے متحرک اور باذوق لوگ تھے۔منظر اعظمی اس وقت اپنے اصلی نام سید عنایت اللہ کے نام سے جانے جاتے تھے، جن کو عبدالباری کے چچا اور منظر اعظمی کے ماموں سید سبحان اللہ نے تعلیم حاصل کرنے کے لئے ٹانڈہ میں بلا لیا تھا۔عبدالباری اس وقت ہائی اسکول میں تھے، ظفر ہاشمی ان کے ہم جماعت تھے۔منظر اعظمی انٹرمیڈیٹ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ان دونوں کی ذہانت، شوخی اور جودتِ طبع نے عبدالباری کو کافی متاثر کیا اور ان کے اندر تحقیقی وتنقیدی صلاحیتیں یہیں سے اجاگر ہونے لگیں۔منظر اعظمی کی بدولت ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء کے دوران عبدالباری ادبی محفلوں اور درسِ قرآن کے جلسوں میں شرکت کرنے لگے۔اپنے ابتدائی زمانے کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے عبدالباری نے لکھا ہے:

> ''اس دور کی کچھ سنہری یادیں اب تک ذہن کے پردے پر نقش ہیں۔مکتب کیا تھا کھیتوں اور باغوں کے آغوش میں ایک ہمکتا ہوا نونہال۔فقط دو تین کمروں کی عمارت اور اردگرد آم وامرود کے باغات یادش بخیر دوپہر کی لنچ کا وقت اس طرح گزرتا کہ امرود کے مختلف ڈالوں پر ہم لوگ جا بیٹھتے اور لنچ باکس کی جگہ ہماری پھوپھی آلو کی سبزی اور سادہ روٹیوں کی جو پوٹلی ہمارے ساتھ کر دیتی تھیں امرود کی ڈالیوں پر ہم مزا لے کر اسے اس طرح کھولتے اور کھاتے گویا من وسلوا نازل ہو رہا ہو مگر تعلیم کا سایہ عالم اردو زبان وادب اور دینیات ابتدائی درجات میں اس طرح میں رگ وپے میں سرایت کر جاتی کہ ابوالکلام آزاد کے الہلال کی قدیم فائلوں اور لاہور کے ''ہمایوں'' اور بجنور کے مدینہ کے شماروں کی

ورق گردانی میں کوئی تامل نہ ہوں۔''[۴]

غرض ہائی اسکول تک آتے آتے عبدالباری کا اسلامی ادب کی کتابوں کا مطالعہ کافی وسیع ہو گیا۔اسی زمانے ۱۹۴۹ء میں ٹانڈہ میں ادارۂ ادب اسلامی کی ایک شاخ قائم ہو چکی تھی ،جس کے سربراہ رام پور میں شفیع مونس تھے۔ٹانڈہ میں جناب مختار احمد مظاہری کی سرپرستی میں یہ اردارہ اپنی خدمت انجام دے رہا تھا۔اس زمانے میں جماعت کے ہفتہ وار ہونے والے درس قرآن کی محفل میں بڑی چہل پہل ہوتی تھی ،اس میں وہ پابندی سے شرکت کرتے۔عبدالباری اس ادارے کی ہونے والی سبھی نشسوں میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور منظر اعظمی ،زماں ٹانڈوی،ڈاکٹر ذوقی کی پر جوش سیاسی نظموں اور اقبال حسین آزاد کے افسانوں سے خوب محظوظ ہوتے۔عبدالباری نے ہائی اسکول ہوبرٹ ترلوک ناتھ انٹر کالج سے ۱۹۵۲ء میں پاس کیا۔اس عہد میں وہ اپنے قلمی نام ''شبنم سبحانی'' سے شاعری کی دنیا میں قدم رکھ چکے تھے۔ان کی تخلیق کردہ نظمیں وغزلیں پاکستان اور ہندوستان میں میرٹھ سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''معیار'' میں شائع ہوتی تھیں۔۱۹۵۳ء میں ادارۂ معیار نے ''عالمی امن'' کے عنوان سے دس پندرہ نظموں کا انتخاب میرٹھ سے شائع کیا۔اس انتخاب میں شبنم سبحانی کی نظم ''امن کا دیوتا'' شامل تھی۔اس کے علاوہ وہ مختلف رسائل واخبارات میں متواتر شائع ہوتے رہے۔ان کی کچھ نظمیں اور نثری مضامین الہ آباد سے نکلنے والے رسالہ ''الانصاف'' میں بھی شائع ہوتی رہتی تھیں۔

عبدالباری کو بچپن سے مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔جب وہ ہائی اسکول میں تھے اس وقت شہر ٹانڈہ میں ایک لائبریری تھی جو سیرت الائبریری کے نام سے چوک میں واقع تھی۔اس کے علاوہ جماعت اسلامی کے دفتر میں بھی اچھی خاصی علمی وادبی کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا اور ان کے کالج ہوبرٹ کی لائبریری میں بھی دیگر مضامین کی کتابیں دستیاب تھیں۔چنانچہ انہوں نے ان کتب خانوں سے خوب استفادہ کیا۔عبدالباری صاحب کو مطالعے کا شوق اتنا تھا کہ وہ اس وقت بھی رات میں مطالعہ کرتے جب ٹانڈہ میں بجلی نہیں ہوا کرتی تھی۔اس وقت انہوں نے منشی پریم چند کے تمام ناولوں کو لالٹین کی روشنی میں پڑھ ڈالا تھا۔ایک جگہ اپنے مطالعے اور کتابوں کی فراہمی سے متعلق لکھتے ہوئے بتاتے ہیں:

منشی پریم چند کے تمام ناول یکے بعد دیگرے لالٹین کی روشنی میں پڑھ

ڈالیں۔ایک بار میرے چچانے ناولوں پر کے مطالعہ پر فہمائش بھی کی۔شہر میں مولانا مختار احمد جوہری گویا علم وادب کے فانوس تھے۔اس کے علاوہ مختار قدوائی صاحب اگر چہ سیاسی آدمی تھے مگر اعلیٰ درجہ کی علمی کتب کے شیدائی تھے۔میں نے انہیں کے یہاں مولانا آزاد کے الہلال کی فائل دیکھا جو بعد میں انہوں نے مجھے عطا کر دیا۔اپنے پھوپھا سید امیر حسن کے ذریعہ میری رسول پور میں ان کے دولت قدے تک رسائی تھی۔جماعت اسلامی کے دفتر میں لاہور کراچی حیدر آباد، الہ آباد، رام پور، سے رسائل آتے تھے جو میرے انبساط کا سامان تھا۔حیدر آباد سے ’’حیات نو‘‘ آتا تھا جسے محمود فاروقی و محمود رونق نکالتے تھے۔ان کے انتظار میں ہر ہفتہ ڈاک خانہ کا چکر لگاتا‘‘۔۵

ڈاکٹر سید عبدالباری نے کتابوں کے مطالعے کے لئے جہاں جہاں سے بھی ممکن ہو سکا، کتابوں کو حاصل کیا اور ان کا مطالعہ خوب گہرائی و گیرائی سے کیا۔ان کے اس ذوقِ مطالعہ کی عادت نے آگے چل کر انہیں ایک ناقد، محقق اور مصنف بنانے میں کافی اہم کردار ادا کیا۔ہائی اسکول کے بعد عبدالباری صاحب انٹرمیڈیٹ کے لئے الہ آباد چلے گئے، جہاں ان کے چچا سید عبدالوافی مقیم تھے، انہوں نے ان کی بڑھتی ہوئی ذہانت اور جودتِ طبع کو دیکھتے ہوئے اپنے پاس بلا لیا تھا اور یہیں پر ایک کالج میں داخلہ دلا دیا۔انٹرمیڈیٹ کے بعد انہوں نے لکھنؤ کا رخ کیا۔یہاں پر انہوں نے لکھنو یونیورسٹی میں ۱۹۵۵ء میں داخلہ لیا۔جس وقت انہوں نے لکھنو یونیورسٹی میں قدم رکھا، اس وقت وہاں پر ہندوستان کے اعلیٰ اور بلند پایہ شاعر و نقاد موجود تھے، جن کی تعلیم و تربیت اور وہاں کے ادبی ماحول سے وہ کافی متاثر ہوئے۔اس وقت وہاں آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، نورالحسن ہاشمی، پروفیسر شبہ الحسنین نونہروی، اور رضیہ سجاد ظہیر کے زیرِ اثر انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ان اساتذہ کی رہنمائی میں انہوں اردو ادب کا وسیع تر مطالعہ کیا اور ان کی ذہانت و قابلیت میں اور بھی اضافہ ہوتا گیا۔اسی زمانے میں لکھنو سے ایک رسالہ ’’نئی نسلیں‘‘ کی اشاعت ہوئی۔یہ اس زمانے میں اعلیٰ درجہ کا ادبی رسالہ تھا جو ادب میں صحت مند قدروں کا ترجمان تھا۔جس کے مدیر م نسیم تھے۔انہوں عبدالباری کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے انہیں ادارتی بورڈ میں شامل کر لیا اور عبدالباری نے اپنے قلمی نام شبنم سبحانی سے اس بورڈ میں آزاد نظم کے نگراں مقرر ہوئے۔اس وقت انہوں نے لکھنو میں رہ کر اپنے قلم کا جوہر دکھانا شروع کر دیا تھا اور ان کی متعدد آزاد اور پابند نظمیں اور کچھ مضامین اس رسالے میں شائع ہوئے۔جس سے وہاں کے ادبی حلقے میں ان کی شناخت ہونے لگی اور وہ ان حلقوں سے بہت جلدی مانوس بھی ہو گئے۔

اس زمانے میں جب وہ لکھنو میں مقیم تھے، ترقی پسند تحریک لکھنؤ میں پورے ملک کی بنسبت یہاں عروج پر تھی، اس تحریک سے وابستہ ادبا شعرا و ناقدین کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی، اس لئے وہاں پر ترقی پسند نظریات اب بھی اپنے اصول کے ساتھ زور پکڑے ہوئے تھے۔اسی زمانے میں دوسری طرف جماعت اسلامی ہند بھی سرگرم عمل تھی۔اس نے ترقی پسند تحریک کے برعکس ادب میں اسلامی ادب یا تعمیری ادب کا صحت مند نظریہ پیش کیا۔جس کے روحِ رواں مولانا مودودی تھے۔عبدالباری نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔لکھنو میں ابوالمجاہد زاہد اس تحریک کے صدر اور م نسیم روح رواں کی حیثیت رکھتے تھے،جن سے ان کے تعلقات کافی بہتر تھے۔اس لئے ان لوگوں نے انہیں اپنا سکریٹری بنالیا۔اس تحریک کی نشستیں بڑے زور وشور کے ساتھ ممتاز دارالیتامیٰ لکھنو میں ہوتی تھیں۔ان میں سبھی لوگ اپنی اپنی تخلیقات پیش کرتے۔ان میں جو لوگ شاعر تھے وہ غزل نظم یا دیگر اصناف میں اپنا کلام پیش کرتے، کچھ لوگ افسانہ یا ناول کے اہم اقتباسات پیش کرتے، پھر ان تخلیقات پر تنقیدی مباحثے ہوتے تھے،جس سے ان کی ذہنی صلاحیت کو پروان چڑھنے میں کافی مدد ملی۔ان نشستوں میں رشید کوثر فاروقی،انور صدیقی،اکبر زمزم،احمد حسین انصاری کی تخلیقات اور ادبی گفتگو و مباحثے اس محفل میں جان ڈال دیا کرتے تھے۔یہ زمانہ ۵۵۔۱۹۵۶ء کا تھا اس دور میں عبدالباری مکمل طور پر ادبی سرگرمیوں میں سرگرم ہو چکے تھے اور وہ ادب کے لئے وقف ہو کر رہ گئے۔

اس طرح ان کا ادبی ذوق پروان چڑھتا گیا اور وہ اسلامی ادب کی تحریک سے وابستہ ہو کر ادبی مضامین اور تنقید لکھنے لگے۔آہستہ آہستہ ان کی شہرت کم عمر میں ہی ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی وہ متعدد سیمیناروں اور جلسوں میں شرکت کرنے لگے۔۱۹۵۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسلامی ادب علی گڑھ کے زیر اہتمام ایک کانفرنس یونین ہال میں منعقد ہوئی۔اس میں ملک بھر کے اسلامی ادب سے وابستہ اسکالر،ادیب وشعرا نے شرکت کی۔جس میں لکھنؤ سے م نسیم،ابوالمجاہد زاہد،رشید کوثر فاروقی،کے ساتھ سید عبدالباری کو بھی شرکت کرنے کا موقع ملا۔اس کانفرنس میں پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر ضیا احمد بدایونی نے کی اور دوسری نشست کی صدارت اصغر علی عابدی نے کی تھی۔اس کے علاوہ اس سیمینار میں روش صدیقی،منظر اعظمی،سہیل احمد زیدی،شاکر تسلیم،افتخار اعظمی،ابنِ فرید،معزز علی بیگ بھی موجود تھے۔یہ تمام لوگ تعمیر پسند ادیب کی حیثیت رکھتے تھے۔ان سب کے درمیان اتنے بڑے جلسے میں پہلی بار عبدالباری نے اپنی تخلیقات پیش کی۔اس وقت ان کی عمر محض ۱۹ برس کی تھی۔اس سیمینار کی بدولت ادبی حلقوں میں بڑے نقادوں اور ادیبوں کے درمیان ان کی ایک الگ شناخت قائم ہوئی،اس طرح اب ان کا شمار لکھنؤ یونیورسٹی کے چند ممتاز ادبا میں ہونے لگا اور ہر کوئی

ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ابھی وہ بی اے کے ہی طالبِ علم تھے کہ دہلی یونیورسٹی کی جانب سے ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے شعبہ اردو کے سبھی طلبہ و طالبات کے لئے مقالہ لکھنے کا مقابلہ منعقد کیا گیا۔ اس مقالے کا موضوع ''ہندوستانی تہذیب اور اردو'' تھا۔ اچھا مقالہ لکھنے والے طالبِ علم کو گولڈ مڈل دینے کا اعلان تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے سبھی ہونہار طلبہ اور طالبات نے اس مقابلے میں حصہ لیا۔ اس وقت خواجہ احمد فارقی صدر شعبہ اور گوپی چند نارنگ اردو طلبہ انجمن کے سکریٹری تھے۔ ڈاکٹر عبدالباری اپنے استاد پروفیسر احتشام حسین کی نگرانی اور مشورہ سے اس موضوع پر لکھنے کے لئے کمر بستہ ہوئے۔ اتفاق سے ان کا یہ مقالہ اول انعام کا مستحق ہوا اور انہیں گولڈ میڈل مل گیا۔ اس مقالے کے نگراں اپنے وقت کے جید عالم پروفیسر عابد حسین تھے۔ جو اپنے وقت کے ممتاز مصنف، مفکر اور ناقد کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس خبر کو سن کر ان کے استاد پروفیسر احتشام حسین نے انہیں گلے سے لگا لیا تھا۔ یہ مقالہ ۱۹۶۱ء میں سرسید بک ڈپو علی گڑھ سے کتابی شکل میں شائع ہوا اور اسے جامعہ اردو علی گڑھ کے ادیب ماہر کے نصاب میں بھی داخل کیا گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے ایڈیشن آتے رہے۔ آٹھواں ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ سرسید بک ڈپو علی گڑھ اس کتاب پر انہیں برابر رائلٹی کی رقم ادا کرتا رہا۔ اس کتاب پر اتر پردیس اردو اکادمی نے انہیں انعام واکرام سے بھی نوازہ۔

اس طریقے سے عبدالباری کی سرگرمیاں لکھنؤ میں روز بہ روز بڑھتی گئیں۔ ملک کے عظیم ادیبوں اور دانشوروں کے درمیان لکھنؤ میں انہوں کافی خوشگوار زندگی بسر کی۔ آزادی کے بعد ۵۵-۱۹۵۴ء کی بات ہے جب عبدالباری لکھنؤ میں مقیم تھے، اس وقت ملک تقسیم ہو چکا تھا اور ابھی لوگوں کے زخم بھی بھرے نہیں تھے، اس وقت بھی وہاں کافی رنگارنگی اور ہماہمی تھی۔ لوگوں کے اندر اردو زبان وادب سے آج بھی وہی دلچسپی برقرار تھی جو یہاں کے شعرا وادبا میں پہلے تھی۔ یہاں پر مسلم لیگ کا چراغ گل ہو چکا تھا ہر طرف کانگریس کا بول بالا تھا۔ مگر یہاں پر ترقی پسند تحریک شباب پر تھی اور شوسلسٹ خیالات لوگوں کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ آل احمد سرور اور احتشام حسین کا گھر ان لوگوں کا مرکز ومحور تھا، جہاں سے ترقی پسند خیالات کے سوتے پھوٹتے تھے۔ حضرت گنج کا وہ کافی ہاؤس جہاں مجاز بیٹھا کرتے تھے، ان کے دم سے کچھ اور ادبا وشعرا کی محفلیں آباد تھیں۔ غرض اشتراکیت کا غلبہ یہاں پر عام آدمی سے لے کر دانشوروں کے ہر طبقے پر طاری تھا اور اس کا اثر سماجی زندگی اور سیاست پر بھی غالب تھا۔ اسی عہد میں لکھنؤ میں تعمیر پسند ادبی رجحان کا بھی آہستہ آہستہ فروغ ہو رہا تھا۔ جس کی باگ ڈور نسیم کے ہاتھ میں تھی۔ اشتراکیت دراصل ایک ایسا نظام تھا، جو اسلامی اصولوں کے بر

خلاف تھااس لئے اسلامی ادب کی اس تحریک نے اس کی سخت مخالف کی اوراس کے خلاف تعمیر پسند ادیبوں نے خوب قلم فرسائی کی۔عبدالباری صاحب ایک دیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اوران کے بزرگ حسین احمد مدنی کے مرید تھے، ان کے چچا سید سبحان اللہ خود جمیعتہ العلمہ کے رکن تھے، جس کا اثر ان کی زندگی پر تاعمر رہا۔یہی وجہ ہے جب اشتراکیت پورے ملک میں زور پکڑ رہی تھی اس وقت ۱۹۵۴ء میں وہ تعمیر پسند ادب کے صالح رجحان کا علم لے کر چل پڑے اور پوری زندگی انہیں خیالات کی تبلیغ کرتے رہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سوچتا ہوں اس عہد میں لکھنؤمیں کیا نہیں تھا لیکن ایک بڑا خلا اور اندوہناک کمی اگر محسوس ہوتی ہے تو اس بات کی تھی جن مشرقی روایات واقدار کی پرورش صدیوں اس شہر کے دامن میں ہوتی آئی تھی آج نشانۂ تمسخر بن رہی تھیں۔اشتراکیت کا فلسفہ دانشوروں کی علمی محفلوں اور سیاسی وسماجی زندگی کی بالائی سطحوں پر چھایا ہوا تھا لیکن اس موسم میں بھی ایسے سرپھروں کی کمی نہ تھی جو بادِ مخالف سے لڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔''٦

اس طرح وہ مشرقی روایات اور ملک کی تہذیب وثقافت اور یہاں کے سماجی وانسانی اقدار کی پاسداری کے لئے اس تحریک میں ایک خاص رکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔تقریباً دوسال تک عبدالباری صاحب کا قیام م نسیم اور رشید کوثر فاروقی جو اس تحریک کے روح رواں کی حیثیت رکھتے تھے، کے ساتھ رہا۔اس کے علاوہ اس تحریک کے روح رواں کی حیثیت رکھنے والے شاعر ابوالمجاہد زاہد سے ان کے کافی گہرے مراسم تھے، ہر وقت ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہوتا تھا جن کے زیرِ اثر عبدالباری کا شاعری کی طرف رجحان اور بھی بڑھ گیا۔مولانا عبدالغفار سے انہیں خاص لگاؤ تھا اور وہ بھی ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ان کے ساتھ اپنے بیٹے جیسا سلوک کرتے ،انہیں ان کی سرپرستی ہمیشہ حاصل رہی۔ان سب سرگرمیوں کے علاوہ عبدالباری لکھنؤ کی ادبی و مذہبی محفلوں میں خوب شرکت کرتے۔ندوہ ،فرنگی محل اور مدرستہ الواعظین جہاں فلسفہ اور منطق کی باتیں ہوا کرتیں، ان سب محفلوں میں بھی وہ کثرت سے تشریف لے جاتے رہے۔اس کے علاوہ علی میاں ندوی کے یہاں ہفتہ وار منعقد ہونے والی محفل جس میں درسِ قرآن کی باتیں ہوتی تھیں، اس میں بھی پابندی سے جاتے اور اسلامی نقطۂ نظر اوران کی باتوں سے خوب استفادہ کرتے۔اس عہد کے دو معروف شاعر علامہ شفیق جونپوری اور صفی لکھنوی سے انہوں نے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی شخصیت سے کافی متاثر ہوئے ان کی ادبی وصحافتی خدمات پر انہوں نے متعدد مضامین لکھے اور ایک انٹرویو بھی کیا ہے، جو کتابی

شکل میں موجود ہے۔آثر لکھنوی اس زمانے میں لکھنؤ کے اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے،شاید ہی کوئی ایسا شاعر یا ادیب ہوا ہو جس نے سے استفادہ نہ کیا ہو۔عبدالباری وہاں بھی اپنے کرم فرما دوست رشید کوثر فاروقی کے ساتھ تشریف لے جاتے رہے۔

ان شعرا اور ادبا سے کسبِ فیض حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ لکھنؤ میں منعقد ہونے والے تمام ادبی اور غیر ادبی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں بھی بڑی پابندی سے شرکت کیا کرتے تھے۔۱۹۵۷ء میں لکھنؤ کے گنگا پرساد میموریل ہال میں ایک ادبی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں ڈاکٹر عبدالباری ادارۂ اسلامی ادب کے سکریڑی کی حیثیت سے کافی متحرک تھے۔یہ تعمیری ادب کی ایک عظیم الشان کانفرنس تھی کیوں کہ اس میں ملک کے گوشے گوشے سے اسلامی فکر رکھنے والے ادبا و شعراء نے شرکت کی تھی۔یہ دوروزہ کانفرنس کافی کامیاب ہوئی، جس کی صدارت علامہ شفیق جونپوری اور دوسرے اجلاس کی صدارت عامر عثمانی نے انجام دی تھی۔اس کے علاوہ ایک اور کانفرنس جس میں عبدالباری پیش پیش رہے، وہ لکھنو کے اوڈیٹس ہال میں منعقد ہوئی تھی، جس میں صدارتی خطبہ سید زین العابدین صاحب نے پیش کیا تھا۔اس سیمینار میں تعمیری ادب کے نظریات اور اس کے فکری و فنی اساس پر لوگوں نے متعدد موضوعات پر معیاری مقالات پڑھے اور ابنِ فرید،نجات اللہ صدیقی،اصغر علی عابدی اور معزز علی نے بھی اپنے خیالات وافکار کے ذریعے لوگوں کو اس تحریک سے روشناس کرایا۔اس سیمینار کی خاص بات یہ تھی اس میں ملک کے عظیم دانشور و نقاد دور دور سے تشریف لائے تھے،ترقی پسند تحریک سے وابستہ احتشام حسین نے بھی شرکت کی تھی۔اس عظیم الشان کانفرنس کا خاکہ ڈاکٹر عبدالباری صاحب نے تیار کیا جو میرٹھ سے نکلنے والے پرچے ’’معیار‘‘ میں لکھنؤ کے کانفرنس نمبر کے خصوصی شمارے میں شائع ہوا۔یہ وہ وقت تھا جب عبدالباری صاحب لکھنؤ میں زیرِ تعلیم تھے اور بی اے کے طالبِ علم تھے اتنی کم عمر میں انہوں نے جو مقام و مرتبہ حاصل کیا وہ کم لوگ کے حصے میں آتا ہے۔

عبدالباری صاحب کا قیام جب تک لکھنؤ میں رہا، انہوں نے تعلیمی میدان میں بہت کچھ کر دکھایا اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔لکھنؤ کی ادبی فضا کا ان پر گہرا اثر ہوا اور وہ اب ملک بھر کی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔بی اے کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی انہیں آگے کی تعلیم جاری رکھنے کی فکر تھی۔اسی اثنا میں ان کے اندر عربی و فارسی،قرآن و حدیث اور اسلامیات کی تعلیم حاصل کرنے کا تجسس پیدا ہوا۔چنانچہ انہوں نے اپنی دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنا رخ تبدیل کر دیا اور عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے

رام پور آ گئے، یہاں انہوں نے ایک ادارہ ثانوی درسگاہ میں داخلہ لیا اور نئے نئے علوم کا جام پی کر اپنی تشنگی کو بجھاتے رہے۔عبدالباری جس مدرسے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، وہ جماعتِ اسلامی ہند کا قائم کیا ہوا تھا۔ملک بھر کے تمام طلبہ جو گریجویشن اور جدید تعلیم حاصل کر چکے تھے،اس مدرسے میں زیرِ تعلیم تھے۔اس میں جو اساتذہ تھے وہ بھی اپنے وقت کے جلیل القدر اور جید علما میں شمار کئے جاتے تھے۔مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا جلیل احسن ندوی اور عروج قادری جیسے عالم و فاضل اور قابل علما یہاں موجود تھے۔ان سب کی شخصیت سے عبدالباری کافی متاثر ہوئے اور انہوں نے ان اساتذہ پر خاکے بھی لکھے ''جو نرالے لوگ نرالی باتیں'' کے عنوان سے ۲۰۰۹ء میں شایع ہوا۔عبدالباری صاحب نے ان اساتذہ سے خوب استفادہ کیا اور ان سبھی کی جھلک ان کی شخصیت اور زندگی میں صاف نظر آتی ہے۔

علم و ادب اور اسلامیات کی مزید تعلیم سے سیراب ہونے کے بعد اردو ادب سے ان کی دلچسپی اور بھی گہری ہو گئی۔رام پور مدرسے میں درس و تدریس کے دوران عبدالباری نے متعدد مضامین اردو ادب اور خاص طور سے تعمیری ادب کے نظریات کے فروغ میں لکھے، جو اس وقت مختلف رسائل اور اخبارات میں متواتر شائع ہوتے رہے۔اس کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری بھی کرتے رہے۔جس سے ان کے مراسم اس وقت کے تعمیر پسند شعرا سے کافی گہرے ہو چکے تھے۔چنانچہ انہوں نے ''قوسِ قزح'' کے عنوان سے غزلوں کا ایک انتخاب شائع کیا،جس میں ان کے معاصر تعمیر پسند شعرا کی معیاری غزلیں شامل ہیں۔یہ کتاب مکتبہ انسانیت لاہور سے شائع ہوئی تھی،جس کے نسخے آج بھی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں، مجھے یہ کتاب ان کے گھر کے ذاتی کتب خانے میں ملی جو کافی خستہ حالت میں ہے۔قیام رام پور کے دوران ہی انہوں نے اپنے اس مقالے پر نظرِ ثانی کی،جس پر انہیں دہلی یونیورسٹی سے گولڈ میڈل سے نوازا گیا تھا یعنی ''ہندوستانی تہذیب اور اردو'' کو از سرِ نو لکھا۔جو بعد میں تبدیل شدہ کتابی شکل میں دوسری بار شائع ہوا۔اس کے علاوہ ان کا ایک اور مقالہ جو اس زمانے میں کافی سراہا گیا وہ بعنوان ''عربی شاعری کا جاہلی دور'' ۱۹۵۷ء میں کراچی سے نکلنے والے رسالہ سوداگر میں شائع ہوا۔یہ وہ دور تھا جب اردو ادب کے چند ممتاز نقادوں کا موقف تھا کہ اردو ادب کو تاریخ کی روشنی میں پڑھنا اور پرکھنا چاہئے اور کسی بھی فن پارے کو فنکار کی شخصیت سے علاحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔اس کے علاوہ چند ناقدین جو تعمیری ادب کی پاسداری کر رہے تھے،ان کی رائے تھی کہ نقاد کو فنی معیار کے احاطے سے نکل کر تاریخ ،نفسیات اور عمرانیات کا مطالعہ کر کے اس سے ٹھوس نتائج اخذ کر کے حقائق کو سامنے لانا چاہئے اور یہی ایک بہتر ناقد کا فرض ہے۔ان سب خیالات کو پیشِ نظر رکھ کر عبدالباری صاحب نے متعدد تنقیدی مضامین

لکھے،جس میں ان کے تعمیر پسند نظریات کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔انہوں نے اپنے ان مقالوں میں نہ صرف عملی تنقید کا نمونہ پیش کیا ہے بلکہ زیادہ تر انہوں نے تعمیری تنقید کی تھیوری بھی پیش کی ہے،جس کے مطالعہ سے تعمیر پسند نظریات وخیالات کی وضاحت ہوتی ہے اوراس کے مقاصد واہمیت کا بخوبی اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے یہ مقالے تعمیر پسند نظریات کے اعتبار سے بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

رام پور میں قیام کے دوران ڈاکٹر سید عبدالباری ۱۹۵۷ء میں ادارۂ اسلامی ہند کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے۔اس کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے،انہوں نے اسلامی ادب کے ترجمان کی حیثیت سے ایک رسالہ نکالنے کی بھرپور کوشش کی اوراس کے لئے زمین ہموار کی۔کافی محنت ومشقت کرنے کے بعدان کو یہ کامیابی نصیب ہوئی اور دوسال بعد ۱۹۵۹ء میں ادارۂ ادب اسلامی کے ترجمان کی حیثیت سے رسالہ ''دانش'' کی اشاعت ہوئی۔اس رسالے کو جاری کرنے میں ادارہ الحسنات کے مالک عبدالحیٔ کا کافی تعاون حاصل ہوا۔ ''دانش''میں عبدالباری دوسال تک پابندی سے''منزل بامنزل''اور''اخبار وافکار''کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔کالم کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین اورشاعری بھی اس رسالے میں شائع ہوتی رہی۔اس رسالے میں اس عہد کے تمام تعمیر پسند ادبا وشعرا اپنا قلمی تعاون دیتے رہے۔ اس میں مسلسل لکھنے والوں میں م نسیم،عبدالمغنی،ابنِ فرید،سید زین العابدین،عروج قادری،اصغرعلی قادری وغیرہ کے نام خاص طور سے سرِ فہرست ہیں۔جس کی وجہ سے اس رسالے کی پورے ملک میں خوب حاصل ہوئی لیکن یہ رسالہ دوسال بعد بند ہو گیا۔

عبدالباری صاحب ادبی وصحافتی خدمات کے علاوہ رام پور میں اصلاحی اورسماجی کاموں میں بھی پیش پیش نظر آتے رہے۔انہوں نے وہاں کے نوجوانوں کو غلط راستے پر جانے سے روکتے اوران کواسلامی تعلیمات سے قریب لانے کی حتیٰ الامکان کوششیں کیں۔اس کے لئے انہوں نے ایک ادارہ قائم کیا جس کا نام''ادارۂ اسلامی یوتھ آرگنائزیشن''رکھا۔جس کے وہ خودصدر بھی تھے۔اس ادارے کی نشستیں بڑی پابندی سے رام پور میں منعقد کرتے،نئے طلبا کواس میں خاص مقام حاصل ہوتا تھا۔ان نشستوں میں نوجوانوں کی اصلاح اوران کے مسائل پر بحث ہوتی اوران کو بے راہ روی سے بچانے کیلئے مہم چلائی جاتی۔اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے اتر پردیش کے مختلف شہروں کا سفر کیا۔جگہ جگہ پر اجتماع کرائے جس میں نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے اصلاح معاشرہ کا تصور پیش کرتے اور نوجوانوں کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرتے۔ان

اصلاحی کاموں کے ساتھ ساتھ وہ مطالعے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ مطالعہ کا شوق ان کے اندر فطری تھا جو تا عمر قائم رہا۔ قیامِ رام پور کے دوران انہوں نے رام پور کی رضا لائبریری سے خوب استفادہ کیا۔ وہاں برابر تشریف لے جاتے رہے اور کتابوں کا مطالعہ کرنے میں سرگرم رہتے۔ اس کے علاوہ وہاں کی صولت لائبریری میں بھی کتابوں کی تلاش میں جایا کرتے اور جوان کے مصرف کی کتاب ہوتی اس کو پڑھ کر واپس کر دیتے۔ یہ ان کی زندگی کا معمول سا بن گیا تھا۔ ان کے اس وسیع مطالعے کا ہی نتیجہ ہے کہ انہوں نے اتنے بہترین اور معیاری تنقیدی و تحقیقی مضامین لکھے، جو آج ہر اردو طلبہ و طالبات کے لئے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ عبدالباری لکھنؤ کی طرح یہاں بھی مذہبی و ادبی محفلوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ رام پور کی جامع مسجد کے امام وجیہ الدین کی خدمت میں بڑی پابندی سے حاضری دیا کرتے تھے۔ جن سے انہیں اسلامی فقہ وغیرہ کی کافی معلومات حاصل ہوئی۔ ان سب علوم وفنون کے علاوہ رام پور میں ایک طبیب سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے۔ ان کے مطب میں عبدالباری صاحب برابر تشریف لے جاتے رہے۔ حکیم جی بڑے بذلہ سنج انسان تھے، اس لئے دونوں میں بڑی ذہنی مطابقت تھی۔ پورے رام پور میں انہیں حکیم مسیحا نظامی کے نام سے شہرت حاصل تھی۔ ان کے یہاں بھی اکثر محفلیں منعقد ہوتی تھیں جس میں عبدالباری شریک ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ رسالہ ''زندگی'' کے مدیر مولانا حامد علی سے بھی برابر ملاقات کرتے اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ شاد عارفی جن کا شمار وہاں کے ممتاز استاذ شعرا میں ہوتا تھا، ان سے بھی شرفِ تلمذ حاصل کیا اور ان سے اپنے کلام پر جب تک رام پور میں قیام پذیر رہے اصلاح لیتے رہے۔ سید عبدالباری ان ادبی و علمی سرگرمیوں سے جب ذرا بھی فرصت پاتے تو سماجی، معاشرتی اور تمدنی زندگی اور قدرت کے بے شمار نظاروں سے لطف اندوز ہوتے۔ رام پور میں لگنے والی عظیم الشان نمائش میں اپنے دوستوں کے ساتھ بڑے شوق سے جاتے اور اپنے لئے سیر و تفریح کا سامان مہیا کرتے۔ موسمِ گرما میں باغوں کی سیر کرتے اور آموں کا موسم آتے ہی وہ وہاں کے مشہور باغ ''باغِ بے نظیر'' جاتے اور آموں سے اپنے منھ کا ذائقہ بدلتے۔ رام پور کی ٹوپی انہیں بہت پسند تھی، اس کے علاوہ وہاں کے چاقو کو بھی پوری دنیا میں شہرت حاصل ہے۔ عبدالباری صاحب ان سب دکانوں کی سیر اکثر کرتے رہتے۔

قابلِ غور بات ہے اردو ادب علم وفن کے جتنے بھی دبستان تھے عبدالباری صاحب نے ہمیشہ اپنا رخ وہیں کا کیا۔ پہلے لکھنؤ کی تہذیبی و معاشرتی اور ادبی زندگی سے فیض یاب ہوئے، پھر عہدِ نوابین میں اردو ادب کے حوالے سے مرکزی درجہ رکھنے والے شہر رام پور میں بھی قیام کیا اور وہاں کی تہذیب و تمدن سے آشنا ہوئے

۔یہاں سے فراغت حاصل کر لینے کے بعد ۱۹۶۰ء میں اب انہوں نے مشرقی اتر پردیش کے مردم خیز اور ادبی حوالے سے سب سے زیادہ زرخیز علاقہ اعظم گڑھ کا رخ کیا۔غرض انہیں جہاں جہاں سے علم حاصل کرنے کی خواہش ہوئی وہ وہاں تشریف لے گئے ،خواہ وہ کوئی ادبی محفل ہو یا کسی بزرگ کی خانقاہ ہو،انہوں نے ہر مقام پر پہنچ کر اپنی علمی تشنگی کو بجھایا اور خوب سیراب ہوئے۔عبدالباری صاحب رام پور میں علمی ادبی محفلوں اور کتب خانوں سے استفادہ کرنے کے بعد جب علم کی تشنگی کا احساس ختم نہیں ہوا تو ۱۹۶۰ء میں مذید عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اعظم گڑھ کے مشہور مدرسے ''مدرستہ الاصلاح'' سرائے میر چلے گئے ، جہاں انہوں نے اپنے شوق کو مذید پروان چڑھایا۔سرائے میر میں ان کے مشفق چچا سید عبدالوافی پہلے سے قیام پذیر تھے۔وہ یہاں پر اسٹیشن ماسٹر تھے۔عبدالباری صاحب یہاں پر چچا کے ساتھ تقریباً ایک سال یعنی ۱۹۶۱ء تک مقیم رہے۔یہاں بھی عبدالباری صاحب نے وہی معمول اپنایا، جو ان کا دیگر درسگاہوں میں پہلے سے تھا۔وہ اپنے معمول کے مطابق مدرستہ الاصلاح کے درسِ قرآن وحدیث اور فقہ کی کلاسوں میں پابندی سے شرکت کرتے اور متعدد شخصیات سے استفادہ کرتے رہے۔اس زمانے کے ممتاز عالم ومفسرِ قرآن مولانا حمید الدین فراہی کے صاحب زادے عباد فراہی اس وقت مدرسے کے ناظم تھے، وہ عبدالباری کی ذہانت ، عادت واطوار سے کافی متاثر ہوئے اور ان کو اپنے خاص رفقا میں شامل کر لیا،عبدالباری کو کافی سہارا دیا اور ان کی خوب پذیرائی کی۔ان کی قربت نے عبدالباری صاحب کو کافی فیض یاب کیا۔انہیں کی بدولت انہیں مولانا فراہی کے آبائی گاؤں جانے کا موقع ملا اور مولانا فراہی کی نشست گاہ اور ان کی کتابوں کا ذخیرہ دیکھنے اور اس سے مستفید ہونے کا موقع بھی فراہم ہوا۔مشہور اسلامی ادیب وشاعر کوثر اعظمی سے بھی انہیں قربت حاصل ہوئی۔اس کے علاوہ اعظم گڑھ کے نامور شعرا و ادبا سے ان کے تعلقات اس زمانے میں کافی گہرے ہو گئے تھے۔ناطق اعظمی اور مطلوب اعظمی سے ان کی خاص دوستی تھی ، ان احباب سے وہ بے تکلف ہو کر باتیں کیا کرتے تھے، جس سے ان کی ذہنی تفریح بھی ہو جایا کرتی تھی۔ان ادبا اور شعرا کے ساتھ وہ اعظم گڑھ کی ادبی وشعری نشستوں میں پابندی سے شرکت کیا کرتے۔

اعظم گڑھ کے قیام کے دوران ۱۹۶۱ء میں عبدالباری صاحب رشتہ ازدواج سے منسلک ہو گئے۔ان کی شادی ٹانڈہ میں خود ان کے کسی عزیز کی بیٹی خالدہ خاتون سے ہوئی۔خالدہ خاتون اپنے زمانے کے اعتبار سے محلے میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔عبدالباری کی شادی نہایت سادگی سے اسلامی رسم ورواج کے مطابق ہوئی تھی دوسری بات اس وقت عبدالباری صاحب کے معاشی حالات بہت اچھے نہیں

تھے جس سے وہ دھوم دھام سے شادی انجام دیتے۔ان کی شادی میں کوثر اعظمی نے بھی شرکت کی اور ایک سہرا لکھ کر اس شادی میں اپنا تعاون پیش کیا۔اس کے علاوہ عبدالباری کے ہمدمِ دیرینہ بزرگ دوست ابوالمجاہد زاہد نے بھی رام پور سے ایک سہرا لکھ کر ارسال کیا، جو فیض آباد کی ایک ادبی محفل میں ان کے دوست سید انعام اللہ کے گھر پر پڑھا گیا تھا۔شادی کے ابھی دو ہفتے ہی ہوئے تھے کہ انہوں نے اس بار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور داخلہ کے لئے ٹانڈہ سے روانہ ہوئے۔اسی وقت جبل پور میں قیامت کا فساد برپا ہوا، جس میں جان و مال کا کافی نقصان ہو۔الوگ گھر سے بے گھر ہو گئے۔عبدالباری اس وقت علی گڑھ پہنچ چکے تھے، انہوں دیکھا وہاں سے سینکڑوں طالبِ علم اور اساتذہ کا ایک گروہ مالی امداد اور ان کی مدد کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔چنانچہ انہوں نے داخلہ کا ارادہ ترک کیا اور ریلیف کیمپ میں شامل ہو گئے اور جبل پور پہنچ کر لاچاروں اور مجبوروں کی خدمت میں دل و جان سے لگ گئے۔عبدالباری تقریباً ۲۲ دن تک یہاں پر لوگوں کو راحت پہنچانے کا کام کرتے رہے۔اسی دوران انہیں اسلامی ادب کے معروف شاعر شفیع مونس سے ملنے کا موقع فراہم ہوا۔جو اس وقت جماعتِ اسلامی ہند کی طرف سے آئے ہوئے امدادی کیمپ کے انچارج تھے۔عبدالباری ان کی شخصیت اور ذہانت سے کافی متاثر ہوئے۔اس کے علاوہ جبل پور میں جمعیۃ العماء کا کیمپ بھی انہیں کاموں میں سرگرم عمل تھا۔جس میں شاہد فاخری اور مولانا حفظ الرحمٰن جیسی عالم و فاضل شخصیت مظلوموں کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی، ان سب سے عبدالباری کی ملاقاتیں ہوئیں اور ۲۲ دن کے اس کیمپ میں بھی انہوں نے اچھے خاصے لوگوں سے قربت حاصل کر لی تھی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے ان کی شخصیت کتنی پر کشش تھی جہاں بھی جاتے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی۔

علی گڑھ میں داخلہ تو ہوا نہیں، اس لئے وہ اسی سال ۱۹۶۱ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گھور کھپور چلے گئے۔جہاں ان کے بڑے چچا سید عبدالکافی ریلوے میں ٹیلی گراف انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ان کے چچا نہایت متقی اور پرہیزگار انسان تھے، جس کے لئے ان کا پورا خاندان جانا جاتا تھا۔وہ مولانا وصی اللہ جو پھول پور کے رہنے والے تھے، ان سے کافی عقیدت رکھتے تھے اور ان کے مرید بھی تھے۔عبدالباری انہیں کی سرپرستی میں گورکھپور میں قیام پذیر ہوئے اور گورکھپور یونیورسٹی میں انہوں نے اس بار ایم اے انگلش میں داخلہ لے لیا۔عربی اور فارسی زبان پر دسترس حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اب انگریزی زبان و ادب پر بھی عبور حاصل کرنا چاہا۔اس لئے اب وہ تن من دھن اور دل و جان سے انگریزی زبان و ادب کے مطالعے میں محو ہو گئے۔دو سال کے اندر انگریزی زبان پر بھی اچھی خاصی دسترس حاصل کر لی۔مگر اس دوران ان کی اردو ادب

سے محبت ذرا بھی کم نہیں ہوئی۔ وہ اردو ادب کی محفلوں میں برابر شرکت کرتے رہے اور اردو سے متعلق کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رہا۔اس وقت گورکھپور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر محمود الٰہی صاحب تھے، جو عبدالباری کے ہم وطن بھی تھے۔ان کی خدمت میں برابر حاضر ہوا کرتے تھے اور شعر و ادب سے متعلق کافی باتیں ہوا کرتیں جس سے ان کے علم میں اضافہ ہوتا گیا۔جس وقت عبدالباری صاحب یہاں پر زیرِ تعلیم تھے، اس وقت گورکھپور کو لکھنؤ، دہلی، رام پور، اور اعظم گڑھ کی طرح مرکزیت حاصل تھی۔ یہاں بھی متعدد شعرا و ادبا کی بڑی تعداد موجود تھی۔شعبہ اردو میں محمود الٰہی کے ساتھ پروفیسر سلام سندیلوی، اور احمر لاری جیسی ادب نواز شخصیات موجود تھیں۔ یونیورسٹی کے علاوہ گورکھپور کے شہر میں بھی کئی معزز شخصیت موجود تھیں۔مولانا صدیق اور حکیم وجہہ اللہ جیسے بزرگوں کی خدمت میں عبدالباری پابندی سے حاضری دیتے۔انہوں نے اس وقت مولانا نظام الدین سے کافی استفادہ کیا، جو اس وقت اتفاق سے اسی شہر میں مقیم تھے اور عبدالباری انہیں کے ساتھ کچھ دن ''میاں صاحب جارج اسلامیہ ہوسٹل'' کے ایک بڑے سے کمرے میں مقیم رہے۔غرض اس وقت تمام دبستانوں کی طرح یہاں بھی ادبی و علمی شخصیتوں کا ایک ہجوم تھا۔عبدالباری صاحب یہاں بھی مختلف کتب خانوں کے چکر لگاتے اور اپنے مطالعے کے لئے کتابیں دریافت کرتے رہے۔لیکن اس وقت عبدالباری صاحب انگریزی میں ایم اے کر رہے تھے، اس لئے ان کا سارا زور انگریزی کتابوں کے مطالعے پر تھا۔اس وقت انہوں نے اردو ادب کی تنقید پر انگریزی زبان و ادب کو اہمیت دی اور اس کے مطالعے سے اپنے علمی ذخیرے میں اچھا خاصہ اضافہ کیا۔گورکھپور میں عبدالباری نے ایسے احباب بھی بنا رکھے تھے، جن کو انگریزی زبان پر دسترس حاصل تھی انہیں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ناشتہ پانی سب کچھ کرتے۔ان کے سب سے اچھے دوست نور الرحمٰن خاں تھے، جن سے انہیں انگریزی کتابوں کے مطالعے اور اس کی فراہمی میں کافی مدد ملتی تھی۔ یہاں بھی وہ سبھی سیمناروں اور ادبی و غیر ادبی محفلوں کا حصہ بنتے۔اسی زمانے میں انہوں نے معروف افسانہ نگار پریم چند پر ایک طویل مقالہ لکھ کر وہاں کے سیمیناروں میں پیش کیا جس کی خوب پذیرائی ہوئی جس کے سبب ان کا حوصلہ اور بھی بلند ہو گیا۔اسی زمانے میں ہندی گورکھپوری کو مشاعروں کی دنیا میں بڑی شہرت حاصل تھی، عبدالباری کا ان کے ساتھ بھی مدتوں اٹھنا بیٹھنا رہا۔اسلامی ادب کی فکر رکھنے والے شاعر فاروق بانسپاری سے بھی ان کے گہرے مراسم قائم ہوئے۔عبدالباری ان کی شخصیت سے بھی مستفیض ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی زبان میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے والے کو پورے ملک میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔اس وقت سید عبدالباری کی صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ابھی انہوں نے گورکھپور یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی ہی تھی کہ ان کو دہلی سے محمد یوسف صدیقی کا خط ملا، جس میں لکھا تھا وہ دہلی

آ کر انگریزی ہفتہ وار میگزین ریڈینس کے نئے ادارتی اسٹاف میں کام کریں۔ پھر کیا تھا ان کو بیٹھے بیٹھائی نوکری مل گئی، انہوں نے سیدھا دہلی کا رخ کیا اور اس رسالے سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ ''ریڈینس'' کا دفتر پرانی دہلی جامع مسجد کے پاس واقع تھا، اس وقت اس رسالے کے مدیر نہایت مشاق اور تجربہ کار انگریزی صحافی ''اے روف'' تھے۔ ان کے ساتھ وہ تقریباً ایک سال تک کام کرتے رہے اور انگریزی زبان میں نیوز اور مضامین لکھنے لکھانے کا کام جاری رہا۔ لیکن عبدالباری بہت جلدی صحافت کی اس مشقت، دشواریوں اور پریشانیوں سے اوب گئے اور انہوں نے اس نوکری کو خیر آباد کہہ دیا۔ اسی دوران جون ۱۹۶۴ء میں ہمارے ملک کے پہلے وزیر اعظم کا انتقال بھی ہوا تھا، اس وقت وہ دہلی میں مقیم تھے اور ان کے آخری رسوم کا منظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ پنڈت نہرو کی موت کے بعد جو افراتفری اور اتھل پتھل کا ماحول ملک میں برپا ہوا، ان سب کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا اور بعد میں ان سب واقعات پر قلم فرسائی بھی کی۔ ریڈنیس سے مستعفی ہونے کے بعد انہوں نے آندھر پردیش سے نکلنے والے رسالہ ماہنامہ ''افق'' کو اکتوبر ۱۹۶۴ء میں جوائن کیا۔ عبدالباری صاحب یہاں بھی ادارتی بورڈ میں شامل ہوئے اور ادارۂ اسلامی کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے مسلسل ''منزل بامنزل'' کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔

دریں اثنا میں ان کے آبائی وطن ٹانڈہ میں مختار احمد مظاہری ۱۹۶۲ء میں ادارۂ اسلامی ادب کے نئے صدر منتخب ہوئے اور سید عبدالباری ان کے شانہ بشانہ رہے اور ان کے معاون کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ جون ۱۹۶۴ء میں عبدالباری نے دہلی سے اپنے وطن واپسی کی اور یہیں پر ایک کالج میں انگریزی استاد کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ ٹانڈہ میں ان کے سب سے قریبی ادارۂ ادب اسلامی کے صدر مختار احمد مظاہری موجود تھے، جن کا ابھی گزشتہ سال ۲۰۱۴ء میں انتقال ہوا ہے۔ عبدالباری صاحب کی مظاہری صاحب سے خوب جمتی تھی، انہوں نے ان کے ساتھ مل کر اردو زبان و ادب کے فروغ کے حوالے سے کئی پروگرام بنائے۔ جس میں ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ ادارۂ ادب اسلامی کے ترجمان کی حیثیت سے ایک رسالہ کی اشاعت کی جائے۔ ابھی اس پر غور وخوص کر ہی رہے تھے کہ عبدالباری صاحب کو فیض آباد کے فاربس کالج میں ملازمت مل گئی، چنانچہ انہوں نے اس کام کو چھوڑ کر پہلے ملازمت کو ترجیح دی اور ۱۹۶۵ء میں وہ فاربس کالج فیض آباد میں انگریزی لیکچرر کی حیثیت سے ۸ سال تک درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں ان کی علمی وادبی تحقیقی وتنقیدی صلاحیت بامِ عروج پر پہنچتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

فیض آباد کی ملازمت کے دوران ان کی اردو ادب سے دلچسپی ذرا بھی کم نہیں ہوئی۔ دو سال ملازمت کے بعد انہوں نے رسالہ نکالنے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ نومبر ۱۹۶۷ء میں پروان چڑھا۔ چنانچہ مختار احمد مظاہری اور سید عبدالباری کے ادارت میں ٹانڈہ سے ممتاز ادبی رسالہ ''دوام'' ادارۂ اسلامی ادب کے ترجمان کی حیثیت سے جاری ہوا۔ یہ رسالہ ہر مہینے بڑی پابندی سے نکلتا تھا۔ اس رسالے نے اس دور کے مطابق ترقی پسند ادب کے برعکس تعمیر پسند و مثبت نظریات کی حامل تمام ادبی شخصیتوں کو اپنا محور و مرکز بنالیا تھا۔ اس میں ملک کے تمام ادبا و شعرا کے کلام و مضامین شائع ہوتے رہے۔ مختلف موضوعات پر بحث و مباحث کا سلسلہ بھی چلتا رہا جس سے ذہن میں موضوع کے مطابق نئے در وا ہوتے اور قارئین کے اندر ایک نئی تازگی کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں سیمینار اور سمپوزیم کا بھی سلسلہ چلتا رہا۔ اس رسالے کی اشاعت کے لئے انہوں نے ملک بھر کا سفر کیا۔ جہاں جہاں بھی اہل قلم موجود تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے انٹرویوں لیتے جو دوام کے شماروں کی زینیت بنتے رہے۔ اس میں ملک کے ممتاز قلم کار عبدالماجد دریا آبادی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، قاری طیب عثمانی، مفتی عتیق الرحمٰن، ابوالحسن علی ندوی، بیرسٹر یاسین نوری، بدرالدین طیب جی، ڈاکٹر سید محمود وغیرہ سے عبدالباری نے براہِ راست انٹرویو لیا اور ان کے حالات زندگی اور ملک میں ہونے والی سیاسی اور ادبی، قومی اور بین الاقوامی مسائل پر ان کے موقف سے دوام کے قارئین کو حتیٰ الامکان روشناس کراتے رہے۔ رسالہ دوام اس طرح چار سال بڑی خوش اسلوبی سے مسلسل نکلتا رہا اور پھر کسی وجہ سے ۱۹۷۱ء میں بند ہو گیا۔ رسالے کی اشاعت کے دوران ۱۹۶۹ء انہوں نے ایک سوانح عمری بھی لکھی۔ یہ سوانح ہندوستان میں چودھویں صدی کے ایک بزرگ اور صوفی حضرت مخدوم اشرف سمنانی کے حالات زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ عبدالباری صاحب ان کی زندگی سے کافی متاثر تھے۔ انہیں کے قصبہ ٹانڈہ سے ۱۴ کلومیٹر دور کچھوچہ میں ان کی مزار ہے جہاں آج بھی لاکھوں زائرین ان کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ یہ وہی مخدوم اشرف سمنانی ہیں جنہوں نے اردو کا پہلا رسالہ تصوف الاخلاق جاری کیا تھا۔ عبدالباری نے مخدوم اشرف سمنانی کی پوری حیات اور کارناموں کا عکس اپنی سوانح میں کھینچا ہے۔ یہ تصنیف دانش بک ڈپو ٹانڈہ سے شائع ہوئی اور آج تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

رسالے کی اشاعت بند ہونے کے چند مہینوں کے بعد ۱۹۷۲ء میں عبدالباری اپنے ایک دوست سید انور علی کی گزارش پر بھٹکل چلے گئے۔ جہاں انجمن کالج آف آرٹس و سائنس میں کچھ مہینے بحیثیت لیکچرر خدمت انجام دیتے رہے۔ بھٹکل کی زبان اور وہاں کے کلچر سے کافی متاثر ہوئے اور انہوں نے وہاں کی تہذیب و ثقافت پر کئی

مضامین بھی لکھ ڈالے۔عبدالباری صاحب انگریزی سے ایم اے کرنے کے بعد انگریزی کے استاد ضرور مقرر ہوئے لیکن اردو زبان وادب سے رغبت ذرا بھی کم نہیں ہوئی بلکہ ان کا اصل میدان اردو ہی رہی۔اس بات کا احساس انہیں شدت سے تھا،اس لئے انہوں نے ۱۹۶۹ء میں گورکھپور یونیورسٹی سے دوبارہ ایم اے (اردو) کا امتحان پاس کیا اور ممتاز نمبروں سے کامیابی حاصل کر کے گولڈ میڈلسٹ کا خطاب بھی حاصل کیا۔یہ مڈل ان کی ذہانت و ذکاوت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کرنے نے بعد اب ان کا راستہ بالکل صاف اور واضح تھا۔چناچہ ۱۹۷۲ء میں انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لئے داخلہ لیا اور پروفیسر شبیہ الحسن نہروری کی نگرانی میں ’’لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی اور تہذیبی پس منظر (نوابینِ اودھ کے عہد میں)‘‘ پر تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کیا۔اس دوران وہ فیض آباد کی ملازمت بھی کرتے رہے اور اپنے موضوع پر کام بھی کافی محنت و مشقت سے انجام دیتے رہے۔اس طرح یہ مقالہ تقریباً ۶۔۷ سال میں بڑی محنت، مشقت اور لگن سے مکمل ہوا اور انہیں اسی مقالے پر ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل ہوئی۔عبدالباری کے اس مقالے سے خوش ہو کر ان کے استاد نگراں نے انہیں گلے سے لگا لیا،انہیں اس بات کی خوشی ہوئی کہ ان کے شاگرد نے تحقیق کا حق ادا کر دیا۔یہ عبدالباری کا ایک شاہکار کام تھا جو ۱۹۸۷ء میں کتاب کی شکل میں شائع ہوی اور لکھنوی ادب کے مطالعے کی حیثیت سے کافی اہم ثابت ہوا۔اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۶ء دہلی سے شائع ہوا اور ابھی حال ہی میں اسے قومی کونسل برائے فروغ اردو نے بھی شائع کیا ہے۔یہ کتاب اردو کے تمام طالب علموں کے لئے خاص طور سے دبستانِ لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے کافی اہم ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری ۱۹۷۳ء میں فیض آباد کی سکونت ترک کر کے جون پور آ گئے اور وہاں ایک ڈگری کالج کے شعبہ اردو میں لیکچرر ہو گئے۔یہاں پر انہوں نے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۴ء تک قیام کیا۔اس کے بعد انہیں گنپت سہائے پوسٹ گریجویٹ کالج سلطان پور میں سرکاری ملازمت مل گئی اور وہاں کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے۔اور تقریباً ۲۴ سال تک درس و تدریس کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی آبیاری کرتے رہے۔گنپت سہائے ڈگری کالج میں ایم اے کے ساتھ ساتھ ۱۹۸۹ء میں تحقیق کا بھی آغاز ہو اچکا تھا۔سید عبدالباری سلطان پور میں صدرِ شعبہ بھی مقرر ہوئے۔اس کے علاوہ وہ اکیڈمک کونسل اور ریسرچ باڈی کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔ان کی نگرانی میں بہت سے طلبہ اور طالبات نے تحقیقی کام انجام دیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ڈاکٹر عبدالباری اردو ادب کے لئے ہمیشہ سرگرم اور فعال رہے۔ان سے جتنا بھی ہو سکا اردو ادب کی خدمت کرتے

رہے۔انہوں نے صدر شعبہ کی حیثیت سے یہاں پر متعدد پروگرام اور سیمینار منعقد کئے۔جس سے شہر سلطان پور میں اردو زبان و ادب اور ادبی سرگرمیوں کو خوب فروغ حاصل ہوا۔سید عبدالباری کی کاوشوں اور کوششوں کے سبب یہاں کا شعبہ اردو کافی پراوان چڑھا۔یہی وہ دور ہے جس میں سید عبدالباری نے خوب تنقیدی و تحقیقی مضامین لکھے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہتے۔اسی زمانے میں ان کی شخصیت میں چار چاند لگ جاتا ہے اور وہ پورے ملک میں ادبی حوالے سے ایک پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے۔یہی وہ دور ہے جس میں ان کے مضامین کے کئی مجموعے ''ادب اور وابستگی''، ''نقدِ نو عیار''،اور ''افکارِ تازہ'' شائع ہوکر مقبولیت کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے۔اسی دوران عبدالباری کے کرم فرما م نسیم نے ۱۹۸۰ء میں ادارۂ ادب اسلامی کے ترجمان کی حیثیت سے رسالہ ''نئی نسلیں'' کی اشاعت کا آغاز کیا۔جس کا دفتر دہلی میں تھا۔اس کے ادارتی بورڈ میں سید عبدالباری (شبنم سبحانی) معاون مدیر کی حیثیت سے شامل تھے اور اس کے اداریے سلطان پور سے لکھ کر مسلسل دہلی روانہ کرتے رہے۔فروری ۱۹۸۱ء میں اس رسالے کا دفتر دہلی سے علی گڑھ منتقل ہوگیا اور اب اس کے مدیر ابنِ فرید اور انجم نعیم ہوگئے تھے۔حالانکہ ادارتی بورڈ میں عبدالباری اب بھی شامل تھے لیکن اب اس کے اداریے نہیں لکھتے تھے۔۱۹۸۳ء اس رسالے کی اشاعت بند ہوگئی۔اسی دور ۱۹۸۶ء میں انہوں نے ٹانڈہ سے نکلنے والا رسالہ ''دوام'' ایک بار پھر از سرِ نو نکالنے کا عزم کیا اور اس بار یہ رسالہ پہلے سے کہیں زیادہ معیاری شکل میں ''دوامِ نو'' کے نام سے شروع ہوا۔یہ رسالہ ٹانڈہ ضلع امبیڈکر نگر سے کافی پابندی سے شائع ہوتا رہا۔اس میں ادبی مضامین کے علاوہ سیاسی اور معاشرتی مضامین بھی شائع ہوتے۔اس رسالے میں بھی عبدالباری نے کئی انٹرویوز شائع کئے اس کے لئے انہوں نے ملک بھر کا خوب سفر کیا۔ان کے لئے ہوئے انٹرویوز اب ''ملاقاتیں'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔اس رسالے کی اشاعت کا دائرہ پہلے سے کہیں زیادہ وسیع تر تھا۔اس کی آب و تاب دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے یہ رسالہ کئی انگریزی رسالوں پر بھاری ہے۔دوامِ نو کی اشاعت بھی کافی دنوں تک نہ ہوسکی اور ۱۹۹۰ء میں بند ہوگیا۔

سید عبدالباری صاحب ابتدا سے ہی نوجوانی کے عالم سے ادارۂ ادب اسلامی کی رکنیت اختیار کر لی تھی اور انہیں نظریات واصول پر قائم رہتے ہوئے تمام عمر ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔غرض وہ اس تحریک کے ایک اہم ستون ہی نہیں بلکہ روحِ رواں کی حیثیت رکھتے تھے۔ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے ۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر سید عبدالباری (شبنم سبحانی) کو ادارۂ ادب اسلامی ہند کی مجلسِ اعلیٰ نے دہلی میں جماعت اسلامی ہند کا صدر بنایا اور اس عہدے پر وہ ۲۰۰۳ء تک فائز رہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے یہاں بھی صحافت کا پیچھا نہیں چھوڑا اور اپنی

نگرانی میں ادارۂ ادب اسلامی کا ترجمان رسالہ ''پیش رفت'' ۱۹۹۳ء میں جاری کیا، اس کے پہلے مدیر عزیز بگھروی منتخب ہوئے۔عزیز بگھروی کی ادارت میں یہ رسالہ کافی پروان چڑھا بعد میں ابنِ فرید وغیرہ کئی لوگ اس کے مدیر ہوئے۔لیکن اس رسالے کو دوام تب حاصل ہوا جب انہوں نے خود ۲۰۰۲ء میں اس کے مدیر کی ذمہ داری سنبھالی اور تاعمر اس کی ادارت کرتے رہے۔اس رسالے میں ان کے لکھے ہوئے اداریئے ''روشنی بکھرتی ہے'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں جس کو انتظار نعیم نے مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کا اس ادارہ کے علاوہ اتر پردیش اردو اکادمی سے بھی گہرا تعلق رہا ہے۔وہاں بھی وہ کئی کمیٹیوں کے ممبر تھے۔اتر پردیش سے شائع ہونے والی کئی کتابوں پر انہوں نے مقدمے بھی لکھے ہیں۔ظریف لکھنوی کی مزاحیہ شاعری کو ترتیب دے کر اس پر ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا جو ۱۹۸۰ء میں وہاں سے شائع ہوا۔اس کے علاوہ وہ اتر پردیش اردو اکادمی کے مختلف موضوعات پر ہونے والے سیمیناروں میں پابندی سے شرکت کیا کرتے رہے۔اتر پردیش اردو اکادمی کے سیمیناروں کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر کئی سیمینار میں شرکت کرتے رہے۔۲۷ مارچ ۱۹۸۴ء میں وہ گیا کے ایک سیمینار میں شرکت کر کے ''ادب اور وابستگی'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔۱۹۹۵ء میں قطر کے ایک سیمینار میں تشریف لے گئے۔اس کے دو سال بعد ۱۹۹۷ء میں انہیں پاکستان سے بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کرنے کا دعوت نامہ موصول ہوا۔عبدالباری صاحب پاکستان میں اپنے تمام ہندوستانی اہلِ علم کے ساتھ گئے اور واپسی پر چند صفحات پر ایک مختصر سا سفر نامہ بھی تحریر کیا اور کچھ سال پہلے ۲۰۱۲ء میں انہوں نے دبئ کے ایک انٹرنیشنل سیمینار میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔اس کے علاوہ انہوں نے ملک کے مختلف شہروں ممبئ، حیدرآباد، بنگلور، کلکتہ، اور پٹنہ کے کئی سیمیناروں میں اپنا قلمی تعاون پیش کرتے رہے۔اعظم گڑھ میں جامعۃ الفلاح میں بھی سیمینار میں مقالہ پیش کرنے کا موقعہ ملا۔اس کے علاوہ وہاں شبلی کالج، دارالمصنفین اور جامعۃ الرشاد میں بھی گاہے بگاہے شرکت کر کے اپنا مقالہ پیش کرتے رہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری ۱۹۹۸ء میں سلطان پور گنپت سہائے پی جی کالج سے صدرِ شعبہ کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے۔ابھی وہ ٹانڈہ منتقل ہونے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا، جن کی خواہش تھی عبدالباری ملازمت سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ان کے پاس ٹانڈہ میں ہی رہیں۔اپنی والدہ کی آخری خواہش پوری کرنے کے لیے کچھ دن اپنے آبائی وطن ٹانڈہ میں ہی سکونت اختیار کی اور یہاں ماضی

کے دریچوں سے تاک جھانک کر کے لطف اندوز ہوتے رہے۔اسی درمیان ان کے بچوں کی تعلیم مکمل ہوگئی اور ان لوگوں نے دہلی میں ملازمت اختیار کر لی۔ چنانچہ عبدالباری بھی اپنے بچوں کے ساتھ دہلی میں منتقل ہو گئے کیوں کہ ٹانڈہ میں ان کی دیکھ ریکھ کرنے والا کوئی نہیں تھا اس لئے اب وہ دہلی میں رہنے لگے۔ ویسے بھی وہ ادارۂ اسلامی کے صدر تھے اور ان کا دہلی میں رہنا زیادہ مناسب تھا۔ ملا جلا کر یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا دہلی کی کشش انہیں یہاں لے ہی آئی۔ دہلی میں وہ شاہین باغ میں اپنا مکان لے کر رہنے لگے جو جماعتِ اسلامی ہند سے کافی قریب شاہین باغ میں واقع ہے، وہ گھر سے جماعت کے دفتر پیدل آتے اور جاتے۔ دہلی آنے کے بعد ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۴ء تک تحریکِ اسلامی ہند کی تصنیفی اکیڈمی کے سکریٹری کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔اس دوران ان کے مراسم آبجیکٹیو اسٹڈیز دہلی اور مکتبہ اسلامی نئی دہلی سے بھی کافی گہرے ہو گئے تھے۔ان اداروں کے لئے انہوں نے اسلامی موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں۔ دراصل ڈاکٹر سید عبدالباری صرف اردو زبان وادب کے ہی مبلغ نہیں تھے بلکہ ان کی ایک پہچان اسلامی اسکالر کی بھی تھی۔انہوں نے جہاں تنقید وتحقیق پر معرکتہ آرا کتابیں تخلیق کی ہیں وہیں اسلامی فکر پر مبنی ''اسمائے حسنیٰ''،''کردار سازی''،''آزاد ہندوستان میں مسلم تنظیمیں''، جمہوریت''،''انسان دوستی اور اسلام''،''دہشت گردی اور اسلام''،''اسلام میں آدابِ اختلاف''،''اسلام ورسز ٹیررزم''(انگریزی میں) جیسی پر مغز کتابیں بھی تصنیف کیں ہیں۔غرض یہ کہ اسلامی فکر کے ترجمان کی حیثیت سے بھی عبدالباری کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دہلی میں قیام کے دوران ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس سے ان کی متعدد تحقیقی وتنقیدی کتابیں منظرِ عام پر آئیں جس میں ''کاوش نظر''،آدابِ شناخت''،''لکھنؤ کے شعر وادب کا معاشرتی وثقافتی مطالعہ (۱۹۴۷ء تک)''،''فکر انگیز (نظموں کا مجموعہ)''،''طرب خیز (غزلوں کا مجموعہ)''انوکھے لوگ نرالی باتیں''،''نئی خوشبو نئے خواب''خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں انہیں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی وہاں سے واپس آنے کے بعد سفرنامۂ حج ''جلوے ہیں بے شمار'' کے نام سے لکھا یہ کتاب بھی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوئی ہے۔اس کے علاوہ عبدالباری صاحب ۲۰۰۴ء سے تا حال آل انڈیا ملی کونسل کے ماہنامہ ملی اتحاد کے مدیر بھی رہے اور اس میں بھی سیاسی موضوعات پر اداریئے لکھتے رہے۔

ان ادبی سرگرمیوں کے علاوہ ان کی ذاتی زندگی بھی کافی خوشگوار گزری۔ سید عبدالباری کی ادبی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے، ان کی شریک حیات خالدہ خاتون نے ساری گھریلو ذمہ داریاں خود سنبھال لیں اور انہیں ادبی خدمات کے لئے ایک دم سے فارغ کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالباری صاحب کے لئے گھریلو دیکھ ریکھ اور

بال بچوں کی تعلیم و تربیت کا کام کافی مشکل ہوتا اگر وہ ساتھ نہ دیتیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے یہ کثیر الاولاد بھی تھے۔ اس وجہ سے پانچ بچیوں اور تین بیٹوں کی تعلیم و تربیت کرنا اور ان کو اعلیٰ تعلیم دینا ان کے لئے آسان کام نہ ہوتا۔

سلطان پور میں درس و تدریس کے دوران شعبہ اردو کی تمام مصروفیت کو وہ بخوبی انجام دیتے مگر تنقید و تحقیق کے طلبہ و طالبات کی رہنمائی ان کے لئے سب سے اہم تھی۔ ان کے ساتھ جن طالب علموں نے کام کیا ہے، عبدالباری صاحب ان سے بالکل قربت اختیار کر لیتے اور قدم قدم پر ان کی رہنمائی کرتے رہتے۔ ان کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی بڑی بیٹی ڈاکٹر تنویر فاطمہ نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''وہ سراپا خلوص کا پیکر تھے۔ کچھ چھپانا یا پس پردہ رکھنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ہر جاننے والا جو آرزو لے کر آتا وہ سیراب ہو کر جاتا تھا، خصوصاً تعلیم کے سلسلے میں اکثر طلبا آتے اور معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان میں زیادہ تر پی ایچ ڈی کے مقالے کے عنوان یا پھر synopsis کی تیاری، یا کتابوں کی فہرست وغیرہ کے سلسلے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لئے تشریف لاتے تھے اور اکثر گھنٹوں بیٹھتے مگر والد صاحب کبھی بیزاری کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ان کے لئے چائے ناشتہ کا اہتمام بھی کرواتے اور انہیں پوری طرح مطمئن کر کے روانہ کرتے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ چاہتے کہ تعلیم کے میدان میں ان کے شاگرد بھی کبھی پیچھے نہ ہٹیں۔ اس لئے ہر ممکن کوشش کرتے۔ ان کی حوصلہ افزائی و رہنمائی کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ان سے محبت و شفقت بھی کرتے تھے اور یہ محبت بے لوث تھی۔ انہوں نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی کام لیا اور نہ اپنا فائدہ چاہا۔''[۷]

ان مصروفیات کے علاوہ سلطان پور کی ادبی و سماجی محفلوں میں بھی بڑے انہماک سے شرکت کرتے اور وہاں کی تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے۔ رسالے کی اشاعت کے دوران زیادہ تر وہ دور دراز کا سفر تنہا طے کیا کرتے۔ جب وہاں سے واپسی ہوتی پھر اپنے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں منہمک ہو جاتے۔ اس صورتِ حال میں اگر ان کی بیوی گھر کا کام کاج نہ سنبھالتیں تو ان کی تمام بیٹیوں اور بیٹوں کو ڈاکٹریٹ اور انجینیئر کی ڈگری نہ حاصل ہوتی۔ ان کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر شکیب ارسلان اس موضوع پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''والد صاحب زیادہ تر سفر کرتے رہتے تو ہماری والدہ گھر کی تمام ذمہ داریوں کو سنبھالتیں، تمام بھائی بہنوں کی تعلیم و تربیت اور صحت و بیماری کی ذمہ داری اکیلے ہی نبھاتیں والد صاحب کو تمام کاموں کے لئے پوری طرح آزادی انہوں نے دی۔ انہوں نے خاندان کے تمام لوگوں کی بھی رہنمائی کی اور ضرورت مندوں کی امداد بھی کی''۔ ۸

ڈاکٹر سید عبدالباری کے بیٹوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور گلبرگہ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سب ملازمت میں مصروف ہیں۔ان کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر شکیب ارسلان بی یو ایم ایس کر کے دہلی میں مقیم ہیں اور نوئیڈہ کے کسی اسپتال میں ملازمت کر رہے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنے والد کی وراثت کو برقرار رکھتے ہوئے ادارۂ اسلامی کے خاص رکن اور اس زمانے کے معروف شاعر ''علامہ فاروق بانسپاری'' کی حیات و خدمات پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے، جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ چکا ہے۔دوسرے صاحب زادے سعودی عرب میں ملازمت کے سلسلے میں مقیم ہیں اور سب سے چھوٹے صاحب زادے اس وقت بنگلور میں سکونت اختیار کیے ہوئے ہیں۔عبدالباری نے اپنی تمام بیٹیوں اور بیٹوں کی شادی بڑے دھوم دھام سے سلطان پور، ٹانڈہ اور دہلی سے کی۔ان کے سبھی داماد بھی اعلیٰ ملازمت کر رہے ہیں۔ان کی بیٹی فوزیہ یاسمین کا حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ۳۳ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا جس کا غم انہیں تا عمر رہا۔ان کی تمام بیٹیوں نے اردو زبان و ادب میں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری حاصل کی ہیں۔عبدالباری اپنے تمام بیٹوں اور بیٹیوں سے ایک شفیق باپ کی طرح محبت کرتے اور ان کی تعلیم و تربیت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔اس کے علاوہ وہ خاندان کے سبھی افراد سے بڑی خاکساری و محبت سے پیش آتے۔انہیں اپنے بڑے بھائیوں سے بڑی محبت تھی اور اپنے آبائی وطن ٹانڈہ کی محبت انہیں ہر وقت وہاں کھینچے رہتی جب انہیں ذرا بھی موقع ملتا وہ بیگ اٹھاتے اور ٹانڈہ پہنچ جاتے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر تنویر فاطمہ رقمطراز ہیں:

''اپنے علمی و ادبی سفر کے علاوہ وہ اپنی گھریلو زندگی میں اپنے عزیزوں کے بھی ہر دل عزیز بن کر رہے، ان کے ۳ چھوٹے بھائی اور ایک بہن ہے (جو ایک ماں سے مگر والد الگ ہیں) ان سب سے والد صاحب کے تعلقات نہایت مشفقانہ و پدرانہ تھے۔اپنے بڑے بھائی جن کو وہ بھیا کہتے تھے بڑی محبت رکھتے تھے اور بہت ادب و احترام کرتے

تھے۔ان سے بہت سے امور میں مشورہ اور رہنمائی بھی حاصل کرتے تھے۔ان کو اپنے وطن ٹانڈہ سے بہت لگاؤ تھا۔ہمیشہ وہاں جانے کے لئے تیار رہتے تھے۔جہاں وہ سکون محسوس کرتے تھے اور کیوں نہ کرتے ایک بڑا کشادہ مکان اس میں ان کی کتابوں کے ذخیرے انہیں راحت بخشتے تھے۔میرے بڑے چچا اکثر والد صاحب کے ساتھ صبح کی چائے پیتے تھے،والد صاحب چائے کا بہت اہتمام رکھتے،ہمیشہ ''دم چائے''ہی چائے پیتے اور میرے چچا محترم ان کا بھی بہت خیال رکھتے۔ان میں کبھی آپسی اختلاف نہیں ہوا۔دیگر رشتہ داروں چچیرے بھائی بہنوں سے بھی بہت اچھے تعلقات رہے۔سبھی سے وہ خوش دلی سے ملتے،ان کی خیریت معلوم کرتے،ان کے رنج وغم اور خوشی شریک ہوتے،کسی کی ذراسی تکلیف سن کر وہ بے چین ہو اٹھتے اور اس کی ہر ممکنہ مدد کے لئے تیار رہتے،خواہ مالی امداد ہو یا اور کسی طرح کی مدد''۹

غرض سید عبدالباری نہایت ہی خوش مزاج اور نرم دل شخصیت کے مالک تھے،جو بھی ان سے ایک بار ملتا،ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ایک بار انہوں نے ایک سیاسی نظم تحریر کی اور وہ نظم کسی اخبار میں شائع بھی ہوگئی،اس کے بعد ان کی سی آئی ڈی تفتیش بھی ہوئی۔مگر ان کی شخصیت کا جادو سی آئی ڈی ٹیم پر بھی چل گیا اور وہ لوگ ان سے خوش ہو کر چلے گئے۔یہ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو تھا،وہ ہر کسی کے دل وجان میں بہت جلد رچ بس جاتے۔ان کے اندر لوگوں کا دل جیتنے کی صفت بدرجۂ اتم موجود تھی۔عبدالباری صاحب کا اندازِ بیان نہایت ہی سادہ ہوتا تھا اور بات کرتے وقت مسکرایا کرتے تھے۔جو بھی بات کہتے بالکل صاف اور آسان زبان میں کہتے جس سے ہر کوئی ان کی بات کو بآسانی سمجھ سکے۔ان کی باتیں بالکل آئینہ کی طرح صاف ہوتی تھیں۔انہوں نے کبھی بھی اپنے فائدہ کے لئے کسی کا نقصان نہیں کیا۔بلکہ زندگی بھر دوسروں کو فائدہ پہنچاتے رہے اور خود اپنا نقصان برداشت کر لیتے۔ان کی بیٹی تنویر فاطمہ نے ایک واقعہ اپنے مضمون میں بیان کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے وہ لکھتی ہیں:

''اچھی طرح یاد ہے میں چھوٹی تھی تقریباً پانچویں جماعت کی طالبہ تھی،اس وقت والد صاحب جون پور کے ایک کالج میں پوسٹیڈ تھے،وہاں منیجمنٹ اور پرنسپل کے کچھ آپسی جھگڑے کی بنا پر تمام لکچرر کی تنخواہ روک دی گئی۔والد صاحب نے طلبا کا کیریئر نہ خراب ہو جائے یہ سوچ کر پورے سال بغیر تنخواہ کے تعلیم دی۔اس درمیان گھر کا خرچ چلانا مشکل ہو گیا۔وہ چاہتے تو دوسری جگہ جوائن کر لیتے مگر انہوں نے طلبا کا سال خراب نہیں ہونے دیا۔''۱۰

اس واقعہ کو پڑھ کر بھلا کون ان کی درویش صفت شخصیت سے انکار کر سکتا ہے۔ خاکساری اور منکسر مزاجی ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیتی تھی۔ وہ عموماً کم بولنے کے عادی تھے اور جب کوئی ان سے طویل گفتگو کرتا تو اس کو بیچ میں ٹوک بھی دیتے اور کہتے مختصر میں بات بیان کیجئے۔ اس طرح فون پر بھی صرف کام کی باتیں کرتے، ملاقات ہونے پر اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کرتے۔ چھوٹا ہو یا بڑا ہر کسی سے وہ خندہ پیشانی سے ملتے اور ہر کسی کو عزت وعظمت دینا ان کی عادت میں شمار تھا۔ سماج میں جو کمزور لوگ تھے ان کو بڑھاوا دینا، ان کی حوصلہ افزائی کرنا انہیں خوب آتا تھا۔ وہ ان کے اندر تعلیم کا رجحان پیدا کرتے اور انہیں ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی حتیٰ الامکان کوششیں بھی کرتے۔ جو بھی ان سے ملتا اسے مطالعہ کرنے کا مشورہ ضرور دیتے اور کبھی کبھی کتابیں بھی دے دیا کرتے تھے۔ یہ سب کر کے انہیں بڑا سکون ملتا اور اگر لینے والا اس میں ذرا بھی اپنی دلچسپی کا اظہار کرتا تو وہ اور بھی خوش ہو جایا کرتے تھے۔ انہوں نے ہر انسان سے محبت کی وہ غریب ہو یا امیر ہندو ہو یا مسلمان سب سے یکساں محبت کرتے اور سبھی سے ایک جیسا اخلاقی برتاؤ کیا کرتے۔ ان کی دریا دلی کا یہ عالم تھا گھر میں کام کرنے والی خادمہ سے لے کر کوڑا پھینکنے والا ہو یا پانی ڈالنے والا سب کے ساتھ اچھا سلوک کرتے اور انہیں ان کی محنت سے زیادہ اجرت بھی دیتے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کی شخصیت سے متاثر ہو کر ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''آپ کی شخصیت بڑی مرنجاں مرنج تھی۔ ان کا مزاج قلندارنہ اور طبع درویشانہ تھی۔ اودھ کی تہذیب وشرافت، نرمیت، اور نستعلیقیت ان کی ذات میں نمایاں طور پر نظر آتی تھی۔ وہ ایک ایسے ادیب تھے جو دیکھنے سے ہی ادیب معلوم ہوتے تھے۔ اپنی ذات بلند سے بلند، ان کی امیدیں قلیل اور ان کے مقاصد جلیل تھے۔ ان کی نگاہ ہمیشہ زندگی کے بلند مقاصد اور اعلیٰ نصب العین پر ہوتی اور ان کی فکر وعمل اور زبان وقلم کی ساری توانائیاں انہیں مقاصد کے کے حصول کے لئے وقف تھیں'' ۱۱

غرض سید عبدالباری صاحب ایک متحرک اور برق رفتار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جس برق رفتاری سے چلتے تھے اسی رفتار سے ان کا قلم بھی چلتا تھا۔ میں نے جب بھی انہیں دیکھا متحرک ہی دیکھا۔ جب ملازمت سے سبکدوش ہو کر وہ ٹانڈہ میں قیام پزیر تھے، اس وقت وہ ایک کپڑے کا جھولا لئے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے درمیان سے آتے جاتے دکھ جاتے تھے۔ ان کے اس تھیلے میں کتابوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا

تھا۔ جب بھی دیکھا نظر جھکا کر چلتے ہوئے دیکھا۔ میرے بڑے ابو جوان کے ساتھ مدرسے میں زیرِ تعلیم تھے ،انھوں نے بتایا وہ بچپن میں جیسے چلتے تھے آج بھی ویسے ہی چلتے ہیں اور کافی پھرتیلے اور متحرک تھے۔ ان کی عادات واطوار، جسامت و بناوٹ کا خاکہ ان کے صاحب زادے نے بڑے خوبصورت لفظوں میں بیان کیا ہے:

> ’’میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تو وہ ایک پھرتیلے اور active انسان تھے۔ بال گھنے کالے، چہرے پر ہلکی سی داڑھی۔ ہمیشہ گھر میں کرتا پاجامہ، کالج میں پینٹ اور ادبی و دینی محفلوں میں شیروانی پہنتے تھے۔ چال میں تیزی مگر سر جھکا کر اس طرح چلتے کہ ایسا لگتا نشیب سے اونچائی کی طرف سے جا رہے ہوں۔ گھر میں کم سخن تھے مگر ضروری امور پر مختصر اور جامع بات کہتے البتہ ہماری والدہ تمام امور میں تفصیلی گفتگو کرتیں۔‘‘ ۱۲

تمام عمر اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے والے ڈاکٹر سید عبدالباری کی شخصیت ادب میں ہمہ جہت ادیب کی ہے۔ اپنی ۷۶ سال کی زندگی میں ادب کی گراں بار خدمت کرنے والی یہ شخصیت دریائے گھاگھرا کے کنارے سے ابھر کر ادب میں تحقیق و تنقید، صحافت اور شاعری کی کرنیں بکھیرتی ہوئی دہلی میں دریائے جمنا کے ساحل پر ڈوب گئی۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کو یکم ستمبر ۲۰۱۳ء میں دل کا شدید دورہ پڑا۔ فوراً ان کو جماعت اسلامی ہند کے قائم کئے ہوئے اسپتال ’’الشفا‘‘ میں لے جا رہے تھے کہ راستے میں ان کی روح پرواز کر گئی۔ یہ بھی ایک عجب اتفاق ہے ان کی آخری سانس بھی جماعت اسلامی ہند کے کیمپس میں ہی ٹوٹی جس کے لئے وہ تمام عمر جد وجہد کرتے رہے۔ دوسرے دن صبح ۲ ستمبر کو جماعت اسلامی کے مرکز میں مسجد اشاعتِ اسلام کے زیرِ سایہ مولانا سید جلال الدین عمری نے احباب کی بڑی تعداد کی موجودگی میں نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پھر بٹلہ ہاؤس کی قبرستان میں ان کی آخری رسوم ادا کی گئی۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کے انتقال سے ادارۂ اسلامی ہند کا ایک عہد مکمل ہو گیا۔

☆☆☆

حواشی:

(۱) ڈاکٹر شکیب ارسلان، میرے ابو، پیش رفت، نئی دہلی، ص۔۵۵

(۲) ڈاکٹر سید عبدالباری، ظفر ہاشمی ماضی کے دریچوں سے، آداب شناخت، ص۔۲۴۰

(۳) ڈاکٹر سید عبدالباری، ظفر ہاشمی ماضی کے دریچوں سے، آداب شناخت، ص۔۲۴۱

(۴) ڈاکٹر سید عبدالباری، ظفر ہاشمی ماضی کے دریچوں سے، آداب شناخت، ص۔۲۴۳

(۵) ڈاکٹر سید عبدالباری، میرا مطالعہ، مرتبہ، تابس مہدی، ص۔۱۵۰

(۶) ڈاکٹر سید عبدالباری، مقدمہ، م نسیم کے ادب پارے، ما دارہ اسلامی ادب، ص۔۶

(۷) ڈاکٹر تنویر فاطمہ، عبدالباری خصوصی نمبر، پیش رفت، نئی دہلی، ص۔۶۹

(۸) ڈاکٹر شکیب ارسلان، پیش رفت، نئی دہلی، ص۔۵۶

(۹) ڈاکٹر تنویر فاطمہ، والد محترم کی شخصیت کے چند پہلو، سید عبدالباری نمبر، پیش رفت دہلی، ص۔۶۸

(۱۰) ڈاکٹر تنویر فاطمہ، والد محترم کی شخصیت کے چند پہلو، پیش رفت، نئی دہلی، ص۔۷۰

(۱۱) ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، شبنم سبحانی: شخصیت اور جہتیں، پیش رفت، نئی دہلی، ص۔۴۶

(۱۲) ڈاکٹر شکیب ارسلان، میرے ابو، پیش رفت، نئی دہلی، ص۔۵۵

باب دوم

ڈاکٹر سید عبدالباری کی شعری خدمات کا تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر سید عبدالباری کی شناخت ادب میں ایک محقق، ناقد اور دیدہ ور صحافی کی حیثیت سے ہوتی ہے۔مگر یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا، وقت اور حالات کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے بہت جلد اپنا رخ بدل لیا اور اردو نثر کی طرف متوجہ ہوگئے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کو شعروشاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا اور جس ماحول میں انہوں نے پرورش پائی وہاں شعروشاعری کا مجمع لگا رہتا تھا۔ٹانڈہ جوان کا آبائی وطن ہے، شعروادب کے حوالے سے یہ زمین کافی زرخیز ہے۔یہاں پر بلند پایہ شعرا پیدا ہوئے، مگر کسی کا مجموعہ کلام منظرِ عام پر نہ آنے کی وجہ سے وہ سبھی شعرا ادبی دنیا میں گمنام ہوگئے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کا بچپن انہیں لوگوں کے درمیان گزرا، جو اس وقت شہر ٹانڈہ میں شعروشاعری کی شمع روشن کئے ہوئے تھے۔اس میں حاجی زماں ٹانڈوی، منظر اعظمی، قاضی خلیل الرحمٰن، اقبال حسین خاں، ڈاکٹر ذوقی اور مختار احمد جواہری کے نام کافی اہم ہیں، جن کی صحبت نے ان کی شاعری کو جلا بخشی۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے مشفق چچا سید سبحان اللہ جو جماعت اسلامی ہند میں ایک خاص رکن کی حیثیت رکھتے تھے اور ٹانڈہ چوک میں ان کی کتابوں کی دکان تھی وہیں پر جماعت کی میٹنگیں اور نشستیں ہوا کرتیں تھیں، عبدالباری بڑی پابندی سے اس میں شرکت کیا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ کم عمری میں ہی وہ جماعت اسلامی ہند سے متاثر ہوگئے اور اس کی رکنیت اختیار کر لی۔اس وقت وہاں جماعت کی شعری نشست ہر ماہ بڑی پابندی سے منعقد ہوا کرتی تھی جس میں حاجی زماں ،مختار احمد مظاہری، ڈاکٹر ذوقی کے علاوہ بہت سے شعرا اپنا کلام سناتے اور اس پر بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔عبدالباری صاحب بھی ان نشستوں میں اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔یہیں سے ان کی شاعری کا آغاز ہوا جو بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکی اور وہ شاعری کے ایوان سے کوچ کر کے نثر کی طرف متوجہ ہوگئے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے نثر کی دنیا میں اسی نام سے شہرت حاصل کی، مگر شاعری میں انہوں نے اپنا تخلص شبنم سبحانی اختیار کیا، گویا وہ ادبی دنیا میں دو ناموں سے جانے جاتے ہیں، ایک شخصیت نثر والی جس میں انہوں نے باکمال کارنامے انجام دیئے۔دوسری شاعری والی، مگر اس حوالے سے انہیں وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی جو تنقید اور تحقیق سے میسر ہوئی۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنی شاعری کا آغاز ۱۹۵۳ء میں کیا، اس وقت وہ ہائی اسکول کے طالبِ علم تھے۔انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز نظم سے کیا جس کا عنوان ''امن کے دیوتا'' ہے، یہ ان کی پہلی نظم تھی جو اس وقت ماہنامہ ''معیار'' میرٹھ سے نکلتا تھا اس میں شائع ہوئی، جس سے ان کا حوصلہ کافی بلند ہوا، اس کے بعد انہوں نے شاعری میں بے شمار نظمیں اور غزلیں کہیں جو مجموعے کی شکل میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ان کی نظموں کا مجموعہ ''فکر انگیز'' ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا اور غزلوں کا مجموعہ ''طرب خیز'' ۲۰۱۰ء میں

زیورِطبع سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آیا۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے شاعری کی طرف بہت کم توجہ دی ہے، مگر عمر کے آخری مرحلے میں انہوں نے اپنے دوستوں کی فرمائش پر اس پر کچھ خاص توجہ صرف کی، جس کے نتیجے کے طور پر یہ دو مجوعہ کلام جو منظرِ عام پر آئے۔ان مجموعوں میں شامل غزلیں اور نظمیں ان کے ابتدائی کلام ہیں، جو متعدد اخباروں اور رسالوں میں بکھرے پڑے تھے، اس کو انہوں نے یکجا کر کے مجموعے کی شکل میں شائع کیا۔ان کی شعری تخلیقات کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے، انہوں نے غزلوں میں اپنا ایک مخصوص طرزِسخن اختیار کیا اور اندازِ بیان اور لب و لہجے میں ایسی دلکشی و جاذبیت پیدا کی ہے جو ان کو اس عہد کے شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ان کی شاعری میں ایک ایسی کشش نظر آتی ہے جو اہل ادب اور ناقدین کو اپنی طرف بہت آسانی سے متوجہ کر لینے کی اہلیت رکھتی ہے۔ان کے غزلوں کے کچھ اشعار ایسے ہیں جو واقعی بہترین اشعار میں شمار کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ان کی غزلوں سے متعلق ان کے دوست انتظار نعیم نے ان کی کتاب کے سرورق پر لکھا ہے:

> ''انہوں نے اردو غزل میں ایک مخصوص رنگِ سخن اختیار کیا۔زبان و بیان کی ندرت، دلکش آہنگ اور جدید لب و لہجے کے ساتھ خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے ایک اثر انگیز اور طرب خیز پیغام ہر دور میں اپنے اشعار کے ذریعے دورِ جدید کو دینے کی کوشش کی ہے۔چنانچہ یہ مجوعہ اپنی انفرادیت، اپنی ندرت اور اپنی اثر انگیزی کے سبب دلوں میں گھر کرنے والے اشعار کا حامل ہے''[1]

غزلوں میں انہوں نے جو لب ولہجہ اختیار کیا ہے وہ جدیدیت سے قریب تر ہے پھر بھی ان غزلوں میں وہ رنگ نہیں آ پایا جو اس عہد کے شعرا میں نمایاں ہے۔تعمیری ادب کو فروغ دینے میں حفیظ میرٹھی، ابوالمجاہد زاہد اور فاروق بانسپاری کے علاوہ سہیل احمد زیدی، انور اعظمی ،شفیق جونپوری، عرشی بھوپالی ،عروج قادری، عزیز بگھروی، قیصر الجعفری مونس شفیع اور منظر اعظمی نے جو شاعری پیش کی اس کا اپنا الگ رنگ و مزاج ہے اور ان شعرا کی تخلیقات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبدالباری کی شاعری میں ان شعرا جیسا رنگ و آہنگ نہیں دیکھنے کو ملتا، جو ان کے ہم عصر شعرا کے یہاں پایا جاتا ہے۔البتہ ڈاکٹر سید عبدالباری کی نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شعری فکر غزلوں سے زیادہ اہم ہے۔نظموں میں ان کا فنی رچاؤ اور نظم کی تکنیک انہیں ممتاز شعرا کی صف میں کھڑا کر سکتی ہے۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ اگر عبدالباری تنقید کی دنیا میں قدم نہ رکھتے اور صرف نظم نگاری کی طرف توجہ مرکوز کرتے تو اصلاحی شاعری کی ایک عمدہ نظیر قائم کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری ابتدا میں اپنے کلام پر انور صدیقی سے اصلاح لیتے رہے، جو اقبال سے لے کر فیض تک کی غزلوں میں تازہ ترین اسالیب اور رجحانات سے متاثر تھے۔ ان کی صحبت سے انہوں نے شاعری میں کافی مہارت حاصل کی اور ان کی فکر کی جھلک ان کی شاعری میں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کے متعدد اشعار ایسے ہیں جن کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فیض اور اقبال سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔

چلے چلو کہ یہ ہے اہلِ عشق کی میراث
ملے گی منزل دار و رسن کبھی نہ کبھی

اپنے قدموں سے کہیں روند نہ دیں اہلِ جنوں
ان سے کترا کے ذرا گردشِ ایام چلے

یہ تقاضائے خرد تھا کہ تقاضائے جنوں
پشت پر لے کے جو شبنم غم ایام چلے

یہ عجب ماجرا ہے کہ خرد کے دور میں بھی
مرے عشق کا ہے چرچا مرے غم کی منادی

کوئی محفل طرب ہو کوئی مجلسِ الم ہو
ہمیں جب کسی نے چھیڑا تو حدیثِ غم سنا دی

ان اشعار میں فیضؔ اور اقبالؔ کا رنگ و آہنگ بہت واضح تو نہیں مگر ہلکا سا ضرور دکھائی دیتا ہے۔ شبنم سبحانی کی شاعری اس وقت زیادہ پروان چڑھی، جب وہ لکھنؤ کی شعری محفلوں میں شرکت کرنے لگے اور متعدد اساتذہ سے انہیں شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ وہ اثر لکھنوی کی خدمت میں بڑی پابندی سے حاضر ہوتے رہے اور ان سے خوب استفادہ کیا، مگر قیامِ لکھنؤ کے دوران انہوں نے علامہ شفیقؔ جونپوری سے کافی قربت حاصل کی اور ذہنی مناسبت کی وجہ سے انہوں نے شاعری میں انہیں کے اثرات کو زیادہ قبول کیا ہے۔ لکھنؤ کے بعد جب رام پور

میں قیام پذیر ہوئے، اس وقت وہ شاد عارفی کی خدمت میں اپنا کلام پیش کر کے ان سے اصلاح لیتے رہے۔ دونوں میں فکری و عملی مماثلت اتنی گہری نظر آتی ہے کہ شاد عارفی تعمیری ادب کے نقیب کی حیثیت سے ادب کو فروغ دے رہے تھے، اسی عہد میں عبدالباری صاحب بھی تعمیری ادب کے فروغ کے لئے رام پور سے ''دانش'' نکال کر یہ خدمت انجام دینے میں لگے ہوئے تھے۔ رام پور میں انہوں نے شاعری کی طرف بالخصوص توجہ کی اور اپنے دوست ابوالمجاہد زاہد سے بھی فنی امور پر مشورہ کرتے رہے۔ ان سب شخصیات سے قربت کی وجہ سے ان کی شاعری کو وہ رنگ وہ آہنگ عطا ہوا جس کی بنا پر انہوں نے شاعری کے ذریعے ادب میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری لکھنؤ اور رام پور کی ادبی محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مظاہری صاحب کی تحریک پر میں نے شبنم سبحانی کا قلمی نام اختیار کیا اور شاعری شروع کر دی۔ پھر اس ولولہ کو لکھنؤ میں مزید فروغ حاصل ہوا جہاں میں گریجویشن کے لئے دو سال مقیم رہا اور م نسیم، ابوالمجاہد زاہد، رشید کوثر فاروقی، احمد حسین انصاری، اکبر زمزم، حکیم شمسی جیسے احباب واصحاب نظر کا قرب حاصل ہوا۔ ماہنامہ ''نئی نسلیں'' لکھنؤ سے شائع ہوا اس کی ادارت میں اس وقت بے بضاعت طالب علم کو بھی شامل کر لیا گیا۔ ادارۂ اسلامی لکھنؤ کی باضابطہ نشستیں ہر ماہ منعقد ہونے لگیں۔ اس عہد میں لکھنؤ ترقی پسند ادب کی تحریک بھی پر جوش اہلِ قلم کا محور تھی۔ میرے استاد پروفیسر احتشام حسین کے دولت خانہ پر اس کی نشستیں منعقد ہوتیں جہاں ترقی پسند نظریہ ادب سے اختلاف کے باوجود ہم لوگ شرکت کرتے تھے۔ اس زمانہ میں مجاز لکھنوی لکھنؤ کے مشہور کافی ہاؤس میں بیٹھتے تھے اور میں مرحوم م نسیم کے ساتھ اکثر مجلس میں شریک ہوتا اور ان کے پر مذاق تبصروں سے محظوظ ہوتا۔ اسی زمانے میں مرحوم رشید کوثر فاروقی کے ساتھ حضرت اثر لکھنوئی کے دولت خانے پر حاضری کا بھی موقع ملا۔ حضرت شفیق جونپوری، درویش صدیقی بھی لکھنؤ تشریف لاتے اور ان کی پرکشش شخصیت ہمارے لئے خاصی دلکش تھی۔ ان حضرات سے اپنے تخلیقی سفر کو خوش اسلوبی سے طئے کرنے کا ولولہ حاصل ہوتا۔ پھر (۵۷ء تا ۶۰ء) ۳ سال رامپور میں قیام رہا اور یہ عہد میری فنی و فکری پختگی کی منزلوں تک رسائی کا عہد تھا۔ میرے مخلص دوست مرحوم ابنِ فرید کا مجھے خاصا قرب حاصل رہا۔ میرے اساتذہ مولانا عروج احمد قادری، جلیل احسن ندوی، صدرالدین اصلاحی میرے لئے بصیرت و بصارت کا مخزن تھے۔ مائل خیرآبادی اور مولانا عبدالحئی، افضل حسین و مولانا حامد علی سے خاصی راہنمائی حاصل ہوئی۔ ماہنامہ ''دانش'' کی اشاعت کی ذمہ داری اور ادارۂ اسلامی کی سکریٹری شپ

کی وجہ سے میرا ملک کے اہلِ قلم کے بڑے معتبر حلقہ سے ربط ضبط قائم ہوا۔اس زمانے میں رامپور میں اس عہد کے بے حد ذہین خوددار اور ذی شعور شاعر شاد عارفی موجود تھے۔میں حضرت ابوالمجاہد زاہد صاحب کے ہمراہ کئی باران کی خدمت میں حاضر ہوااور اپنی چند غزلیں انہیں اصلاح کی غرض سے پیش کیں ۔مرحوم نے میری حوصلہ افزائی کی۔ماہنامہ دانش میں ان کی کئی غزلیں میں نے حاصل کر کے شائع کیں۔ادارۂ ادب اسلامی کے اہلِ قلم سے انہیں بے حد ہمدردی تھی۔ برادرم حفیظ میرٹھی اور نجم الاسلام میرٹھ سے معیار شائع کر رہے تھے۔اس رسالے کے ذریعے بھی ذوق تخلیق کی نشو نما ہوئی۔پھر (۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۳ء) گورکھپور یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران مجھے حضرت فاروق بانسپاری سے بھی فیضیاب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ہے جو علامہ اقبال کے عاشق اور تعمیر پسند حلقہ کے ممتاز شاعر تھے۔پھر اپنی ملازمت کے عہد میں قیامِ فیض آباد کے دوران ٹانڈہ سے ماہنامہ ’’دوام‘‘ کو مرتب کرنے اور چار سال کے دوران ملک کے اہم اشخاص سے ملنے اور ملانے اور اہلِ قلم کے ایک وسیع حلقے سے ربط رکھنے کا موقع ملا اور پھر ’’دوامِ نو‘‘ اور ’’پیش رفت‘‘ دہلی کا عہد آیا۔‘‘ ۲

اس طویل عرصے میں انہوں نے مختلف شہروں میں رہ کر مختلف شخصیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی شاعری کو پروان چڑھایا اور مختلف موضوعات پر اشعار اور نظمیں قلم بند کی ہیں۔ابتدا میں وہ شاعری کی طرف زیادہ توجہ دیتے تھے اوران کا زیادہ تر وقت اس کی نوک پلک سنوارنے میں صرف ہوتا تھا،مگر ۱۹۶۰ء کے بعد اردو نثر نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔پھر بھی انہوں نے شاعری میں جو کچھ بھی لکھا وہ ہمارے ادبی سرمایے میں ایک قابلِ قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔اس باب میں ہم ڈاکٹر سید عبدالباری کی غزلوں اور نظموں کا جائزہ لیں گے اور شاعری میں ان کے مقام ومرتبہ کا تعین کریں گے۔سب سے پہلے ان کی غزلوں پر گفتگو کرتے ہیں۔

☆☆☆

باب دوم (الف)

سید عبد الباری کی غزلوں کا تنقیدی جائزہ

دنیا کی اعلیٰ شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ادب کو خانوں میں تقسیم کرنے کا سلسلہ کافی قدیم ہے۔کبھی اسے زندگی سے وابستہ کیا گیا اور کبھی عملی زندگی سے یکسر ے خارج کر دیا گیا اور شاعری کو صرف تفریح اور وقت گزاری کا ذریعہ سمجھا جانے لگا۔مگر اسے غیر فطری اور تصورات کا ترجمان بنانے کی انتھک کوششوں کے باوجود ادب میں اسی فن پارے کو مقبولیت اور دوام حاصل ہوتا ہے، جس کا تعلق مذہب ،اخلاق ،تہذیب اور تعمیر سے ہوتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کی شاعری کا تعلق بھی مذہب اور اسلامی ادب سے ہے۔جس طرح ترقی پسند تحریک میں مجروح، علی سردار جعفری، فیض، کیفی وغیرہ اپنے نظریات کی تبلیغ واشاعت شاعری کے ذریعے کررہے تھے،اسی طرح عبدالباری شبنم سبحانی نے بھی تعمیری ادب کے نظریات کی اشاعت و تبلیغ اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعے کی۔ابتدا میں عبدالباری بھی ترقی پسند تحریک سے مرعوب ہوئے اور کچھ اشعار اور نظمیں بھی اسی تحریک کے زیرِ اثر تخلیق کیں۔دراصل اس وقت ہندوستان کی آزادی کا ولولہ لوگوں پر سوار تھا اور وطن پرستی کا جذبہ سب کے اندر موجیں ماررہا تھا اور اس تحریک نے ملک کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا، جس کے اثرات آزادی کے بعد بھی لوگوں کے ذہن ودل پر مسلط تھے۔اس وقت تمام شعرا اسی رنگ و آہنگ میں شاعری کررہے تھے۔ڈاکٹر عبدالباری نے بھی ان کے اثرات قبول کئے اور اسی روش کو اپناتے ہوئے اپنی شاعری کی ابتدا کی۔حالانکہ اس تحریک سے ان کا کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا،مگر ذہنی اور فکری مطابقت یہ تھی اس نے عام آدمی کی ترقی وخوشحالی اور تعصب کے خلاف آواز بلند کی جو اس وقت ہر انسان کا درد تھا۔ڈاکٹر سید عبدالباری کا بھی یہی درد تھا اس لئے انھوں نے ترقی پسند شعرا کی آواز میں آواز ملائی۔

ترقی پسند تحریک کا زور آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔۱۹۶۰ء کے بعد کمیونسٹ پارٹی دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی اور اس تحریک کا زوال ہونا شروع ہوگیا اور جدیدیت کا رجحان لوگوں پر حاوی ہوتا چلا گیا اور ادب میں مقصدیت کو نظر انداز کیا جانے لگا۔چونکہ ڈاکٹر سید عبدالباری شاعری کے لئے خاص مقصد اور کسی نظریات کی تبلیغ و اشاعت کو ضروری خیال کرتے ہیں اس لئے جب ان دونوں نظریات میں انہیں ادب کی افادیت کم ہوتی نظر آئی تو وہ بعد میں اس سے منحرف ہوگئے اور اس کے بعد صرف تعمیری ادب کے نظریات کی تبلغ واشاعت اپنی شاعری میں تاعمر کرتے رہے۔انھوں نے اپنے اشعار میں اس طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

نہ چارہ سازئ بیمار غم نہ فکر علاج
عجیب عہدِ رواں کا یہ اشتراکی ہے

اس عہد میں اقدار کا سودا نہیں دشوار
گر بیچنے والے ہوں تو بازار بہت ہے

چنانچہ ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی نے اپنے ایمان کا سودا نہیں کیا اور ادب میں تعمیری نظریات کے زیرِ اثر اپنے قلم کا جادو غزلوں اور نظموں کے ذریعے لوگوں پر چلاتے رہے۔ ڈاکٹر عبدالباری کی غزلوں کا مذہب ،تہذیب وتمدن اور اوراعلیٰ اقدار سے گہرا تعلق ہے، جس کی جھلک ان کی غزلوں اور نظموں میں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے کلام میں ہوس پرستی اور نفس پرستی کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں حالی، اکبر، شبلی اور اقبال کی روایت کو برقرار رکھا ہے، جنہوں نے اپنی جرأت اور دیانتداری سے اردو ادب کو مذہبی بنیادوں سے روشناس کرانے کا عظیم کارنامہ انجام دیا تھا۔ عبدالباری شبنم سبحانی نے بھی انہیں مقاصد کو اپنی شاعری کا نصب العین بنایا ہے اور تحریکِ اسلامی ادب کے زیرِ سایہ اپنے اسی نظریات کو فروغ دیتے رہے، مگر انہوں نے اپنی شاعری میں فن کے تقاضوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ جو بھی مضمون پیش کرتے ہیں خوش اسلوبی، ہنرمندی اور ادبی لطافت کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ کلام کی موسیقیت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور شعر کی معنویت میں کوئی کمی بھی نہیں آنے دیتے۔ انہوں نے ادب کو ترقی پسندوں کی طرح محض پروپیگنڈہ یا نعرہ بازی کا وسیلہ نہیں بنایا۔ بلکہ اخلاق واقدار کی رعایت کے ساتھ فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے کلام کو معنی خیز بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انہوں نے شاعری کو تفننِ طبع کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اپنی غزلوں میں تہذیبی واخلاقی اور مذہبی اقدار کو بچائے رکھا اور فطری نظامِ حیات کے خلاف غیر فطری اور خدا بیزار شوریدہ سری اور یلغار کے پرآشوب موسم میں بھی ادبی محاذ کا پرچم بلند کرتے ہوئے ان طوفانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے قلم کے وقار کو تاعمر قائم رکھا۔ انہوں نے مادہ پرستی اور وجودیت کے فلسفے کی کھل کر مخالفت کی اور مارکس ولینن کی سیاسیات واقتصادیات اور فرائڈ کی نفسیات وجنسیات سے اپنے ذہن ودل اور شاعری کو پاک رکھا۔ ان کے کلام میں کہیں ان نظریات کا سایا بھی دیکھنے کو نہیں ملتا۔

غرض سید عبدالباری شبنم سبحانی نے ایک صالح مقصد اور توانا نظریہ کے ذریعے اپنی غزلوں کو مزین کیا ہے۔ یہ ان کی نظر میں ایک ہمہ گیر نظریہ ہے جو آفاقی نظامِ حیات کی ترجمانی کرتا ہے اور تمام ذمہ دارانہ مزاج ،پابندیٔ اقدار اور آخرت کی جوابدہی کے تصور سے مالا مال ہے، جو فرد کی اصلاح وتربیت کے ساتھ صالح معاشرہ کی تشکیل کے فرض منصبی سے سرفراز ہے۔ انہیں سب اصول ونظریات سے شبنم سبحانی کے تمام اشعار

عبارت ہیں۔

ہم بہر حال نہ باز آئے چلے اپنی ہی چال
گو تقاضا ترا کچھ عہدِ رواں اور ہی کچھ تھا

بے نیازانہ کیا دل کے اجالے میں سفر
روشنی وقت کی کچھ ہم سے خفا اور ہی تھی

تختِ طاؤس پہ بیٹھے ہو لئے غم اپنا
کاش کچھ تم کو بھی فکر غمِ انساں ہوتا

منزلِ شوق پہ ہیں حوصلہ مندوں کے قدم
راہ میں خاک بسر گردشِ دوراں ہے ابھی

ہم کو فرصت ہی نہ تھی بات نئی کہنے کی
کٹ گئی عمر بزرگوں سے روایت کرتے

انہیں تھا زعم قیادت نہ تھی منزل کی خبر
خود جو گمراہ تھے وہ کیسے ہدایت کرتے

ان اشعار سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے، انہوں نے جدیدیت اور ترقی پسندیت کو کس طرح فنی رچاؤ کے ذریعے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اس ضمن میں اور بہت سے اشعار ہیں، جن سے ان کی مغربی تہذیب اور اس فکر کی مخالفت کی ترجمانی ہوتی ہے۔ شبنم سبحانی نے صرف مقصدی اور اخلاقی شاعری کی۔ ایک فن کار کا مقصدی شاعری کے ساتھ کیا رویہ ہوتا ہے اس کا جیتا جاگتا نمونہ ہمیں عبدالباری کی شاعری میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے جس خوش اسلوبی کے ساتھ اسلامی تہذیب کے خدوخال اور اس کے نظریات کی ترجمانی اپنی شاعری میں کی ہے، اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے ان کی شاعری میں ایسے اشعار

بہت کم دیکھنے کو ملیں گے، جو رومانی جذبات کو ہوا دیتے ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے رومانی اشعار نہ کہے ہوں، مگر ان کی تعداد نہ کے برابر ہے۔ چند اشعار ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے رومانیت ان کے اندر بھی موجزن ہے، مگر وہ اپنے نظریات سے مجبور نظر آتے ہیں، جس کی وجہ سے انہوں نے اس مجموعے میں رومانی اشعار تقریباً مفقود کر دیئے ہوں۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کوئی شاعر اور وہ بھی رومانی اشعار سے اپنا دامن بچا سکا ہو۔ عبدالباری نے یقیناً رومانی غزلیں کہیں ہوں گی لیکن ان کا رشتہ ایک ایسی تحریک سے استوار ہو چکا تھا جوان کو اپنی اس داخلی کیفیات کی اشاعت کی اجازت قطعی نہیں دے سکتا ہے۔ ان کے چند رومانی اشعار سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں وہ اپنا دامن رومانیت سے چھڑانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

توجہ کس کی شامل ہو گئی ہے
محبت میری کامل ہو گئی ہے

تصور ان کا اب شام و سحر ہے
یہ دولت کیسی حاصل ہو گئی ہے

گداز عشق اگر کامل نہیں ہے
ادائے حسن کامل ہو گئی ہے

اٹھنے والے تو نہیں میکدۂ عشق سے ہم
جام خالی ہے تو اب دردِ تہہ جام چلے

ہم کیسے کہیں کیا ہے تری یاد کی لذت
یوں ہی کوئی سینے میں چبھن ہو نہیں سکتی

اس زلف کو چھو کر ہی صبا آئی ہے ورنہ
صد رشکِ غزالاں ختن ہو نہیں سکتی

نہ پوچھ لفظِ محبت کی وسعتیں مت پوچھ
ہوئے ہیں جس سے مرتب ہزار افسانے

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے شبنم سبحانی بھی لذتِ عشق سے آشنا تھے، ورنہ انہیں اس کی وسعتوں کا اندازہ ہو ہی نہیں سکتا تھا اور وہ ہزار افسانے کی بات اپنی شاعری میں نہ کرتے۔ ان کی غزلوں میں ایسے اشعار ان کی اس کیفیت کی شاندار عکاسی کرتے ہیں۔ مگر وہ رومانیت سے دامن بچانے کی کوشش کرتے ہوئے، غزل میں تعمیری و مذہبی موضوعات کی ترجمانی کرتے رہے، جس سے زندگی کو بہتر سے بہتر بنایا جا سکے۔ یہی وجہ ہے ان کی شاعری انسانوں کو اپنے مقصد کے حصول اور وجود کی طرف متوجہ کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ عبدالباری صاحب کا فن واحساس تحریک اسلامی ادب کی بھٹی میں تپ کر کندن بن گیا ہے، جس سے ان کی شاعری قول و عمل یکسانیت، اعلیٰ اخلاق وکردار اور سنجیدگی و متانت کا عملی پیکر دکھائی دیتی ہے۔ اس تحریک کے زیرِ اثر عشقِ حقیقی ان کی شاعری کی اصل اساس اور رضائے خدا شاعری کا اصل مقصد ہے۔ یہی ذوق وشوق ان کی غزلوں کے خاص عنصر ہیں۔

فکرِ مودودی سے رقصاں ہے رگ وپے میں شرار
ٹوٹتا ہے تو ادھر ساغرِ خیام چلے

ہم بہر حال نہ باز آئے چلے اپنی ہی چال
گو تقاضا تیرا کچھ عہدِ رواں اور ہی تھا

کیا فکر جو ماحول غم انگیز بہت ہے
محفل کی فضا تیری طرب خیز بہت ہے

سرکش ہوا لاکھ، فضا لاکھ ہے نا ساز
لو مشعلِ ایماں کی مگر تیز بہت ہے

ڈاکٹر عبدالباری صاحب جس عہد میں شاعری کر رہے تھے، اس کے تقاضے کچھ اور تھے، اس وقت ملک

اور زندگی میں جدیدیت کے زیرِ اثر بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں رونماں ہو رہی تھیں، چاروں طرف فسادات برپا تھے اور فرقہ واریت اپنا سر اٹھا رہی تھی، غرض فسادات اور تضادات کا عالم تھا جس سے ہر کس و ناکس دوچار ہو رہا تھا۔ نئی تعلیم کے زیرِ اثر لوگوں کے اندر تبدیلیاں بڑی تیزی کے ساتھ رونما ہو رہی تھیں دیہات کے لوگ بھی شہری زندگی سے آشنا ہونے لگے اور عوام بڑی تیزی کے ساتھ مشینی زندگی سے وابستہ ہوتے گئے، زمانہ برق رفتاری سے کروٹ بدل رہا تھا، اس بدلتے ہوئے حالات کے اثرات ادب پر بھی نمایاں ہوئے اور اس تغیرات کے زیرِ اثر جدیدیت کی جو تحریک ادب میں رونما ہوئی، اس نے ادب کو ایک نئی سمت عطا کی۔ مگر اس تحریک نے عوام کا رشتہ ادب سے منقطع کر دیا اور تخلیقات کے موضوعات میں اس قدر الجھاؤ پیدا کر دیا، جس سے قاری خود بخود شعر و ادب سے دور ہوتا گیا، اس نے مذہب سے لاتعلقی قائم کی اور وجودیت، مادیت اور عقل پرستی کو فروغ دیا۔ اس عہد کے سبھی شعرا نے جدیدیت کے اثرات قبول کیے اور موجودہ عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جدیدیت کے فلسفے کو ضروری سمجھا۔ مگر سید عبدالباری نے اس کی مخالفت کی اور ایمان کی اسی مشعلِ تیز لو کے ساتھ شاعری کرتے ہوئے، لوگوں تک مثبت پیغام پہنچاتے رہے یہی وجہ ہے ان کی شاعری میں ایمان کی حرارت بڑی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔ وہ اسی ایمان و ایقان کے ساتھ بڑی ثابت قدمی سے منزل کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ وہ چاہتے تو کسی بھی تحریک سے منسلک ہو کر شہرت حاصل کر سکتے تھے، مگر انہوں نے اپنے ایمان کا سودا نہیں کیا اور اپنے قلم کو ان کے سایے سے محفوظ رکھا۔ ان کے اشعار ان کی اسی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں ۔

پختہ تر اور ہوا اور ذوقِ سفر
میں نے جب ترک کیا راہ کے خاروں کا شمار

بے نیازانہ کیا دن کے اجالے میں سفر
روشنی وقت کی کچھ ہم سے خفا اور ہی تھی

اس عشق کی وادی میں قدم رکھ تو دیا ہے
اے دوست مگر عشق میں آزار بہت ہیں

اس عشق کی وادی میں جب انہوں نے قدم رکھا، اس وقت تعمیری ادب کے نظریات کو سخت تنقید کا نشانہ

بنایا گیا اور اس پر جدیدیت اور اشتراکیت کے علم برداروں نے یہ قدغن لگائی کہ ادب کو مذہب کی عینک سے نہیں دیکھنا چاہئے ۔ بلکہ اسے انفرادی اور افادی نقطۂ نظر سے پیش کرنا چاہئے ۔ڈاکٹر سید عبدالباری اس سخت تنقید کی پروانہ کرتے ہوئے اپنے نظریات کی تبلیغ شاعری میں کرتے رہے اور ادب میں با مقصد مضامین پیش کرتے ہوئے ،اس کے منفی پہلوؤں سے گریز کیا ہے ۔عبدالباری شبنم سبحانی اس وقت کے تمام نظریات کو رد کرتے ہوئے وادی عشق کے آزار اور خارزاروں سے بامراد اور کامران گزرتے ہیں اور انہیں اس راہ میں خود تقویت محسوس ہونے لگتی ہے اور خدا کی خوشنودی حاصل ہونے کا یقین بڑھ جاتا ہے تو وہ اپنے جذبات کا اظہار ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں ۔

یہ زمیں ہوگئی میرے لئے بے کیف و سرور
اک فضا اور مرا ذوقِ سفر مانگے ہے

ایک مقصدی اور پیامی شاعر ہونے کے باوجود شبنم سبحانی نے شاعری میں غزل کے روایتی اور کلاسیکی تسلسل کو برقرار رکھا،ان کے کلام میں تغزل اور پاکیزگی کا احساس بہ درجۂ اتم ہوتا ہے۔روایت اور جدت کے ساتھ انہوں نے اپنے مخصوص اندازِ بیان میں غزل کی رومانی فضا اور کیفیت کو برقرار رکھا ہے۔چند اشعار کے مطالعے سے خود اس بات کا احساس ہو جائے گا ۔

کل جو اس بزم میں پہنچے تو سماں اور ہی تھا
جوشِ بادہ نہ سہی اشک رواں اور ہی تھا

نہ وہ خوشبو نہ لہک اور نہ وہ اندامِ خرام
تیرے کوچے سے جو نکلی تو صبا اور ہی تھی

برق ہی برق رگ و پے میں جو رقصاں ہوئی
ہم عناں آپ کے پھر گردشِ دوراں ہوئی

خیر سے راہگزر عشق کی آساں ہے ابھی
شمع جو ہم نے جلائی ہے فروزاں ہے ابھی

غم کا اظہار تو بے آہ و بکا ہوتا ہے
نغمۂ درد تو بے حرف و صدا ہوتا ہے

شبنم سبحانی کی شاعری میں موسیقیت اور غنائیت کے ساتھ ساتھ ایمائیت اور تہداری کا بھی احساس ہوتا ہے، وہ بڑے سے بڑے واقعات وموضوعات کوشعر کے قالب میں تمام فنی رچاؤ کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔یہی وجہ ہے ان کے کلام میں شگفتگی اور نرمی کا احساس جابجا ہوتا ہے۔ان کی شاعری میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں، جن سے ان کی غزلوں میں جمالیات کا پہلو کہیں بھی مفقود یا کم ہوتا ہوا نہیں نظر آتا ہے، بیش تر اشعار میں جمالیاتی پہلو کو بآسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔زبان و بیان بھی کافی دلکش ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں جن لفظیات کا استعمال کیا ہے، وہ بڑی مہذب معلوم ہوتی ہیں کہیں بھی کوئی لفظ ایسا نہیں ہے، جو پڑھنے میں بھونڈا لگتا ہو یا اس سے شعر کے حسن میں کمی آتی ہو۔لیکن غزل کا جو حسین اور دلکش انداز بیان شبنم سبحانی کے ہم عصر و ہم فکر شاعر حفیظ میرٹھی کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے، اس کی کمی تو ان کے یہاں محسوس ہوتی ہے۔مگر دراصل عبدالباری شبنم سبحانی کو عوام تک ایک مثبت پیغام پہنچانا ہے، اس لئے ظاہر ہے زبان میں بھی سلاست اور روانی پیدا کرنی پڑے گی اور شعر کو عام فہم بنا کر پیش کرنا پڑے گا۔اس معاملے میں انہوں نے حفیظ میرٹھی کا تتبع کرتے ہوئے فرمایا ہے ؎

اب کھل کے کہو بات تو کچھ بات بنے گی
یہ دور اشارات و کنایات نہیں ہے

جب ہم ان کے کلام کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی بات بہت گھما پھرا کر نہیں پیش کی ہے بلکہ سیدھے سادے انداز کو اختیار کیا ہے۔بعض اشعار ایسے ہیں جن میں انہوں نے دوٹوک باتیں کہی ہیں مگر شعر کی جمالیات اور اس کے فنی تقاضوں کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔ان اشعار کے مطالعے سے ایک بات کا اندازہ اور ہوتا ہے، وہ فن سے زیادہ موضوعات کا خیال رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے ان کا قاری ان

کے کلام سے بہت جلدی مانوس ہو جاتا ہے۔ اسے کسی بھی طریقے کی پریشانی یا الجھاؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ ان کے یہ اشعار ایسے ہیں جو عام سے بھی عام لوگوں کے ذہن میں آسانی سے گھر کر جاتے ہیں۔

خاک میں مل گئی مغرب تری دنیا طلبی
سرفروشی مری تاریخ کا عنواں ہے ابھی

سادہ لوحی مری دیکھ کہ وہ قائد ہے مرا
غیر کے ہاتھ میں خود جس کا گریباں ہے ابھی

ضرور آپ کے ایماں میں خلل ہے کوئی
خدا کا نام لیا اور قیامتیں نہ ہوئیں

چھیڑ مت بادِ صبا ہم کو وہ درویش ہیں ہم
ناز کرتے بھی نہیں، ناز اٹھاتے بھی نہیں

حیف بینائیِ دورِ حاضر
عیب سارے ہنر بن گئے ہیں

آپ پچھتائیں گے خود شہر بدر کر کے ہمیں
ہم تو خوشبو ہیں ہواؤں میں مہکتے جائیں

شبنم سبحانی کے اشعار میں لہجے کی نرمی اور طرزِ ادا کی شائستگی کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ اسی طرزِ ادا کے ساتھ اپنے پیغام کو شاعری میں پیش کرتے رہے، اسی مخصوص اسلوب کے ذریعے دورِ حاضر پر طنز بھی بڑی خوبصورتی سے کر جاتے ہیں، جو قاری کے ذہن و دل پر نشتر کی طرح کام کرتا ہے، جس سے نئی تہذیب اور نسلِ نو پر ایک کاری ضرب لگتی ہے۔ وہ اپنے مقصد کی ترسیل کرتے ہوئے اعلانِ حق کا دعویٰ بھی بڑی بے باکی

سے اپنے شعروں میں کرتے ہیں، جس سے ان کے اس نغمۂ حق میں طرب خیزیت پیدا ہوگئی ہے اور اسی طرز ادا کے ذریعے انہوں نے غزلوں میں تعمیری اور مثبت پیغام ہم تک پہنچائے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ان کے یہ اشعار۔

یہ زندگی مری مشتِ غبار جیسی ہے
وہ ملتفت ہوں تو فصلِ بہار جیسی ہے

چلے چلو کہ یہ ہے اہلِ عشق کی میراث
ملے گی منزل دار و رسن کبھی نہ کبھی

یہ بھی طوفان حوادث میں غنیمت سمجھ
سر تو موجود ہے دستارِ فضیلت نہ سہی

کلمۂ حق پس دیوار ہی کہتے رہیے
سر مقتل اسے کہنے کی سعادت نہ سہی

کون سا گنج گراں مایہ چھپا رکھا ہے
تم نے کس ڈر سے چراغوں کو بجھا رکھا ہے

کوئی محفل طرب ہو کوئی مجلس اہم ہو
ہمیں جب کسی نے چھیڑا تو حدیثِ غم سنا دی

مجھے تو سوز دروں سے ملی نگاہِ رسا
میں کر سکا نہ کسی صاحبِ نظر کی تلاش

ڈاکٹر سید عبدالباری دراصل ایک نصب العین اور مشن کے تحت شاعری کر رہے تھے اور ایک ایسے نظریہ کی

ترجمانی کر رہے تھے، جو ادب میں پاکیزہ اور صالح ادب کا ضامن ہے۔ جس کے سبب ان کی شاعری میں ان کے فکر و تخیل کی یک رخی ہر جگہ نمایا ہوتی ہے اور یہ ان کی غزلوں کا غالب عنصر بھی ہے۔ بدلتی قدروں کا نوحہ، سماجی و معاشرتی تبدیلیوں کا ذکر اور اس کے نقصانات اور منفی اثرات کو انہوں نے اپنی شاعری کا خاص موضوع بنایا ہے اور زمانے کی اصلاح کی طرف بالخصوص قاری کے دل و دماغ کو متوجہ کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ شبنم سبحانی نے اپنے اشعار کے ذریعے بڑے مہذب انداز میں آج کے انسان کے ظاہر و باطن کے تضاد اور سماج کے کھوکھلے پن پر ضرب لگائی ہے اور عصری حسیت کے ساتھ شعر و سخن کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

آپ کے گھر میں اجالا تو بہت ہے لیکن
آپ کے دل میں بھی اک شمع فروزاں ہوتی

ہم ڈھونڈنے نکلے ہیں احساس کی چنگاری
چہرے کی چٹانیں ہیں، جسموں کا سمندر ہے

وہ مجھ سے کہتے ہیں فریاد کی اجازت ہے
کرم یہ خوب ہے جب کاٹ دی زباں میری

ہم کو فرصت ہی نہ تھی، بات نئی کہنے کی
کٹ گئی عمر بزرگوں سے روایت کرتے

شبنم سبحانی کی غزلوں میں شگفتگی و شائستگی، تخیل کی بلند پروازی، خیال کی پاکیزگی اور حسن کلام کی یہی جلوہ سامانیاں قاری کے ذہن و دل کو متاثر کرتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں عصری حسیت اور آگہی اور سماج و ماحول کی عکاسی پورے طور پر نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں سماجی و سیاسی بصیرت کو ایک نیا استعاراتی شعور عطا کیا ہے۔ جس کے سبب ان کی غزلوں میں ایک خاص آہنگ اور اور دلکش اندازِ بیان کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے۔

جو پردہ دار محبت ہو جگر نہ ملے
صدف ملے تو ہزاروں مگر گہر نہ ملے

کروں ناز اپنے نصیب پر اگر آج مجھ کو نصیب ہو
ترا سنگِ در ترا نقشِ پا ترے راستے کا غبار تک

فصل گل آتی گریباں چاک ویرانے چلے
چارہ سازانِ خرد زنجیر پہنانے چلے

وہ دردِ خاص دے مجھ کو جو دردِ عام ہو جائے
وہ غم مجھ کو عطا کر جو غمِ ایام ہو جائے

زمانے میں جو انساں غازیٔ کردار ہوتا ہے
وہ اپنے دور کی تاریخ کا معمار ہوتا ہے

دشوار نہیں شبنم تخلیقِ غزل لیکن
بے سوز تمنا ہے بس قافیہ پیمائی

فکر و فن میں ہے بفیض عشق وہ سوز و گداز
بن گئے ہیں تیر و نشتر اب مرے اشعار دیکھ

یہ وہ اشعار ہیں جن سے شبنم سبحانی کے فکروفن اور صلابت کا احساس بہ حسن وبخوبی ہوتا ہے۔مگر جب وہ ملتِ اسلامیہ کی طرف نظر اٹھاتے ہیں اور مسلمانوں کی آسائشوں ں اور اپنے مقصد سے گریز کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ان کا دردمند اور حساس دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ بے چین ہو جاتے ہیں اس اضطراب کے عالم میں وہ اس طرح پکار اٹھتے ہیں۔

اف مرغ حرم تیری معراج تن آسانی
لپٹے ہوئے بازو ہیں سمٹا ہوا شہپر ہے

او پلٹ کے جانے والے دیکھ منزل ہے قریب
کھول آنکھیں انقلابِ نو کے اب آثار دیکھ

ڈاکٹر سید عبدالباری کی شاعری میں مایوسی اور ناامیدی کی جھلک نہیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ دراصل سخت سے سخت حالات، پریشانیوں اور آزمائشوں کے طویل سلسلے اور بے پناہ درد والم کے جاں سوز مرحلوں کے درمیان بھی ایمان ویقین اور عزم وحوصلہ کی وہ دولت ان کے پاس ہے جو بیش قیمتی ہے اور یہ ان کی زندگی کا خاص حصہ بھی ہے۔ اس لئے ان کے اشعار صبح امید کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، مایوسی کے حالات میں بھی وہ قنوطیت کا شکار ہوئے بغیر پرامید نظر آتے ہیں اور یوں لب کشا ہوتے ہیں۔

پھر میری رگ و پے میں نیا خون رواں ہے
محکم ہیں ارادے بھی، عزائم بھی جواں ہیں

آ گردشِ دوراں تو ادھر سوچ سمجھ کر
گرتی ہوئی دیوار نہیں، کوہِ گراں ہے

مرے جنوں کا طلب میری تشنگی کا مآل
نئے نظام کی خواہش، نئی سحر کی تلاش

اب کیوں نہ چھڑے نغمہ زنجیر و سلاسل
اس بار تو موسم بھی جنوں خیز بہت ہے

یہ بھی طوفانِ حوادث میں غنیمت سمجھو
سر تو موجود ہے دستارِ فضلیت نہ سہی

اس خرابے میں تو نوحوں کو تبسم میں بدل
قرضِ ہستی تو اسی طرح ادا ہوتا ہے

جس نے دیکھا غمِ دوراں کو افق تا بہ افق
بے خودی بزم طرب کی اسے الجھا نہ سکی

ڈاکٹر عبدالباری شبنم سبحانی تعمیری ادب کے نظریات کو فروغ دیتے ہوئے، اشعار کے ذریعے قارئین کو منزل کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھنے کے لئے اکساتے ہیں نیز انہیں جدو جہد کے لئے مجبور کرتے ہیں۔مگر ان کے کلام میں ترقی پسندوں کی طرح نعرہ بازی اور گھن گرج نہیں ہے بلکہ اس میں سوز و گداز کا احساس ہوتا ہے۔ان کے نعرہ مستانہ کی بازگشت سن کر اہلِ خرد اور اربابِ مصلحت جن کا دورِ دورہ تھا ان کے ہوش ٹھکانے لگ جاتے ہیں۔

جو ظلم و جبر سے ہیں پنجہ کش وہ فرزانے
مٹا ہی دیں گے فضا کی گھٹن کبھی نہ کبھی

چلے چلو کہ یہ ہے اہلِ خرد عشق کی میراث
ملے گی منزلِ دار و رسن کبھی نہ کبھی

شبنم سبحانی کی غزلوں میں کچھ ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتر کر انسانی جذبات کے کچھ ایسے احساس کو کریدتے ہیں، جس سے ان کے اندر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ان اشعار سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے اور اس کے اندر ایک لہر سی اٹھنے لگتی ہے۔

اہلِ دل اور ذرا خونِ جگر پانی ہو
مدتوں بعد ہی تہذیب وفا آتی ہے

جو سن سکو تو سنو میری داستانِ زوال
مگر طویل شبِ انتظار جیسی ہے

ہم کیسے کہیں کیا ہے تری یاد کی لذت
یو ہی کوئی سینے میں چبھن ہو نہیں سکتی

حیف کہ قید ہو گئے دشت الم میں اہلِ درد
وسعت بے پناہ ہے عشق کی کائنات میں

مہر اور مہتاب ان کے ہیں
دن کریں یا سیاہ رات کریں

بارہا تنگیِ داماں نے کیا مجھ کو خفیف
ایسے جلوے نظر آئے تری فیاضی کے

ڈاکٹر عبدالباری کی غزلوں میں عوامی پن اور سطحیت بالکل نہیں ہے بلکہ ان میں تہہ داری کے ساتھ معنوی وسعت بھی ہے۔یہی وجہ ہے وہ مشاعروں میں کامیاب شاعر نہیں ثابت ہو سکے۔حالانکہ انہوں نے متعدد مشاعرے پڑھے لیکن ان کی شاعری مشاعرہ لوٹنے والی نہیں تھی اور نہ ہی سطحی جذبات کو ہوا دینے اور بے مقصد و بے لگام فکری روش کو فروغ دینے والی تھی۔اس لئے وہ مشاعرے میں زیادہ کامیاب و کامران نہ ہو سکے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کو فکر و فن کا سودا کرنے اور کاغذ قلم سے کھیلنے کا شوق بالکل نہیں تھا، اس لئے انہوں اپنے فن کے ذریعے انسانی زندگیوں کو حق و باطل کی کشمکش سے نکال کر انہیں صحیح راہ پر گامزن کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور انسانی ہمدردیوں کو شاعری کا اہم جز بنا کر پیش کیا ہے۔اس ضمن میں وہ اس طرح کے اشعار کہتے ہیں۔

اب نہ تر ہوں گی یہ آنکھیں غمِ ہجراں میں کبھی
اب بہیں گے میرے آنسو غم دوراں کے لیے

ترا غم ہو غم سبھی کا تری پیاس پیاس سب کی
یہی میکدہ میں ساقی میں نظام چاہتا ہوں

عبدالباری شبنم سبحانی کے اندر انسانی ہمدردی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا، انہیں ہمیشہ حکومت سے شکایت رہی ہے یہ نظام ٹھیک نہیں چل رہا ہے، جس سے غریب انسانوں کا حق انہیں نہیں مل پا رہا ہے۔اسی لئے ملک میں خوشحالی نہیں آ رہی ہے۔خاص طور سے مسلمانوں کے خلاف جو تعصب برتا جا رہا ہے اور جس طرح انہیں اپنے حق سے محروم کیا گیا ہے، عبدالباری شبنم سبحانی اس فکر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔

کچھ راز کھلے شاید ساقی کی نوازش کا
میں آج حریفوں سے پیمانہ بدلتا ہوں

جمہور نوازی کا دعویٰ تو زباں پر ہے
تیور میں ہے چنگیزی انداز میں ہے دارائی

سادہ لوحی دیکھ کہ وہ قائد ہے مرا
غیر کے ہاتھ میں خود جس کا گریباں ہے ابھی

غرض ڈاکٹر سید عبدالبار شبنم سبحانی پوری زندگی اپنی غزل میں اسی فکر ونظر کی آبیاری کرتے رہے، جس کی جھلک ان کے مختلف اشعار میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ان کی شاعری موجودہ عہد سے بیزاری اور بغاوت کی توانا آواز اور نئے سماج کی از سرِ تشکیل کی نقیب بھی ہے۔ان کی شاعری میں وسیع القلبی اور وسیع النظری ،مطالعۂ

کائنات،علم کی گہرائی ،ان کے ذاتی مشاہدے، تجربے، ان کا اخلاص اوران کی فنی ریاضت انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ان کی شاعری میں متانت سنجیدگی اورفکری صلابت وہ سب کچھ موجود ہے جوانہیں اردوشاعری میں ایک خاص مقام عطا کرنے کے لئے کافی ہے۔

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری صالح ومثبت فکر کے شاعر ہیں۔وہ زندگی میں راست روی، خیر وفلاح اورتعمیر و ترقی کوخصوصی اہمیت دیتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں ان کا معاشرہ جو دن بہ دن انحطاط ،تنزل اور تباہی کی طرف خطرناک طریقے سے بڑھتا جارہا ہے، اسے اس عبرت ناک انجام سے بچایا جاسکے۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے معاشرے کوایک نئی منزل کی طرف متوجہ کیا، جوصحت منداد بی روایات مربوط اورتہذیبی تمول سے مالا مال ہے۔وہ حالی ،اکبراوراقبال جیسے شاعروں کی بنائی ہوئی راہ پرنہایت دل جوئی اوراستواری سے گامزن ہیں اوران کے اعلیٰ فکر وخیالات اور صالح اقدار کواپنی شاعری میں برقرار رکھا ہے۔یہی وجہ ہے ان کی شاعری اپنی تمام انفرادیت وجدت کے باوجود راہ اعتدال سے منحرف نہیں ہوتی۔انہوں نے اس وراثت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے تہذیبی سرمائے اورفکری اثاثے کا ہرحال میں پاس رکھا ہے۔دارصل وہ اس بات سے بہت اچھی طرح واقف تھے کہ اپنی شخصیت اوراپنی تہذیبی روایات سے منقطع ہوکرکوئی فن کاراپنے کمالِ فن کا مظاہرنہیں کر سکتا ہے۔اس لئے ان کی شاعری میں ان کے عقائدونظریات، ان کی آرزویں اورامنگیں،خوابوں اورخیالوں کا عکس واضح نظرآتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے فرد کی تنہائی، بے چہرگی ،خوفِ مرگ اورزندگی کی بے معنویت کواپنی غزلوں کا حصہ نہیں بنایا ہے۔وہ گل وبلبل کے نغمے بھی نہیں بکھیرتے اور نہ ہی اپنی شاعری میں حسن وعشق کی باتیں کرتے ہیں اورنہ ہی کسی مجازی محبوب کی اداوناز سے اپنے کلام کوحسین بنانے کی کوشش کرتے ہوئے نظرآتے ہیں بلکہ ان کی شاعری زندگی کے اہم وسنجیدہ مسائل اورسنگین حقیقتوں سے سروکاررکھتی ہے۔ہوش وخرداورمتانت و شائستگی ان کی شاعری کے اجزائے خاص ہیں۔وہ تفکر وتعقل کی بلندسطح سے تفنن اور وتلذذ کی پست سطح پرکبھی نہیں آتے۔یہی وجہ ہے ان کی شاعری میں وہ چٹخارہ پن نہیں ہے جوحسرت، جگر، فراق، اصغراورفانی کی شاعری میں موجود ہے۔

ممکن ہے عبدالباری شبنم سبحانی کی غزلوں میں بعض ناقدانِ فن کورعایت لفظی کا وہ اہتمام، استعاروں کی

فراوانی اور پیکر تراشی کا وہ انداز نہ نظر آئے جو بعض دوسرے شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔لیکن اشاریت و ایمائیت اور رمز و کنایہ کے اعتبار سے ڈاکٹر سید عبدالباری کے اشعار دل کی آویزی، تازگی، تہہ داری سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔عبدالباری شبنم سبحانی اپنے مخصوص اندازِ فکر اور اسلوب شاعری سے پوری طرح مطمئن نظر آتے ہیں۔حالانکہ جس وقت وہ شاعری کر رہے تھے، وہ ترقی پسندی کے زوال اور جدیدیت کی اندھی تقلید کا زمانہ تھا۔مگر پھر بھی وہ ان نظریات سے ہٹ کر اپنی روشِ خاص پر نہایت ثابت قدمی سے جمے رہے اور شاعری کے اعلیٰ معیار کی میزان پر شعر کہتے رہے۔شاید ان کو اس بات کا اندازہ رہا ہوگا کہ ان کے اشعار فن اور تہذیب کی کسوٹی پر پرکھے جائیں گے اس لئے انہوں نے مواد اور موضوع دونوں کی عمدگی اور نفاست کا خیال اپنی شاعری میں بطورِ خاص رکھا ہے۔اس اہتمام کے سبب اور ریاضت و مشقِ سخن کے نتیجے میں شبنم سبحانی کی شاعری میں زبان کی صفائی، بندش کی چستی، محاوروں کی صحت، جذبات کا خلوص اور موضوعات کی متانت قدم قدم پر متوجہ کرتی ہے۔

ان سب خصوصیات کے باوجود ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی بحیثیت غزل گو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکے۔ایسا نہیں ہے ان کی شاعری میں فنی پختگی نہیں ہے، مگر شاعری میں وہ کشش نہیں نظر آتی جو اس عہد کے دیگر شعرا کے یہاں موجود تھی۔غرض ڈاکٹر سید عبدالباری شاعری کرتے رہے، مگر ان کا اصلی رجحان نثر نگاری کی طرف ہی تھا۔انہوں نے تنقید و تحقیق میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہی ان کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔شاید اس بات کا احساس انہیں بھی تھا اس لیے وہ شاعری ترک کر کے نثر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ان کے اس مجموعے ''طرب خیز'' میں ان کی ابتدائی زمانے کی غزلیں شامل ہیں۔مجموعے میں غزل کے خاتمے پر عبدالباری شبنم سبحانی نے جس سال میں غزل کہی ہے اس کی تاریخ درج کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے انہوں نے ۱۹۷۰ء کے بعد غزل کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں مرکوز کی۔حالانکہ وہ نظموں پر طبع آزمائی کرتے رہے ہیں اور ان کی نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے اگر وہ غزل کے بجائے نظم پر اپنی ساری توجہ مرکوز کرتے تو وہ ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو سکتے تھے۔مگر انہوں نے شاعری کی کسی صنف کی طرف خاص توجہ نہیں دی۔پھر بھی انہوں نے غزل میں جو کچھ پیش کیا ہے وہ ان کے مشن کو آگے بڑھانے اور تعمیری ادب کے فروغ میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔جس نظریہ کو انہوں نے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے اگر صرف اسی اعتبار سے ان کی شاعری کے مرتبے کا تعین کیا جائے تو اس اعتبار سے وہ ایک کامیاب شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

باب دوم (ب)

ڈاکٹر سید عبدالباری کی نظم نگاری کا تنقیدی جائزہ

گزشتہ باب میں ہم نے ڈاکٹر سید عبدالباری کی غزلوں کا جائزہ پیش کیا ہے اسی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے اس باب میں ان کی نظموں کا جائزہ لیا جائے گا اس ضمن میں ان اسباب وعوامل اور محرکات کو ذہن میں رکھنا لازمی ہے جو ان کی غزلوں میں کارفرما تھے کیوں کہ عبدالباری شبنم سبحانی کی نظموں اور غزلوں کا محور ومرکز اور مقصد یکساں ہے،اس لئے اس باب میں اس کی زیادہ وضاحت نہ کرتے ہوئے براہِ راست ان کی نظموں پر گفتگو کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم نگاری پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس میں وہ بہ نسبت غزل کے زیادہ کامیاب وکامران نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر عبدالباری نے جس عہد میں شاعری کی ابتدا کی تھی،اس وقت نظم نگاری کا فن ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکا تھا۔عبدالباری نے بھی تبدیلیوں کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے اپنی نظموں میں فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنی نظموں میں وہ جدید موضوعات جو مغرب سے درآمد ہوئے ہیں ان کو بھلے ہی نہ قبول کیا ہو،مگر نظم میں جو جدید ہیئتی تجربے ہوئے ہیں،ان کو ضرور قبول کیا ہے بلکہ اسی جدید فارم میں انہوں نے زیادہ تر نظمیں بھی تخلیق کیں ہیں۔غرض ڈاکٹر عبدالباری نے جدید اردو نظم سے استفادہ کرتے ہوئے ،عوام تک اپنے جذبات و پیغام پہنچانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔جدید نظم کی ابتدا ویسے تو حالی اور محمد حسین آزاد سے ہوتی ہے،ان کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج اردو شاعری معاشرہ میں بیداری پیدا کرنے اور سماجی شعور کو فروغ دینے کے لئے کافی کارآمد ثابت ہو رہی ہے۔ان لوگوں نے اردو میں جدید نظم نگاری کی بنیاد مغربی شعروادب کی روشنی میں رکھی،نیچرل شاعری کے رجحان کو اردو ادب میں عام کیا اور مناظرِ فطرت کے ساتھ معاشرتی مسائل کو شاعری میں موضوع بنا کر پیش کیا۔شاعری میں انہوں نے اصلیت اور وقعیت کو ضروری قرار دیا۔حالی نے مقدمہ شعروشاعری لکھ کر اردو شاعری کو ایک نیا رخ عطا کیا اور اس کے لئے اصلیت ،حقیقی جذبات،اور واردات کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنے کی پرزور حمایت کی۔جس سے لوگ زیادہ سے زیادہ متاثر ہوسکیں۔حالی نے صرف نظریاتی تنقید نہیں پیش کی بلکہ مسدسِ حالی لکھ کر انہوں نے اپنے خیالات وجذبات کو عملی جامہ بھی پہنایا ہے۔حالی نے اس وقت متعدد نظمیں لکھیں اور ان نظموں کے ذریعے لوگوں میں قومی اتحاد،وطن کی محبت،اور انسان دوستی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔اس عہد میں شبلی،اکبر اور آزاد نے بھی اس نوعیت کی نظمیں تخلیق کر کے مشرقی تہذیب واقدار کی بھر پور ترجمانی کی۔

حالؔی اور شبلؔی کے علاوہ اس عہد میں اکبر الہ آبادی نے بھی اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے ذریعے مغرب کی اندھی تقلید کو شاعری کا خاص موضوع بنا کر ہندوستان کی صالح وصحت مند قدروں کو برقرار رکھنے کی تلقین کی ہے۔ پھر اقبال جیسی بلند پایہ شخصیت اردو نظم نگاری کی تاریخ میں نمودار ہوئی، جس نے اردو نظم نگاری کے فن اور موضوعات میں وسعت پیدا کر کے مشرق و مغرب کی ادبیات، فلسفے، افکار وخیالات اور جدید شعری روایات کو اپنی شاعری کے ذریعے یک جا کر دیا۔ اقبال ایک بہترین فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ فطرت کے نبض شناس بھی تھے اور مشرق کی اعلیٰ روایات کے رموز ونکات سے پوری طرح واقفیت بھی رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے اردو شاعری کو بے مقصد رومان پسندی اور ادب برائے ادب کے طلسم سے جدید شاعری کو نجات حاصل ہوئی۔ اردو شاعری کی تاریخ میں اقبال پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعری کے ذریعے بڑی خوداعتمادی کے ساتھ اپنا پیغام بڑی شان وشوکت سے عوام تک پہنچایا۔ انہوں نے اردو نظم کو ایک نیا رنگ و روپ عطا کیا۔ اقبال کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی نظریات اور اسلامی تاریخ کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کے پیغامات سے اپنی شاعری کو ہم آہنگ کر کے اردو شاعری میں تعمیری ادب کی بنیاد رکھی۔ اقبال کے بعد اردو شاعری میں قومی و وطنی شاعری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ دراصل یہ عہد ہندوستان کی جنگِ آزادی کا دور تھا۔ چکبستؔ نے وطن کی محبت اور عظمت کے گیت گا کر اس میدان میں سبھی شعرا سے سبقت حاصل کی۔ ان سبھی شعرا نے اردو نظم کی ہیئت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کی۔ مگر موضوعات کی سطح پر انہوں نے اردو نظم کا دامن مختلف خیالات و افکار اور مشاہدات سے مالا مال کر دیا۔ پھر ترقی پسند شعرا نے اردو نظم نگاری کے دامن کو کافی وسعت بخشی، مگر اس عہد کی شاعری محض پروپگنڈہ اور نعرے بازی بن کر رہ گئی تھی اور انسان کے جنسی ومعاشی مسائل ان کی توجہ کا محور ومرکز بن گئے۔ البتہ اس تحریک سے وابستہ کچھ شعرا نے موضوع اور فکر وفن کے مابین توازن کا راستہ اختیار کر کے اردو نظم نگاری کو ایک خاص مقصد کے تحت استعمال کیا۔ پھر جدیدیت کا تصور اردو ادب میں غالب ہوتا ہے، اس نظریہ سے تعلق رکھنے والے شعرا نے فرائڈ کے فلسفۂ نفسیات کی روشنی میں شاعری کی اور ابہام، پراگندگی اور انتشار کو اپنی شاعری کا محور بنایا۔ ان کے یہاں جنسیت کا غلبہ تھا، تشکیک اور بے یقینی کی کثافت تھی۔ ان کی نظموں میں ابہام اور الجھاؤ اور پیچیدگی اتنی زیادہ تھی کہ عوامی طبقے کا رشتہ اردو شاعری سے منقطع ہو گیا۔ اسی دوران اسلامی تحریک بھی ادب میں رونما ہوئی، جس نے ترقی پسند اور جدیدیت دونوں نظریات کی مخالفت کرتے ہوئے تعمیر پسند رجحان ادب میں پیش کیا اور اس حلقے سے تعلق رکھنے والے فن کاروں نے اسلامی فکر و نظر کی بنیاد پر ادب تخلیق کیا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب کا تعلق بھی اسی حلقے سے ہے۔ غرض ان سبھی تحریکوں اور رجحانوں نے اپنے مقصد و نظریات کی تبلیغ واشاعت کے لئے نظم کو ہی اپنا وسیلۂ اظہار بنایا، جس سے اردو نظم

کا دامن کافی وسیع ہوا اور آج اردو شاعری بطورِ خاص نظم نگاری کے حوالے سے اس اہمیت کی حامل ہوگئی ہے کہ اسے عالمی ادب کے بڑے سے بڑے ادبی شاہکار کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اردو نظم نگاری اپنے موضوعات کی رنگارنگی اور تہذیبی و ثقافتی سطح پر عالمی ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

اردو شاعری میں غزل کو روزِ اول سے ہی اہمیت حاصل رہی ہے لیکن نظم کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ بلکہ جس شاعر کو اپنے پیغام کی ترسیل و تبلیغ کرنی ہوتی ہے، وہ اپنے مقصد کے لئے نظم کو اپنا وسلیۂ اظہار بناتا ہے۔اس نظریہ سے دیکھا جائے تو نظم نگاری کا فن غزل سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔اس لئے کہ اس میں کسی موضوع کے مختلف گوشوں کو بآسانی تفصیل سے واضح کرنے کی گنجائش ہوتی ہے اور شعرا کو اپنی بات کو بہترین طریقے سے پیش کرنے کا موقع بھی فراہم ہوتا ہے، وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنے فکر و خیال کا اظہار شاعری میں کرتے ہیں، جس سے نظم میں ایک طرح کا تسلسل پایا جاتا ہے۔اسی تسلسل کی وجہ سے قاری بھی ایک لمحے کے لئے بھی نظم کے مرکزی موضوع سے خود کو علاحدہ نہیں کر پاتا اور جب نظم اپنے اختتام پر پہنچتی ہے، اس وقت تک قاری اس کی گرفت میں رہتا ہے اور شاعر کے فکر و خیال نہایت آسانی سے اس کے ذہن پر مرتب ہو جاتے ہیں۔اس بات سے ہر کوئی واقفیت رکھتا ہے کہ ترقی پسند تحریک نے نظم نگاری کے فن کو کافی اہمیت دی دراصل یہ تحریک جس مقصد اور پیغام کو عوام تک پہنچانا چاہتی تھی غزل اس کی متقاضی نہیں تھی چنانچہ اس عہد کے شعرا نے نظم کا سہارا لے کر اپنے پیغامات عوام تک پہچانے کا کام کیا۔نظم کے رنگ و آہنگ کا جو فائدہ کسی بھی مقصدی یا افادی ادب کو ہونا چاہئے ترقی پسند تحریک کے سبھی شعرا نے اس سے خوب استفادہ کیا اور اپنی شاعری کو اس صنف کے ذریعے مقبولِ خاص و عام بھی بنایا۔اسی کے شانہ بشانہ تعمیری ادب یا اسلامی ادب کی تحریک بھی چل رہی تھی اور دونوں تحریکیں اپنے نظریات کی تبلیغ و اشاعت کر رہی تھیں۔ایک نظریہ اشتراکیت کو فروغ دے رہا تھا دوسرا اسلامی نظریات کو پیش کر کے ادب میں اخلاقی، تہذیبی اور مذہبی اقدار کی اشاعت میں لگا ہوا تھا دونوں کے ادب مقصدی تھے لیکن اسلامی ادب سے وابستہ بہت کم شعرا نے نظم نگاری کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا ہے، انہوں نے غزل کے ہی تمام فنی لوازمات کے ذریعے اشارے اور کنائے میں اپنی بات کو پیش کرنا بہتر سمجھا۔حالانکہ اسلامی ادب کا دائرہ اپنے موضوعات کے اعتبار کافی وسیع تر معلوم ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی بھی ادب اس کی وسعت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔غرض اسلامی ادب کے شعرا نے سب سے زیادہ با مقصد اور وسیع نظریات کے حامل ہوتے ہوئے بھی نظم جیسی صنف سخن کی طرف کوئی خاص توجہ مرکوز نہیں

کی۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس کمی کو محسوس کیا اوراس صنف میں انہوں نے خوب طبع آزمائی کی یہ الگ بات کہ وہ اپنے اس مقصد میں زیادہ کامیاب ہوئے یا نہیں اور ہوئے بھی تو کس حد تک۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کی نظموں کا مجوعہ ''فکر انگیز'' ۲۰۱۰ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔جس میں انہوں نے حمد اور نعت کو بھی شامل کیا ہے اس کے علاوہ اس مجموعے میں نظموں کی کل تعداد ۶۸ ہے۔اس میں بیش تر نظمیں کسی واقعے یا حادثے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں،ان میں کچھ نظمیں آزاد، کچھ پابند اور کچھ معریٰ بھی ہیں۔ان نظموں کے موضوعات زیادہ تر اسلامی یا تعمیری ہیں اور کچھ نظمیں عالم اسلام اور انسانیت کے علم برداران افراد کے نام ہیں جنہوں نے اسلامی تاریخ میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔وہ اپنی نظموں کے موضوعات سے متعلق خود لکھتے ہیں:

> ''مجموعہ کی نظمیں مختلف اوقات میں مختلف اہم واقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئیں ۔برصغیر، عالم اسلام، اور عالمِ انسانیت کے اہم افراد، اہم تحریکات اور اہم واقعات کا ان میں انعکاس ملے گا۔ بلکہ آپ بیسوی صدی نصف آخر کے تہذیبی ،فکری اور ادبی نشیب و فراز کی ایک تاریخ ان کی روشنی میں مرتب کرسکیں گے۔''۳

ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی کی نظموں کے موضوعات مختلف ہیں کچھ وہ نظمیں ہیں جو کسی خاص مسئلے کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو کسی حادثے سے متاثر ہو کر لکھیں ہیں۔جن میں ''دارلمکافات''،''یہ راہ''،''جاگو آ گیا ہے وقت حساب''،''سبک سارانِ ساحل''،''منزل حیات''،''میری تہذیب کیوں محروم ہے خارا شگافی سے''،''اورنگ زیب عالم گیر''،''تلخیاں''،''اہلِ ساحل''،''میری نوا''، اور'' تقدیر و تدبیر''۔ان نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے یہ کسی خاص مسئلے کو موضوع بنا کر قلم بند کی گئی ہیں اور ان میں انہوں نے اس مسئلے کا حل بھی پیش کیا ہے۔جب کہ دوسری نظمیں بیسوی اور اکسویں صدی کے اہم مسائل، اہم واقعات اور حوادث کی ترجمان ہیں۔مگر غور سے دیکھا جائے تو ان کے مجموعے کی وہ نظمیں زیادہ اثر انگیز معلوم ہوتی ہیں، جو کسی حادثے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں اور ایسی نظمیں اس مجموعے میں تعداد کے اعتبار سے زیادہ ہیں۔ان نظموں کے مطالعے سے قاری پر ایک تاثر پیدا ہوتا ہے جو تادیر قائم رہتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے، اس لئے جب کبھی انسان کی پامالی اور اس کی مظلومیت اور امتِ مسلمہ کی بربادی کا عالم دیکھتے ہیں تو وہ تڑپ اٹھتے اور اس پر آہ و بکا بھی کرتے ہیں اور اسی درد اور جذبات کو وہ اپنی نظموں میں بخوبی پرونے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اسی دردسوزی نے ان کی نظموں کو بلند مقام عطا کیا ہے اور یہی ان کی مقبولیت کے اسباب بھی ہیں۔ ان نظموں کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالباری خود رقمطراز ہیں:

> ''یہ نظمیں اعلیٰ درجہ کا فنی شاہکار نہ ہوں لیکن متعلقہ عہد کے درد و تڑپ، سوز و گداز اور معاشرتی و تہذیبی سطح پر برپا اتھل پتھل پر شاعر کے ردِ عمل کو بے کم و کاست پیش کرتی ہیں اور ان میں ایک روشن مستقبل کی آرزو کا چراغ سینے کے اندر روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گزشتہ نسلوں کے درد و داغ اور آرزو و جستجو کو منعکس کرنے والی یہ نظمیں امید ہے کہ جدید نسلوں کو بھی ولولہ تازہ کر سکیں گی جو تقریباً ویسے ہی مسائل سے دوچار ہیں جن سے گزشتہ صدی کے نصف آخر میں ان نظموں کی تخلیق کرنے والا دوچار تھا۔''[۴]

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری کی یہ نظمیں کسی خاص مقصد کے تحت وجود میں آئی ہیں۔ ان کی سبھی نظموں میں اسلامی فکر کی جھلک صاف نظر آتی ہے، جس میں تعمیری افکار کے ذریعے انہوں نے معاشرے کی اصلاح اور ان میں اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان جذبوں سے سرشار ان کی شاعری ظلم و جبر سے لڑنے کا وہ حوصلہ پیدا کرتی ہے جو برسوں کی تربیت کے بعد بھی کسی انسان کو حاصل نہیں ہوتا۔ ان کی ایک نظم ''کارواں بن کے چلو موجِ رواں بن کے چلو'' ان کے اسی پہلو کی عکاسی کرتی ہے، جس میں ان کی نظم نگاری کے تمام اوصاف یکساں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں:

منزلیں دور سہی راستے دشوار سہی
ہر طرف نفرت و تفریق کی دیوار سہی
قافلے والے سفر سے ابھی بیزار سہی
کارواں بن کے چلو موجِ رواں بن کے چلو

راہ میں سنگِ گراں ہے تو ہٹا دو اس کو
ہار بیٹھے کوئی ہمت تو اٹھا دو اس کو
بوجھ یہ دولتِ دنیا ہے تو لٹا دو اس کو
کارواں بن کے چلو موج رواں بن کے چلو

گر ہے مستقبلِ تاباں کی تمنا ہے تو چلو
چاہتے ہو کہ روشن ہو رخِ فردا تو چلو
فکر ہے ملک کا ڈوبے نہ سفینہ تو چلو
کارواں بن کے چلو موجِ رواں بن کے چلو

فکر کچھ چاہئے کچلے ہوئے انسانوں کی
سرزنش چاہئے فاشزم کے حیوانوں کی
دھجیاں اڑنے نہ دو سوختہ سامانوں کی
کارواں بن کے چلو موجِ رواں بن کے چلو

اٹھو اور ملت بیضا کی کرو چارہ گری
زیب دیتی نہیں کم ہمتی و کم نظری
حیف یہ تنہا روی ہے بصری در بدری
کارواں بن کے چلو موجِ رواں بن کے چلو

تیغ ظالم کی جو کہتی ہے بزن کیا غم ہے
راستے میں ہے اگر دار و رسن کیا غم ہے
باندھ کے سر سے نکل آؤ کفن کیا غم ہے
کارواں بن کے چلو موجِ رواں بن کے چلو

جوش میں آج ہے ملت کے جوانوں کا لہو
محو فریاد ہے مظلوموں غریبوں کا لہو
ہم بھی تیار ہیں اور تم بھی ہو تیار چلو
کارواں بن کے چلو موجِ رواں بن کے چلو

اس نظم کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دردمند دل رکھتے ہیں اور سماج ومعاشرے کی تبدیلی کے زبردست خواہش مند بھی ہیں۔اس لئے وہ قوم کو پیغام دیتے ہیں راستے پرخطر ہی سہی مگر منزل تک پہنچنے کے لئے ان سبھی پریشانیوں اور دشواریوں کا سامنا کرتے ہوئے بہترین مستقبل کا خواب دیکھا جا سکتا ہے۔غرض شبنم سبحانی اس عہد کے نوجوانوں کو اپنی نظموں کے ذریعے بیدار کرتے ہیں نیز انہیں عملی زندگی کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور حق کے لئے دار ورسن کی پرواہ کئے بغیر انہیں ملک وملت کی ترقی کے لئے موج رواں بن کر چلنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔اس نظم میں وہ تمام کیفیات دیکھنے کوملتی ہیں جو ان کی تمام نظموں میں مجموعی طور پرمحسوس کی جا سکتیں ہیں۔یہی بیقراری و بےچینی اور قوم کی اصلاح اور نوجوانوں کی تربیت ان کی زیادہ ترنظموں کا نصب العین ہے۔ڈاکٹر سید عبد الباری جب کوئی نظم تخلیق کرتے ہیں تو پہلے موضوعات کے تمام پہلوؤں پر بہت غور وخوض کرتے ہیں،جس سے فکر میں کہیں بھی تکرار نہ ہونے پائے،شبنم سبحانی کے اس مجموعے کی یہی خاص بات ہے،اس میں فکری تکرار شاید ہی کہیں دیکھنے کوملتی ہو اور یہ ان کی نظم نگاری کا ایک خاص وصف بھی ہے۔وہ اپنی نظموں میں فن سے زیادہ فکر اور موضوعات کو اہمیت دیتے ہیں۔انہوں نے الفاظ کو وسائل سمجھ کر اپنی فکر کو نظم نگاری میں اولیت کا مقام دیا ہے۔وہ اپنے اس مجموعے کے فلیپ پر لکھتے ہیں:

> میری نظموں کا قاری محسوس کرے گا کہ فن پر فکر کو فوقیت دی گئی ہے۔میرے خیال میں ایک باشعور ادیب وشاعر کا سفر الفاظ کے بجائے خیال سے شروع ہوتا ہے۔بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہر خیال اپنے ساتھ الفاظ لاتا ہے اور ہر خیال کو ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں وہی الفاظ ہیں جو اس خیال کے ساتھ خود بخود چلے آتے ہیں۔میرے نزدیک بہ ظاہر ادب کی ذمہ داری ذہن سازی یا تشکیل کردار نہیں ہے۔وہ حسن کلام اور تاثیر کلام کا نام ہے لیکن تاثیر کلام میں یہ بات خود بخود شامل ہے کہ ادب وشعر کے ذریعہ قاری ادیب وقلم کار کی باتوں یا اس کے ادب پاروں سے تاثر قبول کرے۔یہی

تاثر انگریزی ادب کو دیگر فنون لطیفہ سے ممتاز کرتی ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک فن پارہ فنی دلکشی اور فکر انگیزی کا حامل نہ ہو۔''۵

ڈاکٹر سید عبدالباری کی نظموں کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں مذکورہ بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسی نقطۂ نظر سے ان کی نظموں کا مطالعہ بھی کرنا ہوگا۔ یہ بات صحیح ہے کہ انہوں نے فن سے زیادہ فکر کو فوقیت دی ہے اور نظموں کے مطالعے سے یہ بات سامنے بھی آتی ہے کہ ان نظموں میں فنی خامیاں بھی کہیں کہیں در آئی ہیں جن کا احساس انہیں بھی ہے، وہ خود لکھتے ہیں:

''میری نظموں میں کچھ پابند اور کچھ معرا و آزاد ہیں زبان و فن کے ساتھ زیادہ زور فکری رجحانات، ثقافتی میلانات اور تہذیبی اقدار کی بھرپور ترجمانی پر زور دیا گیا ہے۔ یہ نظمیں اعلیٰ درجہ کا فنی شہکار نہ ہوں لیکن متعلقہ عہد کے درد و تڑپ، سوز و گداز اور معاشرتی و تہذیبی سطح پر برپا اتھل پتھل پر شاعر کے ردِعمل کو بے کم و کاست پیش کرتی ہیں''۔(۶)

ڈاکٹر سید عبدالباری کی نظموں کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں ہماری تہذیب و اقدار کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے اور اس قبیل کی کئی کامیاب نظموں سے ہمارا سابقہ بھی پڑتا ہے۔ یہ نظمیں پابند بھی ہیں اور کچھ جدید ہیئت میں بھی کہی گئی ہیں۔ ان کے مجموعے میں شامل سبھی نظمیں ان کے اعلیٰ نصب العین اور شعوری ادبی مشن کی غماز ہیں۔ اپنی نظموں میں عالمی پیمانے پر صدیوں سے چلی آرہی خیر و شر اور ظلم و ستم، حق و باطل کی کشمکش کو انہوں نے اپنی شاعری کا خاص موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔ عوام پر ہونے والے ظلم و ستم اور زیادتیوں کے علاوہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ہونے والی ناانصافیوں اور عالمی سطح پر ہونے والے جبر و تشدد، اور استبداد کے خلاف اپنی نظموں میں آواز اٹھائی ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں سے وہی کام لیا ہے جو ترقی پسند شعرا نے لیا تھا، مگر ان کے نظریات اور عبدالباری شبنم سبحانی کے نظریات میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوتا ہے، انہوں نے بھی نوجوانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی مگر ان کی شاعری گھن گرج اور نعرہ بازی بن کر رہ گئی۔ مگر عبدالباری نے اپنی نظموں کو ان عیبوں سے پاک رکھا ہے اور ان میں ترقی پسند جیسی بلند آہنگی نہیں ہے بلکہ ان کی نظمیں دھیمی دھیمی آنچ پر پکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور نہایت نرم لہجے اور سنجیدگی کے ساتھ وہ اپنا تعمیری پیغام عوام تک پہنچاتے ہیں۔ ان کی نظموں میں مسلمانوں کے مسائل کو خاص اہمیت دی گئی ہے نیز قوم کو مسائل سے

باہر نکالنے کی تجویز بھی انہوں نے نظموں میں جا بجا پیش کی ہے۔عبدالباری مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال دیکھ کر اس پر نوحہ خوانی کرنے کے بجائے نوجوانوں کو حوصلہ دیتے ہیں اور ان کے عزائم کو بلند کرنے کی ترغیب بھی۔جس کے سبب ان کی نظموں میں ایک نیا انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔

ان کے مجموعے کی ابتدا میں کچھ نعتیہ نظمیں ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے حضورِ اکرمؐ کی ذات اور ان کے حسن کردار کے ذریعے ان کی الفت کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے انقلابی مشن کے نقوش کو واضح کیا ہے۔اس کے بعد ان کی نظم ''دارالمکافات'' ہے، جس میں انہوں نے انسانوں کو خطرناک انجام سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔اس نظم میں وہ زمین سے خطاب کرتے ہیں اور اس کو اس کے انجام سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں، صدیوں سے قائم اس زمین پر نہ جانے کتنے شداد اور نمرود آئے، لیکن ان کے ظلم و ستم کا کہیں کچھ نشاں باقی نہیں رہا۔اس نظم کا اصل مقصد یہی ہے یہ دنیا فانی ہے کہ یہاں کچھ رہنے والا نہیں ہے، سب کچھ مٹ جائے گا اور ہمیں بارگاہِ ایزدی میں جا کر اپنا سر جھکانا ہے اور پھر اس کے سوالوں کا جواب بھی دینا ہوگا۔نظم کے چند بند دیکھئے:

جن کے آگے تھے خم اک زمانے کے سر
ایسے کتنے ہی شداد و نمرود کا
ہر نشاں روئے گیتی سے معدوم ہے
جیسے صحرا میں آندھی اٹھے اور مٹا دے نقوشِ قدم
جیسے دریا سے موجیں اٹھیں بلبلوں کا کریں سر قلم
اے زمیں
کتنا سنگین قانون دارالمکافات ہے
چند لمحوں کی مہلت ہے پھر سلسلہ ہے سولات کا اور جوابات کا
اور قعر مذلت کا سنگ گراں کا حوالات کا
بجلیوں کی کڑک بادلوں کی گرج اور شعلوں کی برسات کا

اس نظم میں انہوں نے قوم کے سبھی لوگوں کو آگاہ کیا ہے اور علامتوں کے ذریعے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اگر

ہم دنیا میں سنبھل کرنہیں چلتے ہیں تو اللہ کے ہاں ہمیں سخت عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ان کی ایک نظم ''یہ راہ'' جس میں انہوں نے ایک خاص مقصد کے تحت زندگی گزارنے اور نصب العین کے لئے جدوجہد کرنے کا سفر کتنا دشوار ہوتا ہے،اس کو موضوع بنا کر بتایا ہے کہ انسان کو کسی منزل پر پہنچنے کے لئے سخت سے سخت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔نظم کے آغاز میں انسان کی زندگی میں دنیا میں کیا کیا مصیبتیں اور پریشانیاں پیش آتی ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔بعد میں انہوں نے ان سبھی دشواریوں سے لڑنے کا حوصلہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر یہ صفات موجود ہیں تو انسان کسی بھی سفر کو بآسانی طے کرسکتا ہے اور منزلیں حاصل کرسکتا ہے۔نظم کے کچھ اشعار جو آخر کے ہیں جن میں انہوں نے قوم کا حوصلہ بلند کیا ہے سماعت فرمائیں:

یہاں پہ شعلہ ہوئی ہے شبنم
اگر ہیں فرہاد کے عزائم
تو تیشۂ آرزو اٹھاؤ
جو دل گدازی کا حوصلہ ہے
تو عشق کی مشعلیں جلاؤ
اگر ہے دار و رسن سے الفت
تو آؤ اس رہگزر پہ آؤ
قدم بڑھانا ہے سوئے منزل
بقلب مضطر با چشمِ پر نم
نظر ملانا ہے کلفتوں سے یہ شوقِ پیہم بہ عزمِ محکم
ذرا سنبھل کر قدم اٹھانا
بڑا مشکل سفر ہے شبنم

عبدالباری شبنم سبحانی کی بہترین نظم ''سرجیوہمیں آواز دیتا ہے'' ہے۔یہ ایک طویل نظم ہے جو بوسینا کے غیرت مند مسلمانوں کے خلاف کی گئی بربریت کے خلاف نہ دل کا غبار ہے بلکہ انہوں نے اس کے اسباب و بغاوت کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک طرف دنیا کو اس کا منافقانہ چہرہ دکھانے کی کوشش کی ہے تو دوسری طرف جواں دلوں کو گرما کر انہیں انقلاب کی راہ پر گامزن کرنے کا حوصلہ بھی دیا ہے۔اس نظم میں انہوں نے دنیا کے

تمام ایسے ممالک سے سوال کیا ہے جو ہر وقت امن وآشتی کا دم بھرا کرتے ہیں۔عبدالباری صاحب نے ان سبھی مغربی قوموں سے سوال کیا ہے:

جواں میرے اگر دین محمد کے سپاہی ہیں
اگر تسبیح اور تقدیس ہے ان کی زبانوں پر
تو اس سے ہول کیوں ہے اہلِ مغرب کو؟

پھر نظم میں بوسینا کی جو موجودہ صورتِ حال ہے، اس کی تباہیوں، بربادیوں اور اس کے اسباب کی بہترین منظر کشی اس نظم میں کی ہے نیز اس کے شاندار ماضی پر اپنے خیالات وافکار کے ذریعے روشنی ڈالی ہے اور ان کے اس المناک عذاب کے ذریعے قوم کے نوجوانوں کو پیغام بھی دیا ہے، جس میں بھڑکتے ہوئے عشق کے فیصلہ کن شعلوں کی شدت پوری طرح محسوس کی جاسکتی ہے۔

سرجیوں ہمیں آواز دیتا ہے
کہ غیرت کی رمق باقی ہے گر ملت کے سینے میں
تو مغرب کے بھیانک رقص پر بیدار ہو جائے
وہ خنجر توڑ دے ان بازوؤں کے ٹکڑے کر ڈالے
جو مظلوموں کے خوں سے تر بتر ہیں
عزیزو! پھر اسی ضرب ید اللہی کی حاجت ہے
پڑے جن سے شگاف ان پر بربریت کی فصیلوں میں
جو افرنگی و صیہونی تمناؤں کا محور ہے
خموشی، بے بسی ،افسردگی اب جرم ہے یارو
تم اپنے بھائیوں بہنوں کی حرمت کے محافظ گر نہیں ہوتے
تو یہ مغرب کے تثلیثی درندے تم کو بھی نابود کر دیں گے

یہاں پر سرجیوں یا بوسینا ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، مگر اس علامت کے پردے میں اگر

دیکھیں تو اندازہ ہوگا پوری دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ ہو رہے ظلم و ستم کے پس منظر میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنی ملت اور اس کے نوجوانوں کو بغیر کسی مفاد اور لاگ لپٹ کے ایک خاص پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔لہذا ان کی دیگر نظموں کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی نظمیں ایک ایسے دھڑکتے ہوئے حساس دل کی آواز ہیں، جو ایک زندہ قوم کے ساتھ ظلم و ستم اور صیہونی طاقتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔یہی وجہ ہے ان کی نظموں میں قوم و ملت کی تڑپ ہر جگہ نمایاں ہے۔عبدالباری نے ملت کے درد و غم کو اپنی شاعری میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کا قاری تڑپ اٹھتا ہے اور وہ اس کی اسی رو اور جذبات میں ہر طرح سے بہنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔یہ ایک پر عزم اور حوصلہ مند انسان کی جرأت ہی ہوسکتی جو اپنی ملت کو جبر و تشدد اور اس کے لٹیروں سے بچانے کے لئے اپنی نظموں میں ان سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالباری صاحب کی کوئی بھی نظم ہو،خواہ وہ آسام میں مسلمانوں کے خلاف ہو رہے ظلم و ستم کے پس منظر میں کہی گئی نظم ''ناعاقبت اندیش انسانو!'' ہو یا مسلم تہذیب پر مغربی تہذیب و تمدن،استعمار اور فاشزم ،سامراجی درندگی،امریکی دہشت گردی یا پھر خود ہندوستان میں مسلم کش فسادات کے تباہ کن اثرات کے موضوعات پر لکھی ہوئی نظمیں '' میری تہذیب کیوں محروم ہے خارا شگافی سے''،''استعمار کی عفریت''،''تلخیاں''،''افغان غازی سرخرو ہوگا''،''میرا ہندوستان جنت نشاں''،''پورب کا مکیں''،''رگِ نازک کو چھیڑا ہے''،وغیرہ کا کینوس ملت اسلامیہ اور اس کے آفاقی پیغامات کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔دراصل ڈاکٹر سید عبدالباری جس نظامِ حیات کی ترجمانی اپنی شاعری میں کرتے ہیں وہ کوئی انسانوں کا بنایا ہوا نظام نہیں ہے بلکہ وہ اللہ کا بنایا ہوا آسمانی قانون ہے،اس کی بنیاد ایمان و ایقان پر ہے اور اس کی بنیاد میں یہ بات بھی شامل ہے کہ دنیا کی تمام قوموں کی قیادت اور اس کی فلاح و بہبود اور سلامتی اسلام میں مخفی ہے۔لہذا مسلمانوں کی سلامتی اگر خطرے میں ہے اور ان کے وجود کو مٹانے کی کوششیں دن بہ دن عام ہوتی جارہی ہیں، جیسا کہ آج کل ہم ٹی وی چینلوں میں دیکھ رہے ہیں،ذاکر نائک اور اسدالدین اویسی پر کس طرح لوگ حملہ آور ہو رہے ہیں دراصل یہ لوگ اسلام اور اسکی تہذیب کے علم بردار ہیں۔ان کے خلاف کی جارہی سازشوں سے ان کے وجود پر آنچ نہیں آسکتی۔لہذا اسلام کے وجود کو مٹانے کے لئے سب سے پہلے ان کی آواز کو دبانے کی کوشش کی جارہی ہے۔اس لئے دشمنانِ اسلام انہیں اپنے جال میں پھنسا رہے ہیں۔اس فتنہ وفساد کے خلاف صف بندی اس عہد میں ایک فطری تقاضا ہے، جسے پورا کرنے میں کسی بھی طرح کی لاپرواہی نہیں کرنی چاہیے۔کیوں

کہ فتنہ فساد قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنی نظموں میں انہیں سب موضوعات کو پیش کیا ہے اور ملت اسلامیہ کے تحفظ کے لئے ہر ممکن قدم اٹھانے کے لئے لوگوں کو بیدار کرتے ہوئے بڑے بے باک لہجے میں فرماتے ہیں:

تشدد باعث نفرت ،تشدد قابل لعنت
مگر اپنی حفاظت آپ کرنا بھی ضروری ہے
اگر ہو در پے آزاری کوئی تو در گزر کیجئے
مٹانے پر ہو آمادہ تو چکنا چور کیجئے

ان مصرعوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ عہد میں جو صورتِ حال ہے، اگر آج ڈاکٹر سید عبدالباری موجود ہوتے تو ان پر بھی ذاکر نائک کی طرح نوجوانوں کو اکسانے کا الزام عائد کر کے دہشت گرد ثابت کر دیا گیا ہوتا۔ان کی تمام تر نظمیں ایسی ہی ہیں جن میں اسلام کے تحفظ کے لئے ایسے مضامین پیش کئے گئے ہیں جن کی بنیاد حکومت کو انہیں دہشت گرد ثابت کرنے میں کوئی بھی دشواری پیش نہ آتی۔اس بے باکی کا احساس انہیں بھی تھا،مگر جب دنیا کے ہر خطے میں حق کے علم برادران کی آواز میں آواز ملاتے ہیں تو ان کے لہجے میں اور بھی اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔جس کے سبب وہ اور بھی اطمینان اور بے باکی سے نظمیں لکھنے لگتے ہیں۔عوام کی بیداری،ان کی حمایت اور اتحاد سے شبنم سبحانی کو اب دنیا میں پھیلی ہوئی بدامنی اور ظلمت وستم کے خاتمے کے آثار نظر آنے لگتے ہیں،اس طرح کے جذبات کے اظہار میں ان کی نظموں میں ایک طرح کی تلخی محسوس ہوتی ہے اور ایک نئی طلوع صبح کا احساس ہونے لگتا ہے۔ان کی نظم ''تلخیاں'' کے آخری مصرعے ان کی اسی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں:

میں ہوں ظلمت کا باغی، میرے گیت میں
ظلمتوں سے بغاوت کا طوفان ہے
ان خزاؤں کے دشمن مرے گیت ہیں
جن سے سارا چمن آج ویران ہے
میرے سینے میں، مرے لب پہ اک آگ ہے
رات کی جس سے زنجیر گل جائے گی
آئے گی صبح تابندہ پھر آئے گی

وہ جانتے ہیں اس انقلاب کا راستہ اور منزلِ مقصود کی قدم بوسی کچھ آسان بات نہیں۔اس میں ابھی اور بھی مرحلہ ہائے دار ورسن آنے ہیں۔لیکن عالم اسلام میں جو موجودہ ہلچل اور بیداری پیدا ہوئی ہے،احیاء اور اقامت دین کی جو امنگ جاگ اٹھی ہے،اس کے بعد اب یہ طوفان کچھ دیر کے لئے پھر دب تو سکتا ہے مگر تھمنے والا ہرگز نہیں ہے۔اس لئے اپنی ایک نظم ''عرب اٹھیں یا نہ اٹھیں عالم اسلام اٹھنے والا ہے'' میں بڑے وثوق سے اسلام کی تابندگی پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔یہ نظم انہوں نے سلطان صلاح الدین ایوبی کے نام لکھی ہے،جس میں انہوں نے صلاح الدین کی بہادری،شجاعت اور اس کی اسلامی خدمات کا قصیدہ پیش کیا ہے اور افسوس ظاہر کیا ہے کہ ہم صلاح الدین جیسے جاں باز کو بھول بیٹھے ہیں اور خود عرب بھی صلاح الدین کا نام لینے سے گریز کرتا ہے،جب کہ اس عہد میں مغرب اسلام پر بار ہا وار کرتا آرہا ہے اور وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آنے والا ہے۔ایسے میں ہم صلاح الدین ایوبی کی ہمت وشجاعت کو اگر اپنالیں تو اسلام پر کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا جاسکتا۔یہ نظم کافی طویل ہے،اس کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

رواں ہے قافلہ ارض و سما کا بے نیازی سے
دلوں میں سوز شمعوں میں اجالا اب نہیں باقی
مسلسل ہو رہی ہے آج یلغار مغرب کی
فضا میں شور ہے ہر سمت مظلوموں کی چیخوں کا
بہت عقل و خرد کے قمقمے ہر سمت روشن ہیں
جدھر دیکھو ادھر دانشوری کا شور و غوغا ہے
مگر افسوس کیوں اعصاب پر اک خوف طاری ہے
زباں بھی ہے، قلم بھی ہے، جبہ و دستار بھی لیکن
یہ مشرق آج کیوں بے دست و پا ہے بے سہارا ہے
عرب خود اب تمہارا نام لینے سے گریزاں ہیں
جدھر دیکھو ادھر مفلوج انسانوں کا ریوڑ ہے
جنہیں امن واماں کی بھیک اب مغرب سے ملتی ہے
غلاموں کو پیامِ حریت وہ لوگ دیتے ہیں

سراپا ظلم و استبداد ہیں جو روئے گیتی پر
صلاح الدین ملت کے لئے تم اک علامت ہو
شجاعت، عزم راسخ، حوصلہ مندی تہور کی
تمہارے نقش پا پر قافلے محوِ سفر ہیں پھر
کھڑی ہیں پھر چٹانیں سر اٹھائے عزم و ہمت کی
ہے اک طوفان برپا آرزو مندی کی لہروں سے
تمہارے جانشیں لو اٹھ پڑے ملت کے پہلو سے
جو پھر اس پنجہ صیہونیت کو توڑ ڈالیں گے
جو آمادہ ہے ملت کی رگِ جاں کاٹ دینے پر
یقیناً سرفروشی کی گھڑی وہ آنے والی ہے
عرب اٹھیں نہ اٹھیں عالمِ اسلام اٹھے گا

ڈاکٹر عبدالباری شبنم سبحانی اپنی نظم ''منزلِ حیات'' میں انسانی زندگی کی مقصدیت اور نسل نو کی بے راہ روی کے تناظر میں بعض استفہامیہ پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے زندگی کی تمام بے چینیوں اور بیقراریوں کو موضوع بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ زندگی بے لگام کیوں ہے ؟
یہ کاوشِ صبح و شام کیا ہے ؟
نفس نفس تلخ کام کیوں ہے ؟
سیاسی شب ہے یہ تو صبح بہار کیا ہے ؟
کہیں خزاں ہے کہیں بہاراں
کہیں ہیں کانٹے کہیں ہیں کلیاں
کہیں بیاباں کہیں گلستاں
فضائے عالم میں قابل اعتبار کیا ہے ؟

ڈاکٹر سید عبدالباری اپنی تہذیب کے دلدادہ ہیں اور وہ اس سے بے حد محبت کرتے ہیں ۔مگر اس کے زوال سے وہ کافی افسردہ بھی نظر آتے ہیں ۔وہ اپنی تہذیب و ثقافت کے زوال، اس کی شناخت، اس کی تاریخ اور موجودہ مغربی تمدن کی روشنی میں قدروں کے زوال پر اپنے افسوس کا اظہار ''میری تہذیب کیوں مرحوم ہے خارا شگافی سے'' میں ایک جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور چاہتے ہیں ان کی تہذیب ایک بار پھر ملک و ملت کے لوگوں پر مسلط ہو جائے ۔نظم کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں ۔

مگر جو راہ کو مسدود کر دے چلنے والوں پر
مگر پہروں بٹھائے بڑھ کے جو تازہ ہواؤں پر
مگر جو سلب آزادی کرے آزاد بندوں کی
وہ دشمن نوعِ انساں کا ہے دہشت گرد ظالم ہے
یقیناً اس سے پنجہ آزمائی اک فریضہ ہے
زمیں کے گوشے گوشے سے خدا کے سر پھرے بندے
مسلسل اٹھ رہے ہیں ظالموں کا سر کچلنے کو
صدائے حق جو اٹھی ہے دبا اس کو نہ پائیں گے
یہ چیخیں مغربی تہذیب کے مکروہ جبڑوں کی
نہ غارت ہوگا انساں کا سکوں اب روئے گیتی پر
یہ ابلیسی تمدن خاک میں ملنے ہی والا ہے

ڈاکٹر سید عبدالباری نے ''اورنگ زیب'' کے عنوان سے بھی ایک نظم لکھی ہے، جس میں انہوں نے اورنگ زیب سے متعلق جو غلط فہمیاں تاریخ میں درج ہو چکیں ہیں اس کا ازالہ کیا ہے۔ان کے مجموعے میں ایسی کئی نظمیں ہیں جو کسی شخصیت سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں ان میں ایک نظم یہ بھی ہے۔انہوں نے اس نظم میں اورنگ زیب کی بہادری اور دریا دلی کو نظم کے پیرائے میں پیش کیا ہے اور اس کے بعد تاریخ میں اس کے خلاف جو تعصب برتا گیا ہے اس کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:

وہ ہنس کر ہاتھ فتنوں سے ملاتا بے نیازی سے
سدا سرشار رہتا تھا یقینِ سرفرازی سے

مگر اس دور کے اکثر مورخ اس کے دشمن ہیں
تعصب اور جلن سے کیوں یہ سینے ان کے گلخن ہیں
یہ ان کا نام کیوں لیتے ہیں مصروفِ فغاں ہو کر
یہ اس کا ذکر کیوں کرتے ہیں آخر سرگراں ہو کر
انہوں نے فوقیت ذروں کو دی ہے مہر تاباں پر
اڑاتے ہیں غبار جہل اس کے روئے تاباں پر

ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب کی نظریں بین الاقوامی مسائل پر بھی ٹکی رہتی تھیں اور وہ بھی صرف ایک خاص زاویہ سے پورے عالم کے مسائل کو دیکھتے ہیں۔ان کے اس مجموعے میں کئی ایسی نظمیں ہیں جن کا تعلق بین الاقوامی مسائل سے ہے لیکن سب کے موضوعات کہیں نہ کہیں اسلامی فکر و نظریات سے جڑے ہوئے ہیں۔جس کی وضاحت جیسے جیسے ترتیب وار نظمیں آتی رہیں گی اس باب میں ہوتی رہے گی۔انہوں نے ایران سے متاثر ہو کر دو نظمیں تخلیق کی ہیں۔پہلی نظم وہ ہے جب ۱۹۵۵ء میں ایران پر حملہ ہوا تھا،اس وقت ڈاکٹر مصداق کی قیادت میں جو عارضی انقلاب برپا ہوا تھا اور امریکہ کی فوج کو شکست ہوئی تھی اس نظم میں اسی موضوع کو پیش کیا گیا ہے۔

زندگی سیل خوں میں نہائی ہوئی
مکر و سازش کے طوفاں سے ٹکرا گئی
سر کے بل گر پڑے آمریت کے بت
ظلمت شب مٹی لو سحر آ گئی
کوہِ البرز کی رفعتوں کی قسم
زندگی ظلمتوں سے بہت دور ہے
سرخ طوفان کو روکنے کے لئے
ہر بہادر جواں آج منصور ہے

دوسری نظم جو انہوں نے ایرانی انقلاب کی ناکامی پر لکھی ہے۔اس نظم کا عنوان ''ایران کے ناکام انقلاب

کے بعد'' ہے۔نہایت نرم و نازک لہجے میں عبدالباری صاحب نے اس میں اپنے غم کا اظہار کیا ہے۔ان کی نظموں میں جو روانی اور سادگی پائی جاتی ہے وہ یہاں بھی کارفرما ہے۔نظم کا آخری بند دیکھئے:

ظلمت شب نے پھر ہاتھ پھیلا دیئے
کارواں راہ سے دور ہونے لگے
پھر شبستاں میں شمعیں سسکنے لگیں
خام عقل و خرد چور ہونے لگے
ارض ایراں ترے گل کدوں کی قسم
اک بہارِ شفق رنگ پھر آئے گی
تازگی روشنی زندگی چار سو
جلد ہی روئے گیتی پر چھا جائے گی

یہ نظم ان کی ابتدائی نظموں میں سے ایک ہے جو ۱۹۵۵ء میں نئی نسلیں میں شائع ہوئی تھی۔اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے فکر و فن میں کتنی پختگی ہے،جس سے ان کی ابتدائی نظم ہی اتنی بلند آہنگ اور معنی خیز معلوم پڑتی ہے۔ان کی نظم ''استعمار کا عفریت''جس میں انہوں نے ہندوستانی تہذیب پر مغربی تہذیب کا جو تسلط غالب ہو گیا ہے، اس کو موضوع بنا کر تمام فنی لوازمات کے ساتھ نظم میں پیش کیا ہے۔انہیں اپنی تہذیب سے بے حد لگاؤ ہے، مگر موجودہ عہد میں مغربی تہذیب نے لوگوں کو اپنے فریب میں لے کر انہیں بہکانے کا جو کام کیا ہے یہ نظم اسی کا احاطہ کرتی ہے اور استعماریت نے ہمارے ملک اور تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے، عبدالباری شبنم سبحانی نے اس درد کا ذکر اس نظم میں کیا ہے۔انہوں نے استعماریت کو ایک سانپ کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے جو اپنے زہر اور پھن کے ذریعے ہماری صدیوں کی تہذیب وثقافت پر وار کرتا ہے اور اپنے پھن کے ذریعے انہیں اپنے فریب میں لے کر اقدار و عقائد پر وار کرتا ہے، ملک میں فاشزم کی چنگاریوں کو بھڑکا کر فساد برپا کرواتا ہے اور یہاں کی قومی یکجہتی کو اپنے فریب سے کمزور کرتا ہے۔غرض نئے نئے انداز سے یہ انسانوں کو اپنے دام میں لاکر انہیں حیوان بنانے کی کوشش کرتا ہے۔نظم کے آخر میں عبدالباری صاحب نے ملک کے رہنماؤں اور نوجوانوں سے اپیل کی ہے کہ ہمارا ملک آزاد ہو گیا ہے، مگر اب بھی ہم ذہنی طور پر استعماریت کے غلام ہیں لہذا اب ہمیں اس سے بھی آزاد ہو جانا چاہئے۔یہ نظم آزاد ہیئت میں لکھی گئی ہے

اور یہ ان کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے:

یہ آخر کیوں مرے اعصاب پر تہذیب مغرب کا تسلط ہے
میں استعمار کا صدیوں سے دشمن ہوں
مگر دیوانہ کیوں ہوں اس تمدن کا
جو استعمار کا جنم داتا ہے
اسی نے ایک ایسے اژدہے کی پرورش کی ہے
کہ جس کے ان گنت پھن میں جنہیں گننا بھی مشکل ہے
یہ استبداد کا عفریت انساں پر انوکھے جبر کرتا ہے
عجب فتنے اٹھاتا ہے
کبھی فاشزم کی چنگاریوں کا شعلہ جوالہ کرتا ہے
کبھی اقوام کو محروم کرتا ہے یہ اقدار و عقائد سے
ثقافت کی طہارت سے شرافت کی نظامت سے
کبھی ڈکٹیٹروں سے تخت جمہوری سجاتا ہے
کبھی انسان کو یہ زندگی کے حق سے محروم کرتا ہے
نرالے فارمولے ظلم کے ایجاد کرتا ہے
نرالے ضابطے گڑھتا ہے یہ انساں کو حیوان بنانے میں
بہ ظاہر فرد کو آزاد خود مختار کہتا ہے
مزاجاً یہ مگر ہے کلیت سازی کا شیدائی
مرے ہندوستاں جنت نشاں کو بھی
کیا ہے مدتوں پایاب استعمار مغرب نے
ہم اب آزاد بے شک ہیں
ستم ہے حکمراں ان بے شعوروں کو بنایا ہے
جو ہیں پروردۂ آغوش استعمار مدت سے
ضرورت ہے کہ ہم اب واقعی آزاد و خود مختار ہو جائیں
خودی خود اعتمادی کی حرارت اور قوت سے

شکستہ کردیں استعمار کے ہر ایک بندھن کو

یہ نظم کافی طویل ہے مگر ہر مصرعہ دوسرے مصرعے سے اس طرح گٹھا ہوا ہے کہ اگر نظم کا کچھ حصہ اس میں سے حذب کر دیں تو نظم سمجھ میں آنے سے قاصر رہے گی ۔ یہ نظم کیفی اعظمی کی نظم ''سانپ'' کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔مگر اس میں کیفی جیسی بلند آہنگی اور فنی پختگی نہیں ۔اس نظم میں عبدالباری نے سیدھے اور سپاٹ لفظوں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔کہیں کہیں پر علامتوں کا بھی استعمال کیا ہے مگر وہ قاری کو الجھن میں ڈالنے کے بجائے آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ بہر حال یہ موضوع اور فن کے اعتبار سے ایک کامیاب نظم ہے جسے اعلیٰ درجے کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری ملک کے سیاسی واقعات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے ۔وہ حساس طبعیت کے مالک تھے ۔اس لئے ملک میں جب کہیں بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ،جس سے انسانیت کو گہری چوٹ پہنچتی ہو،اس وقت وہ بھی تڑپ اٹھتے تھے اور اس موضوع پر نثر ہو یا نظم کسی نہ کسی صورت میں خامہ فرسائی ضرور کرتے تھے ۔ایسا ہی ایک واقعہ ۱۹۷۴ء میں پیش آیا جب محترمہ اندرا گاندھی ملک کی وزیرِ اعظم تھیں ۔پورے ملک میں خوف اور دہشت کا عالم تھا ۔حکومت سبھی مردوں کو جبراً نامرد بنانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی ۔عبدالباری صاحب بھی اس کے شکار ہوتے ہوتے بچے ۔دراصل اس وقت وہ بھی سرکاری ملازم تھے اور ان کو نس بندی کا آپریشن کرانا لازمی تھا،مگر انہوں نے اپنے کسی جان پہچان والے ڈاکٹر سے جعلی سرٹیفیکٹ بنوا کر پیش کر دیا جس سے وہ بچ گئے ۔مگر اس واقعے سے وہ کافی متاثر ہوئے ۔اس کے خلاف سلطان پور میں زبردست احتجاج ہوا۔اس وقت عبدالباری شبنم سبحانی سلطان پور میں ہی درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے ،اس احتجاج کی انہوں نے بھی کھل کر حمایت کی تھی ۔ملک میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہو چکی تھی ،اس کے باوجود یہاں احتجاج تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔جس میں کئی لوگ پولیس کی گولیوں کا شکار بھی ہوئے ۔اس موقعے پر شہید ہونے والے پانچ مسلم نوجوانوں کی تدفین سلطان پور میں ہوئی تھی ۔پورے شہر اور قبرستان میں پولیس کی زبردست فورس موجود تھی ،کسی کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی ۔صرف چند رشتے داروں ،شہر کے بڑے اہم رہنماؤں اور آفسروں کی وہاں پہنچ ممکن تھی ۔اس واقعے نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ڈاکٹر سید عبدالباری جو ایک دردمند دل اور حساس طبیعت کے مالک تھے وہ بھی اس واقعے سے متاثر ہو کر ''یہ پانچ لاشیں'' کے عنوان سے ایک نظم تخلیق کی جو اس پورے منظر نامے کا احاطہ کرتی ہے۔اس وقت خوف و ہراس کا جو عالم تھا،اس نظم میں اس واقعے کی بہترین ترجمانی پڑھنے کو ملتی ہے۔نظم کے چند بند حاضر ہیں:

یہ پانچ لاشیں
ہیں ان جیالوں کی جو چٹانوں سے جا کے ٹکرا گئے ہیں یارو!
جنھوں نے دہلیز پر ستم کی
نہ سر جھکایا نہ ہار مانی
فقط اسی جرم کی سزا میں
اس عہد جمہوریت کے چنگیز
ان کو جینے کے حق سے محروم کر چکے ہیں
مگر وہ مر کر تو بیکراں ہو گئے ہیں یارو!
عجیب عالم عجب اداسی خموشی
محیط ہے گورِ کسمپرساں میں چار جانب
سپاہیوں کے مہیب جوتوں کی چاپ سے کچھ
سکوت کا تار ٹوٹا
ہلاکوؤں کے گریہ گھوڑوں کی ہنہناہٹ
فضاؤں پر برق بے اماں بن کے گر رہی ہے
کسی بھی لب پر فغاں نہیں ہے
نہیں کسی کو یہاں پہ اذنِ کلام یارو

نظم کی پوری فضا میں غم واندوہ کی لہر غالب ہے اور پوری نظم درد وغم کے عالم میں ڈوبی ہوئی معلوم پڑتی ہے۔غرض ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب جو تاثر اس کلام میں پیش کرنا چاہتے تھے،اس میں وہ پوری طرح سے کامیاب ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس واقعے کے بعد انہوں نے ایک نظم عالمی سطح پر ہوئے ہولناک واقعے پر قلم بند کی ہے، یہ نظم ۲۰۰۰ء میں ہوئے امریکی حملے کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔اس نظم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس حملے سے کافی خوش ہیں اور ان کی خوشی کی چمک ان کی اس نظم میں صاف ظاہر ہوتی ہے۔نظم کا عنوان ''تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی'' ہے۔اس نظم میں انہوں نے علامہ اقبال کے ایک مصرعے کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بات واضح کی ہے کہ شاعرِ مشرق نے جو پیش گوئی کی تھی آج وہ صحیح ثابت ہوئی ہے۔اس نظم میں شاعر نے امریکی دہشت گردی اور ان کے ذریعے عراق،ایران اور افغانستان

میں کئی گئی خون ریزی کو خاص موضوع بنایا ہے۔امریکہ جو خود کو بہت مغرور سمجھتا تھا اور اپنے سپر پاور کو ناجائز طریقے سے استعمال کر کے انسانیت کا قتل کر رہا تھا۔اب اس کا یہی غرور چور چور ہو چکا ہے اور اس کی ساری حقیقتیں لوگوں پر واضح ہو چکی ہیں۔اس نظم میں انہوں نے علامتوں کا سہارا لے کر اپنی بات کو موثر اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔یہ نظم آزاد فارم میں لکھی گئی ہے،روانی اور سلاست اس نظم کا خاص عنصر ہے۔یہ نظم ایک طرح سے امریکہ کو ان کی تہذیبی شکست پر غیرت دلاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے،نظم کافی طویل ہے چند مصرعے پیش خدمت ہیں:

یہ اہل مغرب کو شاعرِ حق کی وارننگ تھی
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
حکیم مشرق کی پیش گوئی ایک مدت گزر چکی ہے
فضائے عالم دھواں دھواں ہے
یہ جنگ کرتے ہیں امن کے تاجدار بن کر
یہ زہر دیتے ہیں زندگی کے امین بن کر
مگر یہ اب بے لباس کیوں ہیں
نہیں مغرب کے جسم پر ایک تار باقی
ہے ان کی وحشت پہ ایک عالم غریق حیرت
حکیم مشرق نے سچ کہا تھا
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اس نظم میں انہوں نے اس طرف اشارہ کیا ہے،جس پر پوری مغربی تہذیب ٹکی ہوئی یعنی الحاد،کفریت اور خدا سے بیزاری جو وہاں کی تہذیب کا خاص وصف ہے۔اسی لئے آخر میں انہوں نے کہا ہے جو شاخ نازک پہ آشیانہ تعمیر کر رہے ہیں وہ ایک نہ ایک دن مٹ جائے گا اس لئے توحید کی شاخ پر اگر آشیانہ تعمیر کرتے تو یقیناً وہ پائدار ہوتا۔

ہندوستان کی تاریخ رہی ہے یہاں مسلسل فرقہ وارانہ فساد ہوتے رہتے ہیں اور خوب قتل وغارت گری ہوتی ہے۔جس میں لاکھوں بے قصور انسانوں کا خون بہتا ہے اور انسانیت کا قتل ہوتا ہے۔ہندوستان میں فرقہ

وارانہ فسادات ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے پوری جمہوریت کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ بابری مسجد کی شہادت اور ۲۰۰۲ء میں گجرات میں جو قتلِ عام ہوا ہے، اس سے پورا ملک دہشت میں آ گیا۔ مگر پھر بھی کسی کو انصاف نہیں مل سکا بلکہ جو انسانیت کے قاتل تھے وہ پورے ملک کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان فسادات اور خون ریزی کی وجہ سے ہمارا ملک کئی سال پیچھے چلا جاتا ہے، مگر یہاں پر فسادات ہوتے نہیں ہیں بلکہ حکومت اور تاج وتخت کے بھوکے لوگ اپنے ذاتی مفاد کے لئے یہاں آئے دن فرقہ وارانہ فساد برپا کروا کر اپنی سیاسی روٹیاں سینکتے ہیں، جس سے ملک میں معاشی بدحالی اور بے روزگاری روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے، مگر اس میں صرف عوام کا نقصان ہے۔ سیاسی رہنماؤں کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے۔ اسی پس منظر میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے ایک طنزیہ نظم ''مرا ہندوستان جنت نشاں ہے'' گجرات کے فساد سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ اس نظم میں انہوں نے ہندوستان کی عظمت اور لہلاتے ہوئے کھیتوں اور تہذیب وثقافت کی تعریف کی ہے۔ دوسرے حصے میں وہ یہاں برپا ہونے والے فسادات سے جو نقصانات ہوئے ہیں ان کا ذکر کیا ہے اور نظم کے تیسرے حصے میں افسوس ظاہر کیا ہے کہ ملک میں امن وآشتی کا اب نام ونشان نہیں رہا، ہر طرف چیخ وپکار ہے۔ کبھی جو ہمارا ملک جنت نشاں تھا وہ اب نہیں رہا۔ آخر میں یہ پیغام دیا ہے کہ سبھی انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں پھر بھی لوگوں میں اتنی تفریق کیوں ہے۔ وہ ملک جس کی دنیا میں ہندو مسلم بھائی چارگی اور قومی یکجہتی کی اعلیٰ مثال پیش کی جاتی تھی اب یہ جذبہ یہاں سے ناپید ہو چکا ہے۔

یہی کیا ہے مرا ہندوستاں جنت نشاں یارب
اسی وادی میں امن وشانتی کے دوت آئے تھے
یہیں نغمات گونجے تھے
کہ سارے ابنِ آدم ایک کنبہ اک گھرانا ہیں
جو اس دھرتی پہ ہیں سب ایک ہی سورج کی کرنیں ہیں
مگر یہ بیچ میں یہ کیسی چیخیں ہیں
گھروں کے بیچ میں یہ کیسی دیواریں کھڑی ہیں اب
لبوں پر ہر آدمی ہر آدمی میں اجنبیت ہے
الٰہی میں پریشاں ہوں کدھر جاؤں
کہاں ڈھونڈوں میں اس ہندوستاں جنت نشاں کو

اس نظم میں عبدالباری شبنم سبحانی نے ہندوستان کی صدیوں سے چلی آرہی تہذیب اوراس کی عظمت کی تاریخ کو دہرایا ہے اوراپنے شاندار ماضی کو یاد کرتے ہوئے پھراسی کی تلاش میں سرگرداں نظرآتے ہیں یہ نظم موضوع کے اعتبار سے بہترین نظم ہے،جس میں انہوں نے اپنی فنی مہارت کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری ایک دین دار انسان تھےاوراپنے محبوبؐ سے بے حد محبت کرتے تھے،آپؐ کے لئے وہ اپنی جان تک نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتے۔اس لئے جب ڈینمارک میں کسی گستاخ نے عزت مآبؐ کا کارٹون بنایا تو وہ تڑپ اٹھے،ان سے یہ گستاخی برداشت نہ ہوسکی انہوں نے اس موضوع پر بھی ’’رگِ نازک کو چھیڑا ہے‘‘ کے عنوان سے ایک نظم قلم بند کی،جس میں انہوں نے مغربی تہذیب کی پراگندگی پراپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے،لفظوں کے ذریعے شاعری میں زبردست پھٹکار لگائی ہے اوراس گستاخ کو انجام سے باخبر بھی کیا ہے۔اس نظم میں انہوں نے مشرقی تہذیب پر استعماریت کا جوغلبہ ہےاور مغربی تہذیب جس کو اہلِ مغرب ہم پر جبراً تھوپنا چاہتے ہیں اس کوقبول کرنے سے انکار کیا ہے جس کے وہ سخت مخالف بھی تھے:

سفیہو !تم نے پھر مشرق کی نازک رگ کو چھیڑا ہے
بہت مشرق میں تم سوداگری کرنے کو آتے ہو
مگر اس بار تم لائے ہو زہر آلود نشتر بھی
تمہاری ہی رگوں میں ہوگا اب پیوست یہ نشتر
کہ اس کی آبرو کو تم نے للکارا ہے اب کھل کر
جو ہے انسان کے مجد و شرف کا نقطۂ آخر
جسے تسلیم دنیا کر چکی ہے رحمت عالم
اسی پر تم نے تھوکا ہے
مگر یہ سن لو سورج چاند پر تھوکا ہوا خود منہ پہ آتا ہے

اس نظم میں ان کا غصہ صاف واضح ہوتا ہے اور جب بھی مذہب اور اہلِ مغرب کی بات آتی ہے عبدالباری شبنم سبحانی کچھ زیادہ ہی جذباتی معلوم ہوتے ہیں۔وہ اہلِ مغرب اوراس کی تہذیب کے سخت خلاف ہیں جبکہ مشرقی تہذیب میں ہزاروں خامیاں ہونے کے باوجود وہ اسے سینے سے لگائے رکھنا چاہتے ہیں۔دراصل مغربی تہذیب انسان کو مذہب سے دور کر دیتی ہے اور عبدالباری کے لئے مذہب اوراس کے

اصول ونظریات سب کچھ ہیں اسی لئے جب کوئی ان کے ایمان وایقان پر حملہ کرتا ہے، وہ اس کا شدید ردِ عمل اپنی نظموں کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔

موجودہ عہد میں ملک کی جوصورتِ حال ہے اس سے ہر کوئی واقف ہے۔ ملک میں بھوک مری عام ہوگئی ہے کسان خودکشی کرنے پر مجبور ہوگیا ہے۔ لوگ ایک وقت کے کھانے کے لئے ترس رہیں۔ ملک کی آزادی کو اتنے سال بیت جانے کے بعد بھی لوگ فٹ پاتھ پر سونے کے لئے مجبور ہیں۔ ملک میں اعلیٰ تعلیم کا کوئی نظام نہیں ہے، جو سرکاری اسکول ہیں وہ اپنی بدحالی کا رونا رونے پر مجبور ہیں۔ ان سب کے علاوہ یہاں کرپشن بد عنوانی اپنے عروج پر ہے، اس ملک کے رہنما غریبوں کا خون چوس کر اپنی جیب بھر رہے ہیں، جس سے مہنگائی یہاں بڑھتی جارہی ہے اور نچلا طبقہ فاقہ کرنے پر مجبور ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نظم ''نئی جنگِ آزادی'' میں سبھی بدعنوانیوں سے آزاد کرانے کے لئے عوام کو خبردار کرتے ہیں اور پر جوش انداز میں یہ ہدایت دیتے ہیں کہ اب ہمیں کرپشن سے نجات پانے کے لئے ایک نئی جنگِ آزادی کی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ ابھی حال ہی میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ایک طالب علم کنہیا کمار نے جو نعرہ لگایا تھا اور اس نعرے سے ملک میں جو ہنگامہ برپا ہوا اس سے پورا ملک واقف ہے۔ کنہیا کمار نے بھی بھوک مری اور غربت سے آزادی کا نعرہ دیا تھا، جس کی پاداش میں اسے جیل کی چکی پیسنی پڑی تھی۔ مگر اس نعرے کے اثر سے سبھی مذہب وملت کے نوجوان ایک ساتھ مل کر ملک کو ایک نئی آزادی دینے کے لئے بیدار ہوگئے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کی یہ نظم بھی کنہیا کمار کے اسی نعرے کی حمایت کرتی ہے۔ یہ نظم تو اس واقعے سے کئی سال پہلے تخلیق ہو چکی تھی مگر جو خواب ڈاکٹر سید عبدالباری نے دیکھا تھا، وہ اب شرمندۂ تعبیر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نظم میں انہوں نے ملک کی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے یہاں کے نیتاؤں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے:

سن سنیتا دیس کی آزادی ہو گئی خواب و خیال
سارے ملکوں سے بدتر ہے دیس کا اپنے حال
نیتاؤں نے نوچ کے اس کو بنا دیا کنگال
ایک یہاں خوش حال اگر ہے لاکھوں ہیں کنگال
کب تک دیکھیں دیس کی اپنے آخر یہ بربادی
آؤ ہم سب مل کر چھیڑیں نئی جنگِ آزادی

اس بند کے بعد شبنم سبحانی نو جوانوں کے دل میں ان بزرگوں کی قربانی کی یادیں تازہ کرتے ہیں جنہوں نے جان پر کھیل کر اس ملک کو آزاد کرایا تھا۔ تاریخ کے ان جاں بازوں کو یاد کر کے وہ عوام کو بیدار کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور آخر کے بند میں فرماتے ہیں:

لوٹ رہے ہیں بیچ رہے ہیں ہندوستان کی عزت
نیتا پائیں دھن دولت، جنتا مہنگائی قلت
مریادا، اخلاق مٹ گیا باقی رہی نہ غیرت
لیکن ہر ظالم کی اب آنے والی ہے شامت
بستی بستی آگ لگی ہے سسک رہی آبادی
آؤ ہم سب مل کر چھیڑیں نئی جنگ آزادی

اس نظم کا پورا کا پور موضوع جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں ہوئے واقعے کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر کنہیا کمار نے جو انقلاب برپا کیا ہے وہ پوری طرح سے کامیاب ہوتا ہے تو اس کی کامیابی میں کچھ حصہ اس نظم کا بھی ہوگا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری یوں تو اسلامی نظریات کے پروردہ ہیں اور ان کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی نظریہ کارآمد نہیں ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے ملک کے سیاسی مسائل پر ایسی نظمیں لکھی ہیں، جن سے ملک کے نوجوانوں کو ایک مثبت پیغام ملتا ہے اور وہ ان کی آواز پر لبیک کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مذکورہ نظم ڈاکٹر سید عبدالباری کی بہترین نظم ہے اور فن کے لحاظ سے بھی یہ ایک مکمل نظم معلوم ہوتی ہے۔ جہاں عبدالباری نے سیاسی موضوعات اور ملک کی ترقی کے لئے نظمیں لکھی ہیں وہیں انہوں نے عورت کے تصور کو بھی اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے، جس کے بغیر ملک کی ترقی ناممکن ہے۔ یوں تو عورت کے موضوع پر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر بے شمار نظمیں وجود میں آئیں مگر اس میں مجاز کی نظم کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی اس کے بعد ساحر اور کیفی اعظمی نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا اور عورت کو گھر کی چہار دیواری سے نکال کر زندگی کے شعبہ ہائے حیات سے وابستہ کر دیا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے بھی عورت کی عظمت کو موضوع بنا کرا جاگر کیا ہے مگر وہ مشرقی تہذیب کے دائرے میں رہ کر ہی اس کی عظمت کے گیت گاتے ہیں اور اسی انداز میں اس کو تربیت بھی دیتے ہیں۔ اس موضوع پر ان کی دو نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں، جس میں پہلی ''خاتونِ مشرق کے نام'' اور دوسری ''خاتونِ مشرق'' ہے۔ عنوان کے اعتبار سے دونوں ایک ہی معلوم پڑتی ہیں مگر ''خاتونِ مشرق'' میں انہوں نے عورت کو مشرقی

تہذیب کے ڈھانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔اس نظم میں انہوں نے مشرقی عورت کے جو کردار و اوصاف اور اخلاق ہوتے ہیں ان کا احساس دلایا ہے اور آخر میں افسوس ظاہر کیا ہے، مشرقی عورتیں جو شرم وحیا اور عفت و عصمت کی پیکر ہوا کرتی تھیں نہ جانے اب کہاں معدوم ہوتی جارہی ہیں اور بے شرمی ان کا فیشن بنتا چلا جارہا ہے۔

مگر کیا انقلاب آیا ہے کہ اب
مجسم تیرگی خاتونِ مشرق
ذرا آئینہ میں رخ دیکھ اپنا
وہ رونق کیا ہوئی خاتونِ مشرق
یہ کیوں رخصت ہوئی کیا ماجرا ہے
تری رخشندگی خاتونِ مشرق
عجب ہے انقلابِ دہر کیا تھی
اور اب کیا ہو گئی خاتونِ مشرق
یہ کس نے ریزہ ریزہ کر دیا ہے
حریمِ مشرقی خاتونِ مشرق
خدا کا فضل ہو، مٹ جائے تیری
یہ از خود رفتگی خاتونِ مشرق

ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی کو عورت کی بڑھتی ہوئی بے حیائی اور مغربی طرزِ زندگی کا بے حد افسوس ہے۔مگر پھر بھی انہوں نے عورت کو ملک کی ترقی کے لئے ضروری سمجھا اور وہ بھی مجاز اور کیفی کی طرح عورت کو ہر میدان میں آگے دیکھنا چاہتے ہیں مگر اپنی مشرقی تہذیب وثقافت کے دائرے میں رہ کر وہ زندگی کی تمام منزلیں طے کریں۔عبدالباری صاحب مجاز کی طرح آنچل کو پرچم بنا کر عورت کی حیا پر آنچ نہیں آنے دینا چاہتے ہیں بلکہ وہ عورت کے مشرقی انداز اور اس کی دلکشی کو برقرار رکھ کر خاتونِ مشرق سے اس انداز میں خطاب کرتے ہیں:

خزاں کو بھی رشکِ بہاراں بنا دو
بیاں باں کو صحنِ گلستاں بنا دو

بکھیرو حیا اور غیرت کی کرنیں
رخ صبح عالم کو درخشاں بنا دو
جو تھک ہار بیٹھا رہِ زندگی میں
تم اس قافلے کو خراماں بنا دو
جو ہاتھ آئیں قسمت سے ذرے ہی تم کو
تو ذروں کو بھی مہرِ تاباں بنا دو
غلط ہے کہ نسوانیت فتنہ جو ہے
اسے دردِ انساں کا درماں بنا دو
نظر اپنی عفت بداماں بنا کر
یہ ساری فضا پاک داماں بنا دو
زمانے کا درد و الم بانٹ لو تم
زمانہ کو شاداں و فرحاں بنا دو
بڑا عصرِ حاضر پہ احسان ہوگا
اگر آج انساں کو انساں بنا دو

سید عبدالباری شبنم سبحانی کی یہ ایک خوبصورت نظم ہے، جسے انہوں نے بڑے شیریں لفظوں کے پیکر میں ڈھال کر پیش کیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جس طرح خواتین کے جذبات نرم و نازک ہوتے ہیں اسی طرح یہ نظم بھی نرم و نازک لہجے میں پیش کی گئی ہے۔ اس نظم میں شبنم سبحانی صاحب عورت کو ملک کی ترقی و کامرانی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے بڑی سنجیدگی و متانت اور شفقت و محبت سے انہیں ہدایت دیتے ہیں، جس سے ان کے دل میں یہ بات آسانی سے اتر سکے۔ جس طرح انہوں نے ملک کی خواتین کو اپنی نظم کا خاص موضوع بنایا ہے اسی طرح انہوں نے ملک کے نوجوانوں سے بھی خطاب کرتے ہوئے، ہدایت کے لئے متعدد نظمیں قلم بند کیں ہیں اور انہیں بھی ملک و ملت کی تعمیر و ترقی کے لئے بیدار کرتے ہوئے ان کا حوصلہ بلند کرتے ہیں۔ وہ نوجوانوں کے دل میں جوش و خروش پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

نسیمِ ناز ہو، پروردۂ بہار ہو تم
مرے چمن کے لئے وجہ افتخار ہو تم

ملے گی جس سے زمانے کو روشنی حیات
جبینِ وقت پہ ایک نقشِ تابدار ہو تم

ان سب موضوعات کے علاوہ ان کی اور بھی نظمیں ہیں جن میں انہوں نے عالمِ اسلام میں پیش آنے والے واقعات وحادثات کے ساتھ عام انسانی مسائل کا ماتم بھی کیا ہے۔ملک کے صوبے اتر پردیش کے کچھ علاقوں میں جب قحط پڑتا ہے اس وقت وہ ٹرپ اٹھتے ہیں یہ ایک حقیقی اسلامی شاعر کی بڑی شناخت ہے، ملک میں کہیں بھی بدحالی رونما ہوئی ہو وہ فوران اس کے درد وغم میں شریک ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری بھی قحط سے بدحال لوگوں کے غم میں شریک ہوتے ہیں اوراس سے متاثر ہو کر کہتے ہیں:

بادلو کیوں یہ ہراساں و پریشاں ہو تم
ہم کو جلنے دو کہ جلنا ہی مقدر ٹھہرا
آگ اگلتے ہوئے سورج سے نہ تم کھاؤ شکست
یہ زمیں جلتی جھلستی ہوئی مثلِ خاشاک
دیکھتی ہے تمہیں امید بھری نظروں سے
آسماں جنگ کا میدان نظر آتا ہے

اسی طرح وہ بہار کی خشک حالی پر اپنی نظم کا اختتام اس طرح کرتے ہیں
نہ جانے کتنے اداس چہروں پہ
زندگی کی جو آخری ایک رمق ہے باقی
اگر ذراسی بھی چوک تم سے ہوئی تو سن لو
بہت دنوں تک
نہ کوئی اس دیس میں اخوت کا نام لے گا
نہ ذکر الفت کہیں بھی ہوگا
تمہارے منھ پر
تمہاری تاریخ تھوک دے گی

ڈاکٹر سید عبدالباری کی نظموں کا مطالعہ کرنے سے ایک بات جو سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں کوئی ایسا نیا موضوع نہیں ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ کچھ نظمیں ایسی ہیں جن میں انہوں نے انوکھے اور البیلے نکات ضرور پیش کئے ہیں۔ مثال کے طور پر اسرائیل کے صدر کی ہندوستان آمد کے موقع پر انہوں نے ایک طویل نظم کہی اور بڑے خوبصورت انداز میں اس نظم کے موضوع کو نبھایا بھی ہے۔ اسرائیل ایک ایسا ملک ہے جس نے فلسطین کے مسلمانوں پر بے حد ظلم کیا ہے۔ جس کی مخالفت پوری دنیا میں ہوئی ہے۔ ایسے میں اس ملک کے صدر کی آمد پر خود کو میزبان کی حیثیت سے پیش کر کے حق کی بات کہنا ہمت کے ساتھ ساتھ ایک نیا تجربہ بھی ہے۔ نظم کا آغاز اور اختتام دونوں پیش خدمت ہے۔

آ گئے ہو تو بہت خوب، مجھے کہنا ہے
خوش رہو، دو میری مہمان نوازی کو دعا
جس نے اک ظلم کی چٹان کو دعوت دی ہے
جس کو ایک پیکر نخوت کی ضیافت کا ہے شوق

میرے مہمان سیہ کار یہ بہتر ہے کہ اب
جاؤ کفارہ گناہوں کا اداتم بھی کرو
ورنہ چھوڑے گا نہیں وقت بڑا ظالم ہے
جاؤ توریت کے اوراق الٹ کر دیکھو
قصۂ عاد پڑھو قصۂ فرعون پڑھو
ہند میں ظلم کی تائید نہ کی جائے گی اب
جاؤ مظلوم فلسطین کے آنسو پوچھو

ان کے زخموں کے لئے ہم سے یہ مرہم لے جاؤ
رحم و انصاف و محبت کا تبسم لے جاؤ

ڈاکٹر سید عبدالباری نے ایک اور نرالے موضوع پر نظم ''حناط'' تخلیق کی ہے، جس کا موضوع مصر کی ممی

بنانے کی روایت ہے۔اس نظم میں انہوں نے ممی بنانے والے کے دل پر کیا گزرتی ہے اور وہ اس فن کے بارے میں کیا سوچتے ہیں ان کے ذہن میں جو ممی بنا رہے ہیں اس کا مستقبل کیا ہوگا ان تمام سوالوں کا جواب انہوں نے اس نظم میں پیش کیا ہے۔ یہ نظم کافی طویل ہے آخر میں انہوں نے حناط کے خیالات کو پیش کرنے کے بعد موجودہ عہد کے انسانوں اور انسانیت سے عاری معاشرے پر سخت تنقید کی ہے۔اس نظم میں انہوں نے شاعر کی دوسری آواز کا استعمال کرتے ہوئے وہ حناط کی زبان میں کہتے ہیں

ہماری ممیاں بہتر ہیں ان بے روح چلتے پھرتے جسموں سے
جو اپنے بدنما زخموں کی یوں تشہیر کرتے ہیں
کہ جیسے مہکتے پھول ہوں گلزار ہستی کے

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری کی تمام نظموں کا مطالعہ کرنے سے ہمارے سامنے یہ بات واضح ہے کہ انہوں نے موضوعات کے اعتبار سے ایک حقیقی اسلامی اور تعمیری ادب کے نظریات کو اپنی نظموں میں فروغ دیتے ہوئے اپنے انسانی فریضے کو انجام دینے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ ساری دنیا کی انسانیت کے غم کو اپنا غم بنا کر پیش کرتے ہیں۔اسی لئے ان کی نظموں میں ہندوستان اور برِصغیر سے نکل کر دنیا کے مختلف ملکوں کے مسائل اور المیوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ ایک ایسی خاصیت ہے جس سے کوئی بھی شاعر یا ادیب محروم نہیں رہ سکتا خواہ وہ کسی بھی نظریہ سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہوں۔مگر بطورِ خاص تعمیری ادب کے شاعر یا ادیب اس سے بالکل بے نیاز نہیں ہو سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے عبدالباری شبنم سبحانی کی نظموں میں ہمیں چیچنیا، بوسینا، امریکہ، فلسطین، عراق، ایران، داعستان، مصر کے ساتھ برِصغیر کے سبھی انسانی مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ان سب کے علاوہ انہوں نے اپنے ملک سے خاص وابستگی قائم رکھی ایسا نہیں ہے وہ وزیر اعظم مودی کی طرح ملک کے مسائل چھوڑ کر صرف غیر ملکوں کا دورہ کرتے رہ گئے بلکہ انہوں نے اپنے ملک سے کبھی بھی اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا ہے اور یہاں کے مسائل پر انہوں نے سب سے زیادہ نظمیں کہی ہیں۔یہی وجہ ہے ان کی نظمیں ہماری تہذیب، تاریخ، اور ماضی کی روایات سے اپنا رشتہ استوار کئے ہوئے ہیں اسی سبب ان کی شاعری کو خاص طور سے نظم نگاری کے حوالے سے ماضی کی ایک دستاویز اور تہذیبی رنگا رنگی کا ایک خوب صورت منظر نامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ان کی نظموں میں ملک وملت کے درد وداغ، سوز وگداز، ساز اور آرزو وجستجو کے ساتھ عصری حسیت اور عصری آگہی کی بھرپور اور حقیقت پسندانہ عکاسی ملتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کی بیش تر نظمیں اسلامی فکر کے محور پر گھومتی ہیں مگر ان کی نظموں میں دورِ حاضر کی

معاشرتی روحانی واخلاقی ومعاشرتی حالت کا بہترین تجزیہ اوران پر بھرپور تنقید بھی ملتی ہے۔غرض شبنم سبحانی کی تمام نظموں میں سبھی عالمی سطح کے مسائلِ حیات کی عکاسی ملتی ہے،جس نے آج انسانی زندگی کو دشوار بنا کر رکھ دیا ہےاوراس کے لئے دردِ سربنے ہوئے ہیں۔انہوں نے اپنی نظموں میں صرف ماحول کی منظرکشی ہی نہیں کی ہے بلکہ ماحول میں جوخرابیاں پیدا ہوگئیں ہیں ان کی اصلاح بھی شاعری کے ذریعے کی ہے۔

آخر میں ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی کی نظموں کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر سید عبدالباری نے صنفِ نظم میں طبع آزمائی کر کے اسلامی ادب سے وابستہ سبھی شعرا کو ایک نئی راہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔اس سے پہلے اس حلقے میں زیادہ تر لوگ غزل پر ہی طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔اپنی اس کوشش میں وہ فنی طور پر زیادہ کامیاب تو نہیں ہو سکے مگر موضوعات کے عتبار سے ایک نئی راہ دکھانے میں وہ ضرور کامیاب دکھائی دے رہے ہیں۔ان باتوں کے پیشِ نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ڈاکٹر عبدالباری شبنم سبحانی شاعر کے ساتھ ساتھ ایک مصلح قوم اور رندنما محتسب ہیں۔وہ اپنی نظموں میں اپنا نقطۂ نظر قاری پر تھوپنے سے کبھی چوکتے نہیں ہیں ۔ان کی فکران کےفن کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی ہے کہ ان کی شاعری میں دلکشی اور حسن دونوں ایک ساتھ جلوہ افروز ہوتے ہوئے دکھتے ہیں۔ڈاکٹر عبدالباری صاحب کے پیشِ نظر ایک بلند مقصد ہے، جسے وہ اپنی نظموں کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ان کی نظموں میں شاعرانہ بصیرت اور مفکرانہ حسن پایا جاتا ہے۔انہیں اپنے نظریات وخیالات کی صحت میں ذرہ برابر شک نہیں ہے۔اس لئے ان کے یہاں وہی شان خوداعتمادی پائی جاتی ہے جو اقبال کی نظموں میں نظر آتی ہے۔لیکن ان کے لب و لہجے میں ایک طرح کی انفرادیت پائی جاتی ہے۔ان کا کلام ان کی شخصیت کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔ندرت خیال، پاکیزہ فکر،شدتِ جذبات اور بلندنظری کے ساتھ ساتھ زبان اور محاورے کی چاشنی پڑھنے والے کو مسحور کئے بغیر نہیں رہتی۔نظموں کا تسلسل اور روانی اشعار کی فصاحت وبلاغت اور کلام کا زورِاثر ہر جگہ نمایاں ہے۔ڈاکٹر عبدالباری نے اگر چہ ہئیت کے اعتبار سے کوئی خاص یا نیا تجربہ نہیں کیا ہے پھر بھی موضوعات کے اعتبار سے اردو نظم کا دامن تازہ فکر ومواد سے بھر دیا ہے۔ان کی نظموں کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انہوں نے اردو نظم کو بالخصوص تعمیری ادب کے حوالے سے توانا اور فکر انگیز صنف بنانے اوراسے آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

☆☆☆

حواشی

(۱)انتظار نعیم،فلیپ ،طرب خیز

(۲)ڈاکٹر سید عبدالباری،مقدمہ،فکر انگیز،ص۱۲

(۳)ڈاکٹر سید عبدالباری،مقدمہ،فکر انگیز،ص۔۱۲

(۴)ڈاکٹر سید عبدالباری،مقدمہ،فکر انگیز،ص۱۲

(۵)ڈاکٹر سید عبدالباری،فلیپ،فکر انگیز

(۶)ڈاکٹر سید عبدالباری،مقدمہ،فکر انگیز،ص۔۱۲

باب سوم

ڈاکٹر سید عبدالباری کی تحقیقی وتنقیدی خدمات کا جائزہ

باب سوم (الف)

سید عبدالباری کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ

ڈاکٹر سید عبدالباری نے جہاں تنقیدی و تخلیقی مضامین کے انبار لگا دیئے ہیں وہیں انہوں نے تحقیق کے ذریعے ادب میں گراں بار اضافے بھی کیئے ہیں۔ دراصل ڈاکٹر عبدالباری کا ذہن بچپن سے ہی تحقیقی مزاج کا تھا، انہوں نے تحقیقی کاموں کے لئے خود کو ہمیشہ مصروف رکھا اور ملک بھر میں سفر بھی کیا۔ عام طور سے تحقیقی کام کی ابتدا ایم فل یا پی ایچ ڈی میں داخلے سے ہوتی ہے لیکن یہ عبدالباری صاحب کی ذہنی ذکاوت اور ان کی قابلیت کا بہترین نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنا پہلا تحقیقی مقالہ اس وقت لکھا جب وہ بی اے دوم کے طالبِ علم تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے۔ دراصل اس وقت مقالہ نویسی کا بزمِ ادب دہلی یونیورسٹی کی جانب سے مقابلے کا ایک پروگرام منعقد ہوا تھا، جس میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹی کے طلبہ نے حصہ لیا، اس مقالے کا عنوان ''ہندوستان کی تہذیبی ترقی میں اردو کا حصہ'' تھا، جس پر ہندوستان کے سبھی طلبا نے طبع آزمائی کی، مگر پہلا انعام ڈاکٹر سید عبدالباری کے حصے میں آیا۔ یہ مقالہ اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی میں ان کے استاد پروفیسر احتشام حسین کی نگرانی میں پایہ تکمیل پہنچا۔ احتشام حسین ان کی ذہانت سے بخوبی واقف تھے، اس لئے وہ عبدالباری کی خوب حوصلہ افزائی کرتے رہے، اس طرح انہوں نے کافی محنت و لگن سے اس مقالے کو تحریر کر کے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو ارسال کیا۔ اس مقابلے میں ممتحن کی حیثیت سے پروفیسر عابد حسین کو مقرر کیا گیا تھا، انہوں نے سارے مقالے چیک کرنے کے بعد عبدالباری کے مقالے کو سب سے بہترین اور معیاری مقالہ قرار دیا اور انہیں گولڈ مڈل کے اعزاز سے بھی نوازہ۔ عبدالباری صاحب نے خود بھی لکھا ہے:

> ''اکتوبر ۱۹۵۵ء میں بزمِ ادب دہلی یونیورسٹی کی جانب سے اردو مقالہ نویسی کا آل انڈیا انٹر یونیورسٹی مقابلہ ہوا تھا۔ اس میں راقم الحروف نے بھی لکھنؤ یونیورسٹی کے طالبِ علم کی حیثیت سے حصہ لیا اور متعینہ عنوان ''ہندوستان کی تہذیبی ترقی میں اردو کا حصہ'' پر مقالہ قلم بند کیا۔ ڈاکٹر عابد حسین نے میرے مقالے کو اوّل انعام کا مستحق قرار دیا اور میں یونیورسٹی کی جانب سے طلائی تمغہ کا حق دار ٹھہرا''۔(۱)

جب ان کے استاد پروفیسر احتشام حسین کو یہ خبر ملی، ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور جب عبدالباری کی ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ان کو گلے سے لگا لیا اور مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس مقالے کو شائع کرانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ عبدالباری صاحب نے اس پر نظر ثانی کرنے کے بعد اسے سر سید بک ڈپو علی گڑھ سے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا، اس زمانے میں جامعہ اردو علی گڑھ نے اسے اپنے نصاب ادیب ماہر ادیب کامل میں

شامل کیا۔ اس کے بعد اس تصنیف کے کئی ایڈیشن شائع ہوتے رہے۔ اس کا ساتواں ایڈیشن ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے بعد انہیں اس مقالے پر اتر پردیش اردو اکادمی سے ایوارڈ بھی حاصل ہوا۔ ابھی حال ہی میں ۲۰۱۲ء میں یہ کتاب ایک بار پھر سے نظر ثانی کرنے کے بعد ایجوکیشنل بک ہاؤس نے شائع کیا ہے۔ مگر اب اس کتاب کا عنوان تبدیل کر کے ''اردو ادب کا تہذیبی تناظر'' کر دیا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اس کتاب کو اہلِ ذوق نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور یہ ایڈیشن بھی اب ختم ہو چکا ہے مجھے بڑی مشکل سے اور چھان بین کے بعد دستیاب ہوا۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس کتاب میں اردو زبان و ادب کا جائزہ ہندوستانی تہذیب کے آئینے میں لیا ہے۔ یہ مقالہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نیا اور منفرد معلوم ہوتا ہے، ابھی تک کوئی بھی تحقیقی کتاب اس زاویہ سے منظرِ عام پر نہیں آئی ہے، اس لئے یہ کتاب اردو ادب کے تہذیبی تناظر میں اہم تحقیق کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں پہلی بار اردو زبان کا ارتقا تہذیب کے آئینے میں لیا گیا ہے۔ اس لئے ایسا نہیں ہے اس میں خامیاں نہ ہوں کیوں کہ یہ تصنیف نقشِ اول کی حیثیت رکھتی ہے اور جب پہلی بار کسی موضوع پر قلم اٹھایا جائے، وہ بھی اتنی کم عمری میں تو اس میں کوتاہیاں ہو جانا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ مگر عبدالباری کے اس کام میں کوئی شبہ نہیں ہے، انہوں نے بڑی جرأت مندی سے کام لے کر اس کو بخوبی انجام دیا ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالباری ہندوستانی تہذیب کی تاریخ کا جب نقشہ کھینچتے ہیں تو اس مرحلے میں بعض جگہوں پر ٹھوکریں بھی کھائیں ہیں، جس کو گرفت میں لے کر اہل ادب تنقید کا نشانہ بنا سکتے ہیں، مگر ان کی فراخ دلی کو دیکھتے ہوئے معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے نقشِ اول بہر حال نقشِ اول ہی ہوتا ہے۔ اس کتاب میں جو سب سے بڑی گرفت ہے، وہ ان کا اسلامی نقطۂ نظر ہے یہ صرف ان کی اسی تصنیف میں نہیں دیکھنے کو ملتا بلکہ تنقید و تحقیق یا کوئی اور صنف ہو سب میں اسی نقطۂ نظر سے حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر عبدالباری صاحب اپنے نظریات کو جس منطقی انداز میں پیش کرتے ہیں اس سے ان کی بات کو قبول کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کی اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے آغاز و ارتقا کی مکمل تاریخ ہمارے ذہن میں مرتب ہو گئی ہے۔ اس تصنیف میں عبدالباری صاحب نے اردو زبان کے ابتدائی مراحل سے لے کر آخر تک شعرا و ادبا کی تصانیف اور ان کے اشعار کو جا بجا پیش کیا ہے جس کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کی ارتقاء میں کون کون سے عوامل

کا فرماں تھے اور کن مراحل سے گزر کر اردو زبان یہاں کے تہذیبی عناصر کو قبول کرتے ہوئے موجودہ صورتِ حال تک پہنچی۔اس مرحلے میں انہوں نے اپنی زیادہ توجہ اس بات پر مرکوز کی ہے کہ وہ کون سی وجوہات تھیں، جن سے ہماری زبان وادب نے یہاں کی تہذیب کے اثرات قبول کئے ہیں۔اس ضمن میں انہوں نے زبان کے آغاز سے ہونے والی تحریکوں اور رجحانات پر بالخصوص توجہ دی ہے۔مثال کے طور پر اردو زبان کی ابتدا میں علاؤالدین خلجی اور مسلمانوں کی آمد، پھر اس کے بعد دکن میں اس کا فروغ،صوفیا کرام کی خدمات،شمالی ہند میں اردو کا فروغ پھر مغل عہد میں اس کے فروغ میں کون کون سے اسباب وعوامل تھے،ان سب کا مطالعہ بڑی دیدہ وری سے پیش کیا ہے۔اس طرح انہوں نے اردو زبان وادب کو ترقی پسند تحریک اور پھر تعمیر پسند نظریہ پیش کر کے یہاں کی تہذیب کے تناظر میں حتیٰ الامکان جائزہ لینے کی بہترین کوشش کی ہے۔اور اس مقصد میں وہ پوری طرح کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالباری کا یہ مقالہ اپنے عنوان کے اعتبار سے کافی وسیع اور طویل ہو سکتا تھا،لیکن انہوں نے اس میں ہر موضوع پر بڑے ایجاز واختصار سے کام لیا ہے۔ایسا نہیں ہے اس اجمالی جائزے میں انہوں نے کہیں کسی بات کو مضمحل کر دیا ہو بلکہ جس بات کو پیش کرتے ہیں اس کو مختلف حوالوں اور منطقی انداز سے واضح کرنے کی سعی کرتے ہیں۔پھر بھی کہیں کہیں ایسا لگتا ہے کہ یہاں پر کوئی اہم نکتہ چھوٹ رہا ہے۔بعض ایسے مقامات بھی ہیں جہاں انہوں نے صرف شعرا یا ادباء کے ناموں پر اکتفا کیا ہے،جن ناموں کو بالکل بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے تھا،ان پر بھی انہوں نے کہیں کہیں سرسری نگاہ سے جائزہ لیا ہے۔اس تشنگی کا احساس اس تصنیف میں جا بجا ہوتا ہے۔اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر ابنِ فرید لکھتے ہیں:

> اس کمی کی وجہ نہ تو سید عبدالباری کی کوتاہی ہی ہے اور نہ ہی کسی نوعیت کی عصبیت! بلکہ ان کا خاص زاویہ نظر ہے۔وہ افراد سے زیادہ عوامل پر زور دیتے ہیں۔ان کے یہاں افکار،نظریات،تحریکات اور معاشرے کا مطالعہ ہے جن کی وہ ژرف نگاہی سے عکاسی کرتے ہیں اردو زبان اجتماعی ورثہ کی حیثیت سے پروان چڑھتے ہوئے جن جن مراحل سے گزری ہے یہ تصنیف ان کا بڑا اچھا جائزہ پیش کرتی ہے۔''(۲)

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری کے اس جائزے میں اردو زبان کے آغاز سے بیسوی صدی کے وسط تک جن حالات اور تحریکات سے گزرنے کے بعد ادب میں ہندوستانی تہذیب کی جو جھلک نظر آتی ہے، اس کی نشان

دہی انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے کی ہے۔اس جائزے میں انہوں نے جو سب سے بہترین کام کیا ہے، وہ قابلِ تعریف بھی ہے کہیں بھی جانب داری سے کام نہیں لیا ہے، البتہ ہر جگہ ان کا جھکاؤ اسلامی تہذیب کی طرف زیادہ دکھائی دیتا ہے، مگر ڈاکٹر سید عبدالباری نے دیانتداری سے کام لیتے ہوئے ہر تحریکات اور اس کے نظریات پر اپنی رائے پیش کرتے ہوئے اس کے محاسن اور معائب بیان کرتے ہیں، جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی تحریک کی جانبداری نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایسا احساس ہوتا ہے انہوں اس میں ذاتی لاتعلقی سے کام لیا ہے۔اس وصف سے متعلق ڈاکٹر ابنِ فرید نے اس کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے:

> ''تنقیدی دیانتداری کے لئے یہ بہترین وصف ہے حق کو حق کہنا ہی ناقد ومبصر کا اصل الاصول ہونا چاہئے۔اسی لئے ان کے یہاں ذہنی مرعوبیت ہے اور نہ دعوائے بے دلیل۔ان کا استدلالی انداز ان کی متوازن ومعتدل فکر کا مظہر ہے''۔(۳)

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری نے غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اس کتاب میں ولی دکنی سے کچھ پہلے عہد سے لے کر ترقی پسند تحریک اور عصرِ رواں تک ہندوستان میں اردو ادب سے متعلق جتنی بھی تحریکیں وجود میں آئیں ہیں، ان سے متعلق نظریات کو پیش نظر رکھ، ان کی ادبی تخلیقات کا جائزہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کے حوالے سے پیش کیا ہے۔اس تصنیف میں سب سے پہلے وہ تہذیب کی وضاحت کرتے ہیں اور ''تہذیب کیا ہے'' کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے مشرق ومغرب کے تمام مفکرین کے خیالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی بات پیش کرتے ہیں اور تہذیب کے حوالے سے اپنی رائے کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تہذیب وہ امتیازی خصوصیت ہے جس سے ایک ملک ایک گروہ،ایک امت ،ایک جماعت پہچانی جاتی ہے۔تہذیب ماضی کے تجربات اور روایات حال کے تغیرات و انقلابات سے ہم آہنگ ہو کر پروان چڑھتی ہے''(۴)

عبدالباری نے تہذیب کے سیاق وسباق میں مغرب ومشرق کے دانشوروں کی آرا کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مفصل بحث کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کسی جامع اور سائنٹفک نظریۂ حیات کے بغیر تہذیب کی

عمارت نہیں کھڑی کی جاسکتی ہے، اس کے بغیر فکر و عمل، وجدان و شعور کے تمام گوشے تشنہ رہ جاتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کسی بھی تہذیب کو مادی وسائل کے ذریعے نہیں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ البتہ وہ مادیت کو کسی تہذیب کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں اور کسی تہذیب کی نشو و نما میں اس کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کرتے اور لکھتے ہیں:

مادی وسائل اور محنت سے بے شک تہذیب کی عمارت بنتی ہے مگر اس کا نقشہ اس کا ڈھانچہ اور اس کے خد و خال کے لئے فکری بصیرت، روحانی قوت، اور داخلی شعور کی ضرورت پڑتی ہے۔'' (۵)

دراصل ڈاکٹر عبدالباری ابتدا سے ہی تعمیری ادب کے علم برداروں میں سے رہے ہیں، اس لئے ان کی فکر و نظر میں تعمیری نظریہ ہر جگہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں بھی اسی اساس پر وہ تہذیب کا جائزہ لے رہے ہیں اور مادیت جیسے فلسفے کو وہ نظر انداز کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ بہر حال انہوں نے تمام مغربی فلسفیوں اور ادیبوں کا حوالہ دے کر یہ بات ثابت کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں کہ تہذیب مادہ سے نہیں بلکہ جذبہ، احساس اور روح کی آمیزش سے وجود میں آتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری تہذیب کو مذہب کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''ماضی کی تاریخ بتاتی ہے کہ مذہب و اخلاق کا تہذیب کے ساتھ ناگزیر تعلق رہا ہے۔ مذہب نے بہترین معاشرہ اور اعلیٰ درجہ کی زندگی کے لئے اقدار کا نظام مرتب کیا ہے جس پر تہذیب کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اسی زمین سے تہذیب کی کونپلیں پھوٹی ہیں اور اسی نے اسے سیراب کیا ہے'' (۶)

ڈاکٹر سید عبدالباری کی یہ بات کچھ حد تک ٹھیک بھی معلوم پڑتی ہے، کیوں کہ ہندوستان کی کسی بھی تہذیب کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر کسی نہ کسی مذہب کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ تہذیب کی تعریف اور اس کی تشریح پیش کرنے کے بعد انہوں نے ادب سے اس کا جو باہمی رشتہ ہے، اس کے خد و خال کو ظاہر کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کسی تہذیب کو ظاہر کرنے میں زبان اہم رول ادا کرتی ہے اور اس کی ارتقا میں زبان کا تعاون ہمیشہ سے حاصل رہا ہے۔ زبان ہی ہے جس سے تہذیب کے عروج و زوال اور اس کے ارتقا کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے اور اسی زبان کے ذریعے ہم باآسانی کسی بھی زمانے یا

ملک کی تہذیب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ڈاکٹرعبدالباری صاحب مزید لکھتے ہیں:

’’زبان نے تہذیب کے بیل بوٹوں کو دامنِ تاریخ پر نمایاں کیا ہے اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ زبانوں کے زوال سے تہذیبوں کے سوتے خشک ہو گئے ہیں بعض محققین نے تو لسانی اعتبار سے مختلف تہذیبوں کے ادوار کا تعین کیا ہے۔ یہ وہ مرقعے ہیں جو بہار تہذیب کا مکمل آئینہ دار ہیں۔اس کینوس پر کلچر کا ہر روپ اور رنگ عکس ریز رہا ہے۔زبان تہذیب کے سانچوں میں ڈھلتی رہی ہے اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ زبانوں کے سانچوں نے تہذیبوں کے پیکر ڈھالے ہیں‘‘(۷)

اس سلسلے میں ڈاکٹرعبدالباری تہذیبی ارتقا میں زبان کے رشتے اور اس کے تعاون کو واضح کرتے ہوئے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تہذیب کی غیر محسوس روح اور اس کی گہما گہمی کے ساتھ ساتھ اس کے نفسی و ذہنی عناصر کا ادراک صرف ایک شاعر یا ادیب ہی کر سکتا ہے کیوں کہ وہ زمانے کا بہترین رمز شناس ہوتا ہے، وہ ہر شے کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے اس لئے کسی تہذیب کو زبان کے ذریعے کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات سے بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اور اپنے عہد کا مبصر بھی ہوتا ہے،اس لئے ادب کے ڈانڈے تہذیب میں پیوست ہوتے ہیں۔دراصل ایک ادیب بھی اسی سماج میں سانس لیتا ہے بلکہ اسے بھی سماج میں انفرادیت حاصل ہوتی ہے اور وہ انہیں تہذیبوں اور اقدار کے زیرِ سایہ پرورش پاتا ہے اور اسی معاشرے کے اقدار و روایات میں رہ کر وہ روحانی اور اخلاقی غذا حاصل کرتا ہے۔اس کی فکر، اس کا ذوق سب کچھ اسی معاشعرے کی مرہونِ منت ہوا کرتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس کی تخلیقات میں کسی بھی عہد کی تہذیب کا بخوبی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ڈاکٹرعبدالباری صاحب نے اس تحقیقی مقالے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک ادیب و شاعر زبان کے ذریعے ہر زمانے کی تہذیب کی بہترین عکاسی کرتا ہے لیکن یہ بات بھی واضح ہے کہ زبان ترقی اسی وقت کرتی ہے جب وہ اپنے عہد کی تہذیب کو اپنے اندر سمیٹ کر اس کی بھرپور نمائندگی کرے اس سلسلے میں عبدالباری رقمطراز ہیں:

’’کوئی زبان اس وقت تک پروان نہیں چڑھ سکتی جب تک وہ اپنی تہذیبی قدر و قیمت کی شناسا نہ ہو اور اپنے تہذیبی سرمایہ کی نگہبانی نہ کرے۔تہذیبی روایات زبان کے لئے موادِ خام سے زیادہ روح حیات ہیں اس لئے کہ یہ اسے ایسی شاہراہ پر لے جاتی ہیں

جہاں وہ انسانی فطرت کے ہر جلوہ پر نگاہ ڈالتی ہوئی گزرتی ہے اور آخرکار خود بھی ایک جلوہ ہو جاتی ہے۔''(۸)

یہی وجہ ہے اگر کسی شخص کو کسی زمانے یا عہد کی تہذیب کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے تو وہ اس قوم کی زبان وادب کی طرف سب سے پہلے اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے۔ کیوں کہ ہر زبان سے تہذیب کا گہرا تعلق ہوتا ہے، زبان کسی قوم یا ملک میں ہونے والے تمام انقلابات وتبدیلیوں کا ساتھ دیتی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی دیکھنے کو ملا ہے، کوئی زبان کسی تہذیب کے اندر ایک نئی روح پھونک دیتی ہے، جس سے اس عہد کی تہذیب کو سمجھنے میں خاصی مدد حاصل ہوتی ہے، ہر قوم اپنی زبان وادب کی محافظ ہوتی ہے اور اپنی تہذیب کو سینے سے لگائے رکھتی ہے، اسے اپنے کلچر سے بے حد محبت ہوتی ہے، اس لئے لوگ اپنی تہذیب کو بچانے کی فکر میں ہر ممکن کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ اسی سبب زبان کے ذریعے تہذیب کا ایک تسلسل برقرار رہتا ہے، جس سے نسل در نسل واقفیت حاصل ہوتی رہتی ہے اور زبان تاریخ کی کڑیوں کو ملاتی ہوئی موجودہ عہد تک اپنے عناصر کو قائم رکھنے کی حتیٰ الامکان کوشش کرتی ہے۔ زبان اپنے اس فریضے کا انجام اس وقت کے ان اہل قلم کے توسط سے انجام دیتی ہے، جو اس وقت اس تہذیب کے سانچے میں پوری طرح ڈھلے ہوئے ہوتے ہیں، انہیں ادبا وشعرا کی رہنمائی میں اقدارِ حیات اور تہذیب وتمدن کی بہترین نمائندگی اس عہد کے فن پارے میں زبان کا بہترین سرمایہ قرار پاتے ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر سید عبدالباری تہذیب کے ارتقا میں زبان کا جو تعاون ہوتا ہے، اس پر مفصل روشنی ڈالنے کے بعد اسی حوالے سے ہندوستان کی تہذیب کی خصوصیت اور اس کی رنگارنگی پر لکھتے ہوئے، یہاں کی تمام تہذیبوں، مقامی عناصر کا خاص نقطۂ نظر اسلامی تہذیب کی آمیزش سے یہاں کی جو تہذیب ابھر کر سامنے آئی ہے اس کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے ہندوستان کی رنگارنگی کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستان ابتدا سے ہی مختلف تہذیبوں کا مرکز رہا ہے، یہاں پر روزِ اول سے ہی کوئی نہ کوئی قوم ہر صدی میں حکومت کرنے یا تجارت کی غرض سے آتی رہی ہے اور ہر آنے والی قومیں یہاں اپنا تہذیبی سرمایہ اور اس کے اثرات چھوڑ جاتی رہیں۔ جن کے اثرات یہ نمایاں ہوئے کہ یک بعد دیگرے آنے والی قومیں اپنے پہلے آنے والی قوم کے اثرات قبول کرتی گئیں۔ جس کی وجہ سے ان قوموں کی زبان ونظریات، مذہب اور بہت ساری اخلاقی قدریں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہیں اور ایک دوسرے پر قابض ہوتی رہیں۔ جو تہذیب زیادہ پائدار اور جامع ہوتی، وہ اس ملک

پر زیادہ اثر انداز ہوئی اور یہاں کی موجودہ تہذیب پر غالب ہوگئی۔یہی وجہ ہے جب ہم یہاں کی تہذیب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ہر عہد میں تھوڑے سے فاصلے پر نئے موڑ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔کیوں کہ ہندوستانی تہذیب وتمدن کی سرشت میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ بہت جلد بیرونی تہذیب کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے،جس کے نتیجے میں یہاں کی تہذیب کافی متاثر ہوتی ہے۔جس کے سبب ہر دور میں یہاں کی تہذیب میں تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالباری نے اس باب میں یہاں کی تہذیب پر اثر انداز ہونے والی تمام قوموں کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ سب سے پہلے افریقہ کے حبشی النسل انسان یہاں کے باشندے تھے۔جن کی وجہ سے ہندوستان میں تہذیب کی بنیاد پڑی اور مادری تہذیب کو فروغ حاصل ہوا۔پھر انہوں نے آریہ قوم کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے ان کے آنے سے ہندوستان کی تقدیر بدل گئی۔آریوں نے یہاں کی قدیم تہذیب کے اثرات نہ قبول کر کے تہذیب وتمدن کی نئی بنیاد رکھی اور ایک نئی ترقی یافتہ تہذیب کو فروغ دیا اس کا ذکر رگ وید میں بھی پایا جاتا ہے اور آج بھی ہندوستان میں کہیں نہ کہیں یہ تہذیب پائی جاتی ہے۔آریوں نے نہ صرف نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی بلکہ اس نے یہاں کے باشندوں کو بھی اس نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔یہ تہذیب بہت ترقی یافتہ سمجھی گئی،جس کا کا ذکر چاروں ویدوں میں پایا جاتا ہے۔اس لئے جب ہمیں یہاں کی تہذیب کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے تو یہ وید ہماری بڑی مدد کرتے ہیں۔ان ویدوں سے متعلق ڈاکٹر عبدالباری نے لکھا ہے:

> ''اس دور کی پوری تہذیب کا خاکہ ہمیں چاروں ویدوں میں ملتا ہے۔یہ وید بڑی اہمیت کے حامل ہیں یہ ہندوستان کی اہمیت کے مظہر ہیں جن کو آج بھی اہلِ ہنود مقدس و پاکیزہ کتاب اور زندگی کے لئے شمع ہدایت سمجھتے ہیں۔ان میں مذہب کے قوانین اخلاق کے اصول اور تہذیب کے تابناک اصول ملتے ہیں۔''(۹)

ڈاکٹر سید عبدالباری اس کے بعد سیدھے بودھ وجین مذہبوں کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان مذاہب نے یہاں کی تہذیبوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔حالانکہ ڈاکٹر عبدالباری حبشیوں،آریوں،جین اور بودھ مذہب کا ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن انہوں نے کہیں بھی ہندوستان میں آباد ہونے والی دراوڑ قوم کا ذکر نہیں کیا ہے،جس نے بھلے ہی کم مدت کے لئے یہاں کی تہذیب کو متاثر کیا،پر اس کا ذکر کرنا کافی اہم تھا لیکن

انہوں نے اسے نظرانداز کیا جس سے قاری کو اس کی تشنگی کا احساس ہوتا رہے گا۔ پھر انہوں نے اشوک اور سکندر کے حملوں کا ذکر بھی بہت مختصر انداز میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس وقت چین سے لے کر وسط ایشیا اور یونان مختلف مہذب اور متمدن قوموں سے ہندوستان کے مراسم قائم ہوئے جس سے یہاں کے تہذیبی دائرے کو کافی وسعت حاصل ہوئی، جس کی بنا پر ہندوستان نے اپنی روحانی روایات اور اخلاقی قدروں اور اپنی تہذیبی گہرائی سے پورے ایشیا کو متاثر کیا۔ پھر یہاں ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی آمد ہوئی جس نے اس ملک کو ایک وسیع، جامع اور مربوط اور ہمہ گیر تہذیب سے آشنا کیا۔ اسلامی تہذیب نے یہاں کی تہذیب اور رہن سہن اور اخلاقی قدروں میں ایک نیا انقلاب پیدا کر دیا، جس سے ہندوستان کی تہذیب واقدار میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں مگر یہ تبدیلی اچانک نہیں پیدا ہوئی، رفتہ رفتہ اس نے اپنی جاذبیت اور اثر انگیزی سے یہاں بسنے والی سبھی قوموں کو متاثر کیا، جس سے یہاں ایک نئی تہذیب وجود میں آئی۔ ڈاکٹر سید عبدالباری مزید لکھتے ہیں:

> ''گیارہویں صدی میں جب کہ پورے شمالی ہند میں ان کا سکہ چلنے لگا اور انہیں یہاں کی سوسائٹی کے ہر طبقہ سے واسطہ پڑا تو یہاں کے تہذیبی خدوخال تیزی سے بدلنا شروع ہوئے۔ نئی زبان کی بنیادی طور نئی اخلاقی اقدار یہاں رائج ہوئیں، نئے معاشرتی اصول اپنائے جانے لگے۔ آنے والے چونکہ حکمراں بن کر آئے تھے اس لئے فطرتاً ان کے طور طریقے اور رہن سہن کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔ کچھ لوگوں نے رغبت کچھ لوگوں نے مرعوبیت اور کچھ نے مطلب برآری کی خاطر اسے اپنایا۔''(۱۰)

عبدالباری کے مطابق یہ لوگ جو نیا تہذیبی نظریہ لے کر آئے تھے اپنی عملی زندگی میں کچھ حد تک اسلامی نظریات سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں تھے۔ اسلام نے جو زندگی گزارنے کے طور طریقے بتائے تھے اور جن کو خود خلفائے راشدین نے پوری طرح سے اپنایا تھا، اس سانچے میں ان کی زندگیاں نہیں ڈھلی ہوئی تھیں۔ عبدالباری نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے اور امید جتائی ہے اگر یہ تہذیب صحیح اسپرٹ کے ساتھ یہاں جلوہ گر ہوتی تو یقیناً یہاں کی تہذیبی قدریں پوری طرح تبدیل ہو چکی ہوتیں اور ہمارے ملک میں موجودہ عہد میں جو مختلف قوموں اور تہذیبوں کی کشمکش ہے ان پر ہو رہی سیاست کا جو منظر نامہ ہے، ان سب مسائل سے ملک کو پوری طرح آزادی مل گئی ہوتی۔

مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ اور اس ملک پر اس سے نمایاں ہونے والے اثرات کی وضاحت کرنے کے

بعد انھوں نے انگریزی تہذیب کا ذکر کیا ہے۔جس نے میکانکی اور مادی تہذیب کے ذریعے یہاں کی قدامت پرست اور بوسیدہ تہذیبوں کا دامن تار تار کر دیا۔مگر اس تہذیب کو اس ملک میں قدم جمانے کے لئے یہاں کی پرانی تہذیب سے سخت ٹکر لینی پڑی ، یہ قوم بڑی شاطر اور چالاک تھی، اس نے اپنی ہمت اور قوتِ عمل کے ذریعے فتح حاصل کی اور یہاں کی تہذیب پر اپنے اثرات ڈالنے لگے۔اس مغربی تہذیب کی آمد سے یہاں کے لوگوں میں جو جمود طاری تھا اور لوگ جو غفلت کی نیند سو رہے تھے وہ بیدار ہوئے اور اپنی عیش پسندانہ زندگی کو ترک کر کے حکمتِ عملی میں آئے اور اپنی تہذیب کو بچانے کے لئے دل و جان سے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا۔اس وقت ملک میں افراتفری کا جو عالم تھا،ان ہنگاموں نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا،ایسے میں کچھ لوگ ہاتھ پاؤں باندھ کر بیٹھ گئے تھے اور کچھ لوگوں نے حالات سے مقابلہ کیا۔اس میں کچھ ایسے بھی تھے جو ان نئے حالات و تہذیب سے استفادہ بھی کیا اور اسی سیلاب میں وہ بھی بہنے لگے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا یہاں پر انگریزی تعلیم کو اہمیت دی جانے لگی۔جن سے ترقی کی کئی راہیں ہموار ہوئیں۔ان نئ قوتوں کی مدد سے لوگوں نے اپنی روزمرہ کی زندگی اور اس کی رفتار میں اضافہ کیا اور اپنی زندگی کو پرسکون بنانے کی حتیٰ الامکان کوششیں کیں۔اس کے نتیجے میں ہندوستان میں ایک نئ تہذیبی لہر پیدا ہوئی، جو انگریزوں کی تقلید کرتی ہے،جس سے اب مغربی اشیا کو ہمارا ذہن قبول کرنے لگا اور اس میں ہمیں اپنی آسانی نظر آئی۔یہاں تک کہ آزادی کے بعد آج بھی ہمارا ذہن انہیں کی غلامی کرنے پر مجبور ہے۔

ہندوستان میں یہ مختلف تہذیبیں جس طرح اثر انداز ہوئیں ہیں،اس کا خاکہ ڈاکٹر سید عبدالباری نے بڑے انہماک،عمیق مطالعے،منطقی اور مدلل انداز میں عمدہ طریقے سے پیش کیا۔ان پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے بعد انھوں نے اردو زبان کا جائزہ یہاں کے تہذیبی ارتقا کے آئینے میں لیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اردو ادب کا آغاز و ارتقا بھی اسی تہذیب کے حوالے سے پیش کیا ہے،جس سے ہم سب بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔اس تصنیف میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے اردو کے ارتقا میں مسلمانوں اور مغل عہد کا کافی اہم رول بتایا ہے اور لکھتے ہیں کہ اسی عہد میں یہ زبان پروان چڑھی ہے، پھر دکن کا بھی ذکر کیا ہے جس نے اس زبان کو فروغ دینے میں کافی اہم رول ادا کیا ہے۔اس نے اسے سرکاری زبان کا رتبہ دیا،جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں پر اس زبان میں لوگوں نے اعلیٰ ادبی تخلیقات پیش کرنا شروع کر دیں اور اسی وقت صوفیا نے بھی اپنے مقصد کی تبلیغ اسی زبان میں کرتے تھے۔ان سب کا ذکر تفصیل سے آئندہ باب میں ڈاکٹر عبدالباری نے کیا ہے۔جس کی وجہ سے دکن کا ادبی سرمایہ یہاں کی تہذیب و ثقافت کا بہترین مظہر ہے۔اس زمانے میں یہاں ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج پر

تھا کوئی اونچ نیچ نہیں ،سب ایک دوسرے کا احترام کرتے ،ان سے ملتے یہاں تک ایک دوسرے مذہب میں شادیاں بھی کرتے ،ان سب حالات نے مل جل کر یہاں کے ادب کو جو مواد فراہم کیا ہے وہ خالص ہندوستانی تھا،جس کی جھلک اس زمانے کے ادب میں صاف نظر آتی ہے۔

دکن میں اردو کے فروغ واشاعت میں صوفیا کرام نے بھی اہم رول ادا کیا ہے،ان سبھی صوفیا کی خدمات کا جائزہ ڈاکٹر عبدالباری نے اپنے مخصوص انداز میں اختصار وایجاز کے ساتھ لیا ہے اوران کے کلام اورنثری کارناموں کے کچھ اقتباسات کو پیش کرتے ہوئے اردو ادب پر ہندوستانی تہذیب کے اثرات کی نشان دہی کی ہے،جس سے یہاں کی تہذیب اردو زبان وادب میں نمایاں ہوتی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے قطب شاہی عہد کے ادب کا جائزہ پیش کیا ہے اور محمد قلی قطب شاہ جو پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے،اس کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے اس میں ہندوستانی تہذیب کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’اس کی زبان میں فارسی کے الفاظ کے بجائے ہندی کے شیریں الفاظ کی بہتات ہے۔اس کے شعروادب کی فضا کامل ہندوستانی ہے۔ ہندی استعارے،ترکیبیں تشبیہیں ،ہندوستانی سورماؤں اور بہادروں کا ذکر ہندوستان کی مخصوص روایات کا تذکرہ،اظہارِ عشق،عورت کی جانب سے مرد کے لئے جو ہندوستانی ادبیات کا طرۂ امتیاز ہے، یہ سب باتیں اس کے کلام کی خصوصیات میں شامل ہیں۔قطب شاہ نے اردو کو ادبی رنگ عطا کیا اوراسے ہندوستانی مناظر کی لاجواب عکاسی کے قابل بنایا۔‘‘(۱۱)

صرف قطب شاہ کے یہاں ہی یہ رنگ دیکھنے کو نہیں ملتا بلکہ پورے دکن میں جو ادب تخلیق ہو رہا تھا،ان سبھی فن پاروں میں اس عہد کے تہذیب کی عکاسی واضح طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔اس عہد کے کسی بھی فن پارے کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا معشوق ہندی ہے،اس کے سارے رنگ و روپ اور خد و خال بھی ہندوستانی ہیں۔اس رنگ کو اس عہد کے سبھی شعرا اور ادبا نے اپنایا،جس میں کئی قابلِ قدر نام شامل ہیں،اس میں ایک نام ملا وجہی کا ہے،عبدالباری نے بالخصوص اس کی نثر کا ذکر کیا ہے،اس کے علاوہ دکن کے تمام شعرا ونثر نگاروں اوران کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے،اس میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر کی عمدہ نشادہی کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ یہاں پر فارسی اوراردو کی آمیزش سے دو تہذیبیں آپس میں ملی ہوئیں نظر آتیں ہیں۔جس کے نتیجے کے طور پر اردو زبان کا ایک نکھرا ہوا روپ یہاں کے ادب میں دیکھنے کو ملتا ہے۔اسی زمانے میں

صوفیا کرام نے اپنا ادبی شاہکار پیش کر کے پروان چڑھتی ہوئی اس زبان کو بڑی تقویت عطا فرمائی اور اپنی مذہبی تخلیقات اور پند ونصیحت کے ذریعے انہوں جو ادبی خدمات انجام دیں، اس سے اردو زبان کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ آگے چل کر جب ولؔی ۱۷۰۰ء میں شمالی ہند دہلی میں تشریف لے گئے اور وہاں کی زبان کا گہرائی سے مطالعہ کیا تو انہیں یہ احساس ہوا کہ یہ زبان جسے لوگ عوامی اور گری پڑی زبان کہتے ہیں۔ اس میں بھی اپنے دل کے جذبات بیان کئے جا سکتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اردو زبان جو اس وقت دہلی اور اس کے گرد ونواح میں بولی جاتی تھی اس میں شعر کہنے شروع کئے، جس سے اس وقت کے سبھی شعرا کافی متاثر ہوئے اور ولؔی نے اس زبان کے ذریعے اردو زبان اور یہاں کی تہذیب کی عمدہ مثالیں اپنی شاعری میں پیش کیں، اس لئے بعض لوگ اسے اردو زبان کا پہلا مکمل شاعر تسلیم کرتے ہیں جس کے بنائے ہوئے شعر وسخن کے سانچے آج بھی رائج ہیں۔ ان کے اشعار میں زمانے کی تہذیبی کشمکش اور انتشار کو بخوبی تغزل کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار دیکھیں:

مجھ کو ہے دارالامن پیو کا نقشِ چرن
پیو کا نقشِ چرن مجھ کو ہے دارالامن

اے ولی دردِ سر کبھو نہ رہے
جب ملے صندل و گلاب سخن

تسبیح تری زلف کو کہتے ہیں اے صنم
اک تار دے کے رشتۂ زنار کر رکھو

عجب شہروں میں ہے پر نور ایک شہر
بلا شک ہے وہ جگ میں مقصدِ دہر

کہ ہے مشہور اس کا نام سورت
کہ جاوے جس کو دیکھے سب کدورت

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

ولؔی کے ان اشعار میں تصوف، ایرانی اور ہندوستانی تہذیب کی آمیزش کے ساتھ اس ملک کے کچھ شہر کی بہترین منظرکشی دیکھنے کو ملتی ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ ولؔی نے شعر کے پیرائے میں بڑے تجربہ کارانہ باتیں پیش کردی ہیں۔ ولی کے بعد دہلی میں اردو زبان وادب کی محفلیں جمیں، مگر یہ زمانہ اورنگ زیب کا تھا وہ ایک سادہ مزاج اور محنت کش انسان تھا اور یہاں کی تہذیب اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کا ترجمان بھی تھا، اسے عیش ومستی سے کوئی سروکار نہیں تھا، اس لئے اس عہد میں تہذیب کی کوئی نمایا ترقی نہیں ہوئی۔ مگر اس کے انتقال کے بعد عیش و عشرت کے متوالے پھر اس طرف متوجہ ہوئے اور ایک بار پھر یہاں کی تہذیب نے اپنا رخ بڑی تیزی سے تبدیل کیا، مگر اس وقت مغل عہد زوال کی طرف گامزن ہو چکا تھا، چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے، ملک میں بدامنی پھیل چکی تھی، اس لئے یہاں کے لوگ اب تصوف کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

تصوف کا یہ رجحان ہندوستانی تہذیب کے مطالعے میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس وقت بھگتی تحریک بھی زوروں پر تھی، اس لیے اس کے اثرات تصوف پر بھی نمایا ہوئے۔ ان دونوں نظریات نے یہاں مشترک تہذیب کی عمدہ نمائندگی کی۔ غرض سید عبدالباری نے اس باب میں مختلف خانقاہوں، بازاروں اور درباروں کی تہذیب اور ان کے مزاجوں کو سمجھتے ہوئے اردو ادب پر ان کے جو اثرات نمایاں ہوئے ہیں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں جو انقلاب برپا ہوا ہے اور اس کے ردِ عمل میں عوام کے اندر جمہوریت اور انقلابِ آزادی کا جو شعور بیدار ہوا اس کا ذکر کیا ہے اور اس وقت کے شعرا کے کلام کو پیش کر کے اس وقت کے حالات اور ان کی ذہنی کشمکش کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ اسی عہد میں لوگوں کے اندر انگریزوں کے خلاف آواز اٹھانے کی پہلی بار جرأت بیدار ہوئی اور اپنی قدر و قیمت کا جو احساس پیدا ہوا، وہ اردو زبان کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔ اس زمانے میں حاتم، آبرو شاکر ناجی، مظہر جانِ جاناں وغیرہ نے فارسی آمیز اور ایہام گوئی شاعری کو فروغ دیا، جس سے شاعری میں تہذیبی زندگی کا کوئی واضح عکس نہیں ملتا مگر کہیں کہیں پر چند ایسے اشارے مل جاتے ہیں جن سے ان کے اندر آزادی کی تڑپ ظاہر ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان شعرا کے مختلف اشعار پیش کر کے اپنی بات کو واضح کیا ہے۔ اس عہد کے بعد انھوں نے میر اور میرزا کے پرآشوب زمانے کا ذکر کیا ہے اور اس زمانے میں

یہاں کا جو ماحول تھا اس پر مختصر روشنی ڈالتے ہیں اور اس عہد کے تمام سیاسی سماجی معاشی اور تہذیبی صورت حال پر ہر زاویہ نگاہ سے جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تہذیب کی وہ عمارت جو سلطنت مغلیہ کے عہد میں کھڑی ہوئی تھی شکستہ ہوتی جا رہی تھی اخلاق، شرافت اور وضع داری کے اعلیٰ معیار ختم ہوتے جا رہے تھے۔ جاگیردارانہ تمدن کی قدروں کا سرمایہ بھی منتشر ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسے عہد میں سوداؔ، دردؔ و میرؔ جیسے حساس شعرا کا وجود فطرت کا عین تقاضا تھا۔ یہ اگر چہ زندگی کا کوئی تعمیری خاکہ نہ پیش کر سکے مگر اس دور کی تمام خامیوں پر انگلی رکھ دی اور تمام دکھوں کی نشان دہی کر دی۔ زخم خوردہ انسانیت کی ڈھارس بندھائی اور روتے ہوئے انسانوں کو پر لطف کلام اور کیف آور پیام سے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے روح کی بالیدگی اور باطن کی صفائی پر زور دیا۔ ہندوستانی تہذیب کی روایات کو اپنایا اور مسلمانوں کے ساتھ ہی ساتھ ہندوؤں کی آنکھوں سے بھی آنسوں پونچھے۔ اپنے صحت مند کلام کو درِ انسانیت کا محور بنایا''۔ (۱۲)

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس عہد کے تین شعرا میرؔ، دردؔ اور سوداؔ کے کلام کا بھرپور جائزہ لیتے ہیں اور ان کے کلام میں یہاں کے تہذیبی عناصر کو تلاش کر کے پیش کرنے کی بہترین سعی کی ہے۔ اس عہد میں میر حسنؔ کی لکھی ہوئی مثنوئی سحرالبیان کا بھی ذکر کیا ہے، جس سے اس عہد کے تہذیب کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اس عہد میں معاشی بدحالی اپنے عروج پر تھی لوگوں کے اندر عجیب کشمکش تھی، لوگ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کر رہے تھے کیوں کہ وہاں ابھی بھی امن و چین قائم تھا۔ اس صورتِ حال میں اس وقت اردو نثر کا خوب فروغ ہوا۔ ڈاکٹر عبدالباری نے لکھا ہے کہ اس انتشار کے عالم میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد پڑی اور اردو نثر کو فنی اعتبار سے خوب تقویت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالباری نے اس کالج کے زیرِ اثر لکھے جانے والے تمام نثری کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ان تصانیف سے اس عہد میں تہذیب کی کوئی شعوری ترجمانی نہیں ملتی، مگر اس سے کہیں نہ کہیں اس وقت کے تہذیبی پہلو کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالباری نے مرزا رجب علی بیگ سرور کی ''فسانۂ عجائب'' کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں لکھنوی تہذیب و تمدن اور وہاں کے عیش و عشرت کی زندگی کی خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔ مصنف نے اردو ادب کا جائزہ لیتے ہوئے دہلی اور لکھنوی تہذیب کا جائزہ جا بجا پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دہلی کی سرپرستی کے بعد لکھنؤ کی سرپرستی نے یہاں کی تہذیب و تمدن کا یہاں ایک نیا ڈھانچہ کھڑا کر دیا۔ لکھنوی ادب میں جس تہذیب کا ذکر ملتا ہے، وہ پوری طرح مصنوعی تھی۔ اس نے لوگوں کے

دلوں سے تھوڑی دیر کے لئے خوف اور زوال کا تصور نکال کر انہیں نشاط انگیز ماحول میں لے آیا، جس سے وہاں کے لوگ کچھ دن سکون کی زندگی گزار سکیں۔ نیز ڈاکٹر سید عبدالباری اس عہد کی تہذیب اور اس کے ادب سے متعلق رقمطراز ہیں:

''اس دور میں جو کچھ لکھا گیا اس کی تاریخی اہمیت ہوتو ہو مگر اخلاقی اہمیت بالکل نہیں ہے۔ وہ ہندوستان کی تہذیبی ترقی میں کسی بھی حیثیت سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ پھر بھی مخلوط تہذیب کے بعض عناصر بڑی تیزی سے لکھنؤ کی گود میں پروان چڑھے اور وہ کام جو صوفیا اور درویشوں کے بس کا نہ تھا دولت وسطوت کے سائے میں بڑی حسن وخوبی سے انجام پایا۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے زیادہ قریب رنگ رلیاں منانے کے لئے ہوا نہ کہ ایک دوسرے سے کی خصوصیات سے فائدہ اٹھانے کے لئے۔ غرض بعض فنونِ لطیفہ نے اس عہد میں ہندوستانی تہذیب، قدیم ہندوستانی روایات اور یہاں کے جشن و تیوہار کا بڑا اچھا منظر پیش کیا ہے'' ۱۳

ڈاکٹر عبدالباری نے اس تصنیف میں لکھنؤ کے تمام شعرا وادبا کی ادبی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی تخلیقات سے تہذیبی عناصر کو تلاش کرتے ہوئے اس کی نشاندہی بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔ لکھنؤ کے اسی ماحول میں مرثیہ بھی خوب پروان چڑھا اور اس نے ایک نیا اسلوب اختیار کیا، بعد میں اسی اسلوب سے اقبالؔ، حالیؔ، اکبرؔ اور چکبستؔ نے بھی استفادہ کیا اور اپنی شاعری کے بلند ایوان تعمیر کئے۔ مرثیے نے اس عہد کی تہذیبی مطالعے کے سلسلے میں قابلِ قدر کارنامے انجام دئے۔ مرثیے کی اس خدمات کے سلسلے میں عبدالباری نے لکھا ہے:

''مرثیے نے چند آئیڈیل دنیا کے سامنے رکھے اور چند معروف تہذیبی و اخلاقی قدروں کو تابناک بنایا، شجاعت، عالی ہمتی، انصاف، عصمت وعفت، محبت، اخلاص اور حق کے لئے جان تک کی قربانی وغیرہ ایسی معروف اعلیٰ تہذیبی و اخلاقی قدریں ہیں جو دنیا کے ہر گوشے میں اور ہر دور میں بنی نوع انسان کا سرمایہ رہی ہیں اور آج بھی ہیں انہیں معروف اخلاقی قدروں کا ایک عدیم المثال نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر کے مرثیے نے انسانیت کی گراں قدر خدمت انجام دی۔ مرثیے نے ہمہ گیر، لازوال، عالمگیری، تہذیبی قدروں کو غیر فانی ثابت کیا۔'' ۱۴

اس باب میں انہوں نے انیسؔ اور دبیرؔ کے مرثیوں کا جائزہ لیتے ہوئے، ان کی گراں قدر تہذیبی خدمات کو سراہا ہے۔ مرثیوں کے بعد مثنوئ گلزارِنسیم کا تذکرہ بھی اسی حوالے سے ملتا ہے، اس میں لکھنوی تہذیب و تمدن، وہاں کے آداب، رکھ رکھاؤ اور رسم و رواج کی عمدہ جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کے علاوہ امانتؔ کے ڈرامے اندرسبھا کے ذریعے بھی اردو ادب پر لکھنوی تہذیب کے اثرات کو واضح کیا ہے۔ لکھنؤ کے شعر و ادب کا جائزہ لینے کے بعد عبدالباری نے اردو شاعری میں عوامی زندگی کی ترجمانی کرنے والے شاعر نظیرؔ اکبرآبادی کا ذکر کیا ہے، جو صرف اردو ادب ہی نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب کی ارتقا کے راستے پر ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ نظیرؔ اکبرآبادی نے ہندوستانی تہذیب کا جتنا بہترین نمونہ پیش کیا ہے، آج تک اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے، انہوں نے یہاں کے میلے ٹھیلوں سے لے کر عوامی زندگی کے ہر نشیب و فراز کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ نظیرؔ کی عوامی شاعری نے اردو زبان و ادب کو یہاں کی تہذیب سے بہت قریب کر دیا اور تہذیبی ارتقا کے مطالعے میں ان کی یہ خدمات بہت معاون ثابت ہوئی۔ نظیرؔ کے کلیات کو اس عہد کے ہندوستانی تہذیب کا آئینہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ نظیرؔ کے بعد ڈاکٹر سید عبدالباری نے غدر کے وقت ہندوستان کی جو فضا تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس وقت بڑے گراں قدر اور لافانی ادب وجود میں آئے۔ اس دور میں بہادر شاہ ظفرؔ اور مرزا غالبؔ نے اپنے دور کی تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی بڑے دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں غالبؔ کے خطوط بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں، جس کی نثر عوامی مسائل اور کیفیات سے قریب تر معلوم ہوتی ہے۔ غالبؔ کے ان خطوط کے ذریعے ہمیں اس عہد کے انقلاب کی بڑی واضح تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس وقت ذوقؔ کے قصائد میں بھی اس وقت کی تہذیب اور زمانے و حالات سے نبرد آزماں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نئی دنیا کے امکانات ملتے ہیں۔ مومن خاں مومن جن کی شاعری میں محض عشق و عاشقی کے مضامین دیکھنے کو ملتے ہیں، وہ بھی کہیں کہیں اشاروں ہی اشاروں میں اس عہد کی تہذیبی، اخلاقی اور معاشرتی کم مائیگی کی روداد بیان کر جاتے ہیں۔ اس عہد میں اردو شاعری اپنے شباب پر تھی، مگر تہذیبی اعتبار سے زوال کا دور تھا۔ اس زوال کے باوجود داغؔ اور امیرؔ مینائی نے اپنے عہد کی تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی نمائندگی اپنی شاعری میں جابجا کیں ہیں۔ اس عہد سے متعلق عبدالباری صاحب نے لکھا ہے:

غرض ۱۸۵۷ء کے ادب کا (جس میں حصۂ شعر زیادہ ہے اور حصۂ نثر کم) محور اگر

چہ اس دور کے مخصوص حالات کی بنا پر بڑی حد تک حکمراں طبقہ ہی رہا لیکن اسکے ساتھ ہی ساتھ عالم لوگوں کے حالات کے ساتھ دلچسپی بھی لی گئی۔عوامی زندگی کی معروف اقدار کی عکاسی کی گئی جو کہ اس دور میں فروغ پذیر تھیں۔زندگی سے قریب ہو کر روزانہ کے مسائل سے دلچسپی لی گئی اور بعض ہندوستانی رنگ میں خود کو رنگ لیا۔یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت تک ادب میں سماجی اور اجتماعی شعور کی کمی تھی مگر یہ حقیقت تو اسے اور بھی ہندوستان کی تمدنی اور تہذیبی تاریخ سے نزدیک کر دیتی ہے'' ۱۵

اس عہد کے بعد جس عہد کا عبدالباری صاحب نے ذکر کیا ہے، وہ غلامی اور غیر ملکی تہذیب کا دور ہے، جس میں ہندوستانی تہذیب ایک نئے موڑ پر دکھائی پڑتی ہے۔غدر سے پہلے یہاں کی علمی و ادبی تہذیب و ثقافت میں جس رفتار سے ترقی ہوئی تھی، اس نئی تہذیب کے آنے سے ساری قدیم روایاتیں منہدم ہوتی نظر آئیں۔انگریز اپنے ساتھ جو تہذیب لے کر آئے وہ مادیت،عقلیت اور تشکیک کے آغوش میں پروان چڑھی تھی، ہندوستان کے لوگ اس تہذیب کو کسی بھی طرح گوارہ کرنے کو تیار نہیں تھے عجیب کشمکش کا عالم تھا۔مگر اس کشمکش کے ساتھ ساتھ لوگوں میں بیداری کی لہر بھی دوڑ رہی تھی۔اسی عالم میں غالبؔ کا ایک شعر جو پورے اس ماحول کی نشاندہی کرتا ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسہ میرے آگے

ہر کسی کے اندر یہی کیفیت طاری تھی۔ایک طرف باہر سے آنے والے انگریز حکمرانوں کا اقتدار دوسری طرف اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی اخلاقی و روحانی اقتدار کی حفاظت کا بیدار ہونے والا جذبہ اردو ادب نے اس پورے موقعہ کا فائدہ اٹھایا اور اپنے اندر ان تمام موضوعات کو سمیٹ کر تہذیبی،قومی اور ملی جذبات و احساسات کا ترجمان بن گیا۔یہاں سے اردو زبان میں تہذیبی عناصر کا ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے، جس کے اثرات آج تک اردو ادب میں جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔اسی کشمکش اور بیداری کی دین ہے یہاں سے توہم پرستی اور فرسودہ رسم و راج اور روایت پرستی سے عوام کو چھٹکارا ملا اور عوام میں آزادی کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔لوگ وقت کے تقاضوں کو سمجھنے لگے۔اس زمانے میں سرسید تحریک نے لوگوں کو بیدار کرنے اور انہیں راہِ راست پر لانے کے لئے جو انتھک کوششیں کیں تھیں ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس کا جائزہ بڑی تفصیل سے پیش

کیا ہے۔سرسید اوران کے رفقاء نے اردوزبان وادب کے ذریعے جوخدمات پیش کیں ہیں ان پر اجمالی جائزہ لیتے ہوئے مختصراً روشنی ڈالی ہے۔سرسید تحریک کے زیرِ اثر حالؔی، آزادؔ اور شبلؔی کی جدوجہد اور کاوشوں نے اردو زبان وادب کو ایک ایسا مقام عطا کیا، جس سے وہ مستقبل میں ہندوستان کی تہذیبی ارتقا میں کافی اہم ومعاون ثابت ہوئیں۔

سرسید کی اس عظیم خدمات کا ہی نتیجہ ہے، اردوادب میں قومی شاعری کا رجحان پیدا ہوا اور اب شاعری حسن وعاشقی کے محدود دائرے سے نکل کر وسیع موضوعات کی طرف گامزن ہوتی ہے۔انگریزی تعلیم وتہذیب کے زیرِ اثر اس عہد کے شعرا وادبا نے انگریزی شعروادب کا مطالعہ کیا، جس کے نتیجے کے طور پر اردو شاعری کے لئے ایک نئی راہ ہموار ہوئی اور اب ان کے سامنے نئے موضوعات وخیالات کا انبار لگ گیا۔چنانچہ محمد حسین آزاد نے سرسید کے زیرِ اثر انجمنِ پنجاب کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد اردو شاعری میں نئے تقاضوں کو پورا کرنا تھا۔آزاؔد اور حالؔی نے انجمنِ پنجاب کے زیرِ اثر اردو شاعری میں کئی نئے تجربات کئے اور متعدد نظمیں لکھیں، جس میں نیچرل شاعری کا جیتا جاگتا تصور پیش کیا اور لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار کیا گیا جس سے قومی اور وطنی شاعری کی اہمیت وافادیت میں اضافہ ہوا اور اردو زبان وادب اس عہد کے تہذیبی عناصر سے مالا مال ہو گیا۔ اس زمانے میں سرؔور جہان آبادی کی نظموں کا بھی ذکر ڈاکٹر عبدالباری نے کیا ہے اور بتایا ہے کہ اردوادب کے تہذیبی و اخلاقی سرمائے میں سرؔور کی نظموں نے اہم اضافے کئے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے نظم طباطبائی، شادؔ عظیم آبادی اور وحیدالدین سلیم کے ناموں کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان لوگوں نے حالؔی اور آزاؔد کے رجحانات کو فروغ دینے میں کافی اہم رول ادا کیا ہے جس سے ان کی شاعری میں سماجی وتہذیبی زندگی کا پورا عکس صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

ایک طرف جہاں سرسید کے زیرِ اثر نئی تعلیم پر زور دیا جا رہا تھا اور اردوادب کو نئے موضوعات سے آشنا کرنے کی پرزور کوششیں ہو رہیں تھیں وہیں پر کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو انگریزوں کی اندھی تلقید کرنا گوارہ نہیں کرتے تھے، انہیں اپنی قدیم روایات سے رغبت تھی اور وہ نئی تہذیب کو کسی بھی طرح قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔غرض وہ اپنی زندگی میں کسی بھی طرح کی تبدیلی نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ اس نئی تہذیب کی کھل کر مخالفت بھی کر رہے تھے اور انگریزوں کی ہر وہ چیز جس سے ترقی کے امکانات روشن ہوتے ہیں، ان سے انہیں نفرت تھی ، وہ اس کا مذاق بنا کر ہوا میں اڑا دیتے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے اکبرؔ آلہ آبادی کا ذکر کیا ہے۔اکبرؔ

کواپنی قدیم تہذیب سے محبت تھی وہ یہ چاہتے تھے ہم نئی تعلیم ضرور حاصل کریں مگر اپنی جڑوں سے کبھی علیحدگی نہ اختیار کریں۔اکبرؔ نے اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے ذریعے ہندوستان کی تہذیبی قدروں کے تحفظ کے لئے قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری میں مغربی تہذیب سے مرعوبیب کی خوب مخالفت کی ،اس کی خامیوں سے لوگوں کو آگاہ کیا اور اپنی قدیم روایات کی خوبی اور اس کی چمک دمک سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا مگر اکبرؔ اس میں پوری طرح ناکام ثابت ہوئے۔اکبرؔ کے بعد نذیر احمد کے ناولوں کا بھی دور آتا ہے جن سے ہندوستانی تہذیب کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔

سرسید کے بعد ادبِ لطیف کا دور شروع ہوتا ہے۔جس کی سب سے بہترین نمائندگی ''اودھ پنچ'' سے ہوتی ہے۔اس اخبار کے ذریعے لکھنوی تہذیب وتمدن اور معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں لوگوں کے سامنے پھر جاتیں ہیں۔اس وقت کی مشرکہ تہذیب کی عکاسی اس اخبار میں بڑی خوبی کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے۔فسانۂ آزاد بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے،جس میں لکھنؤ کی لٹی ہوئی اور بچی کھچی تہذیب کا نقشہ دیکھنے کوملتا ہے۔اس ناول میں نہ تو قدیم تہذیب کی اخلاقی قدریں اور نہ ہی مغربی تہذیب کے اثرات نمایاں ہیں ۔ادبِ لطیف کا ذکر کرتے ہوئے عبدالباری نے مرزا ہادی رسوا کا مایہ ناز ناول ''امراؤ جان ادا'' کا بھی جایزہ پیش کیا ہے۔رسواؔ نے اس ناول کے ذریعے حقیقت نگاری سے اردو ناول نگاری کو آشنا کیا نیز لکھنوی تہذیب کا ایک نکھرا ہوا روپ پیش کیا۔اس وقت ملک میں آزادی کا انقلاب آچکا تھا،اس لئے قومی شاعری کا نظریہ بھی اپنے عروج پر تھا،ڈاکٹر عبدالباری نے چکبستؔ جیسے عظیم اور حب وطنی کے جذبے سے شرسار شاعر کا ذکر اس لحاظ سے ضروری سمجھا کہ ان کی شاعری میں ہندوستان کی عظمت اور تہذیبی پائیداری مکمل طور پر دیکھنے کو ملتی ہے،اس لئے چکبستؔ اردو زبان میں تہذیبی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں،چکبستؔ کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایسے وقت میں چکبستؔ ایسی شخصیت ہمیں اپنے خلوص اپنے دلگدازی اور وسیع القلبی کی صدا بلند کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔یہ دور قومی اور وطنی بیداری کا دور تھا۔ہندوستان کے اندر احساسِ غلامی اور شعور بیداری پیدا ہو چکا تھا ۱۹۱۸ءتک آتے آتے قومیت اور وطنیت کے تصورات اس طرح ہندوستان گیر تحریک بن کر چھا گئے جیسے کہ کچھ دن پہلے تصوف کے اثرات عام ہوگئے تھے۔چکبستؔ ان تصورات کے علمبردار ہیں۔ان کا خلوص اور ان کی ہندوستانیت اور جذبۂ وفاداری ان کے کام میں جان ڈال دیتی ہے۔ان کا ہر

شعر فرقہ وارانہ منافرت اور تعصب کے سینے میں خنجر کی مانند داخل ہوتا ہے۔ان کے اشعار سے اخلاق ٹپکتا ہے اور محبت و ہمدردی جھلکتی ہے۔اس ملک کی دو قوموں کے اندر وہ مشترکہ اقدار حیات تلاش کرتے ہیں'' ١٦

ان حالات سے گزرنے کے بعد اردو شاعری نے ایک نئی کروٹ لی۔غدر کے بعد حالؔی، آزادؔ اور اکبؔر نے اردو شاعری میں جس تہذیبی اقدار کی بنیاد ڈالی تھی اس پر ایک مستحکم مینار تعمیر ہونے کے امکانات روشن ہوئے۔ایسا محسوس ہوتا ہے شاعری نے فکر وفن کے میدان میں ایک لمبی چھلانگ لگا دی ہے ۔یہ لمبا وقفہ ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے حالؔی اور اقبالؔ تک ایک دوسرے سے آپس میں مربوط نظر آتا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے اقبالؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں سے اردو شعر وادب میں ایک نئی فکری بالیدگی کا احساس ہوتا ہے۔انہوں نے اقبالؔ کی شاعری اور ان کے تمام فلسفوں کی روشنی میں اردو زبان وادب کے تہذیبی جذبات کی عمدہ نشاندہی کی ہے۔وہ اقبال سے متعلق لکھتے ہیں:

''اقبال کی شاعری مثبت وتعمیری شاعری ہے ۔تہذیب وتمدن کے ارتقا میں معاون ثابت ہونے اور ملک وملت کی رگوں میں صحت مند خون دوڑانے کی خاطر وہ ادیب وشاعر کو ایک برگزیدہ واہم منصب پر فائز کرتے ہیں ۔ان کے ہر شعر سے ان کا اضطراب، تڑپ، بے چینی وحرارت ظاہر ہوتی ہے۔'' ١٧

غرض اقبال کی شاعری قومی اور حب الوطنی کے جذبے سے لبریز ہے۔انہوں ''نیا شوالہ''، ہمالیہ'' جیسی بلند پایہ نظمیں تخلیق کیں، جن میں تہذیبی جذبات کی بہترین عکاسی دیکھنے کو ملتی ہیں۔انہوں نے اپنی ابتدائی نظموں میں ہندوستان کے جن مناظر کا ذکر کیا ہے، اس سے ان کا تہذیبی تصور نکھر کر سامنے آتا ہے۔ان کی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس کے مطالعے سے تہذیبی تعمیر کے لئے راہ ہموار ہوتی ہوئی ملتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالباری نے اقبال کے زیرِ اثر اردو زبان وادب میں قومی شاعری کا جو نظریہ بیدار ہوا تھا، اس کی تصویر یر کشی کرتے ہوئے حسرتؔ موہانی، فانؔی، اصغؔر اور جگؔر کی شاعری میں تہذیبی عناصر کو تلاش کر کے مختلف اشعار کے ذریعے واضح کیا ہے۔

اس کے بعد عبدالباری نے ادب میں صالح تعمیری نظریہ کا ذکر کیا ہے، جس میں انہوں نے ابوالکلام

آزاد، مولانا محمد علی جوہر، عبدالماجد دریا آبادی، عبدالسلام ندوی، ظفر علی خاں کی ادبی وصحافتی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ اس عہد میں اسلامی فکر ونظر کی علمی واستدلالی انداز میں ایک مربوط ومرتب تہذیب نکھر کر سامنے آئی۔ اس کے بعد عبدالباری نے انقلابِ روس سے متاثر ہو کر ادب میں آنے والی ترقی پسند تحریک کا جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ تحریک جدید افکار ونظریات کی روشنی میں انقلاب آفریں تہذیبی تصورات اور فنی تجربات کا محور بن کر بڑی تیزی کے ساتھ ادب میں ابھری۔ عبدالباری نے اس باب میں تمام ترقی پسند قلمکاروں کی شعری ونثری کارناموں کو پیش کیا ہے اور اس عہد کے ادب کی خوبیوں اور خامیوں کی نشان دہی اپنے موضوعات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

آخر میں انہوں نے تعمیری ادب کے نظریہ کو پیش کیا ہے۔ جس کے وہ خود ایک روح رواں تھے۔ اس تحریک سے منسلک تمام قلمکاروں نے حالؔی، شبلؔی اور اقبالؔ کا تتبع کیا۔ ان بزرگوں نے اپنی شاعری میں جس تہذیبی واخلاقی تصورات کو واضح کیا تھا اور فکر ونظر کے جو پیمانے بنائے تھے، اسی مذہبی اقدار کی روشنی میں تعمیری ادب کے قلم کار شعر وادب کی تخلیق کر رہے تھے۔ اس تحریک کے نظریات توحید پر قائم تھے۔ غرض یہ تحریک اسلامی تہذیب کی نمائندگی ادب میں کر رہی تھی اور تہذیب کی روشنی میں اس عہد کے شعرا نے مروجہ فن اور تکنیک کی بنیاد پر صالح وتعمیری ادب کی تشکیل کی۔ ان تمام تحریکات اور رجحانات کا جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر سید عبدالباری اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو زبان وادب ہندوستانی تہذیب کے عناصر کا مجموعہ ہے۔ جس نے اس ملک میں ہر مذاہب کے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب رکھنے کی حتیٰ الامکان کوشش کی ہے اور تہذیبی نفاق ڈالنے کے بجائے تہذیبی وحدت کا پیغام عام کیا ہے۔ غرض ہندوستان کی تہذیبی ارتقا کا تعلق کسی بھی دور میں ادب سے منقطع نہیں ہوا ہے اور ہر عہد میں ادب نے اس کی نمائندگی کی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید عبدالباری آخر میں اپنے خیالات کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اردو ادب نے ہندوستانی فضا میں سانس لی ہے اور زیادہ تر یہیں کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ کہنا اردو کے ساتھ شدید زیادتی ہے کہ اس نے غیر ملکی فضا میں پرورش پائی ہے اور ہندوستانی کے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ سرور صاحب کے مطابق اردو ادب ہندوستان کے آئینہ خانے کا ایک آئینہ ہے اس میں سارے ہندوستانیوں نے حصہ لیا ہے اور یہ سارے ہندوستانیوں کا ادب ہے اس پر یہ الزام بھی درست نہیں کہ اس نے محض مسلمانوں کی تہذیب معاشرت اور ذوق اور مزاج کی نمائندگی کی ہے۔ اس نے ملک کے

رہنے والوں کی مجموعی طور پر عکاسی کی ہے۔ یہاں کے قدرتی مناظر سے فائدہ اٹھایا ہے اور یہاں کے تاریخی سرمایہ کے صحت مند حصوں کو اخذ کیا ہے۔ڈاکٹر تاراچند کے الفاظ میں مشکل سے ہندو معاشرت کا کائی ایسا جز ہوگا جسے اردو کے ذریعے اظہار کا موقع نہ ملا ہو۔''۱۸

ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب ان نتائج کو اخذ کرنے کے بعد مشورہ بھی دیتے ہیں کہ ہندوستان کی تہذیبی ترقی میں اردو کو کس طرح حصہ لینا چاہیئے۔اس موضوع پر انہوں نے بڑی فلسفیانہ گفتگو کی ہے۔ مستقبل میں اردو ادب میں تہذیبی عناصر کی بازگشت لانے کے لئے یہ مشورے کافی اہم ثابت ہو سکتے ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری کی اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ذرا بھی اندازہ نہیں ہوتا، انہوں نے اس مقالے کو اس وقت لکھا جب وہ بی اے کے طالبِ علم تھے۔اس کتاب کے پورے مطالعے میں کہیں بھی کسی بھی طرح کی ناپختگی کا احساس نہیں ہوتا ہے بلکہ ایسا معلوم ہو رہا ہے یہ کتاب کسی بڑے مفکر یا محقق نے لکھی ہے۔زبان و بیان بھی کافی سلجھا ہوا ہے۔ایک بات جو ان کی ہر تصنیف میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ ان کا تعمیر پسند نظریہ ہے، جو اس میں بھی ہر جگہ نمایاں ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔مگر اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے ڈاکٹر سید عبدالباری کی اس تصنیف کو اس عہد میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔غرض ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنی اس تحقیق کے ذریعے اردو ادب کے ثقافتی اور عمرانی مطالعے میں ایک اہم اضافہ کیا ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیئے۔

لکھنؤ کا شعر وادب (عہدِ نوابینِ اودھ کے معاشرتی وثقافتی تناظر میں)

ڈاکٹر سید عبدالباری نے ''اردو ادب کا تہذیبی تناظر'' جس وقت قلم بند کیا اس وقت وہ بی اے کے طالبِ علم تھے، مگر ان کی یہ کتاب ''لکھنو کا شعر وادب'' ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان ہے۔ جس پر انہوں نے مسلسل چھ سات سال تک کام کر کے معرکتہ الآرا کتاب لکھی۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کی یہ تصنیف بھی اپنے موضوعات کے اعتبار سے کہیں نہ کہیں اسی کتاب کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے چار تحقیقی مقالے لکھے ہیں اور اپنے موضوعات کے اعتبار سے یہ سبھی یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کی تہذیب وثقافت کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی دوسری تصنیف ''لکھنؤ کا شعر وادب'' ہے، جس میں انہوں نے نوابینِ اودھ اور اس عہد کے معاشرتی وثقافتی تناظر میں ادب کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کی صرف اسی تصنیف سے نہیں بلکہ سبھی کتابوں سے ادب میں تہذیبی وثقافتی اور عمرانی مطالعے کی راہ آسان ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری سے قبل بھی نورالحسن ہاشمی ''دہلی کا دبستان شاعری''، ابواللیث صدیقی نے ''دبستان لکھنؤ'' اور محمد حسن نے ''دہلی کی ادبی وثقافتی روایات پر معرا کتہ الآرا کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبدالباری کی یہ تصنیف اگلی کڑی کی اہمیت رکھتی ہے۔ انہوں نے ادب کے عمرانی و ثقافتی روایت کا سلسلہ جاری رکھا اور اس لحاظ سے'' لکھنؤ کا شعر و ادب''، ''لکھنؤ کے ادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر'' اور ''بیسوی صدی کے اردو ادب کا جائزہ'' خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تینوں کتابیں اپنے عنوان کے اعتبار سے ایک معلوم پڑتی ہیں، مگر اس میں ذرا سے فرق کے ساتھ باتوں کو واضح کیا گیا ہے جس کا آئندہ صفحات پر ذکر کیا جائے گا۔

سب سے پہلے ان کی کتاب لکھنؤ کے شعر وادب پر گفتگو کرتے ہوئے، ڈاکٹر عبدالباری کے ثقافتی وعمرانی مطالعے کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ کتاب کافی ضخیم اور موضوعات کے اعتبار سے کافی طویل ہے۔ جو تقریباً ساڑھے چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اودھ کے پورے دو سو سال کے ادب کا جائزہ وہاں کی تہذیب وثقافت کے آئینے میں پیش کیا ہے۔ اس تصنیف کی مقبولیت اس وقت ہوئی، جب اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۲ء میں نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ امبیڈکر نگر سے شائع ہوا۔ یہ پریس خود ڈاکٹر سید عبدالباری کا ذاتی تھا، جو ان کے بڑے بھائی چلاتے تھے۔ اس کتاب کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے، اس کا دوسرا ایڈیشن الفلاح پبلیکشن

،دہلی نے ۱۹۹۶ء میں شائع کیا۔مگر یہ ایڈیشن بھی ہاتھوں ہاتھ ختم ہوگیا اور بڑی مشکل سے دستیاب ہونے لگا۔ مجھے یہ کتاب ان کے آبائی وطن ٹانڈہ میں خستہ حالت میں ملی۔اس کمی کو پیشِ نظر رکھ کر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی نے اس کا تیسرا ایڈیشن ابھی حال ہی ۲۰۱۵ء میں ازسرِ نو شائع کیا ہے۔اس ایڈشن کی منظوری قونسل کی طرف سے ان کی زندگی میں ہی مل گئی تھی، وہ اس پر نظرِ ثانی ہی کرر ہے تھے کہ اچانک ان کی طبعیت خراب ہوئی، دل کا شدید دورہ پڑا اور فوراً انتقال کر گئے۔بہرحال یہ کتاب شائع ہوکر منظرِ عام پر آئی اور اب اس کتاب کی مقبولیت و اہمیت میں روز بہ روز اضافہ بھی دکھائی دے رہا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں اور صحافت کی دنیا میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں ہیں، اگر وہ صرف اس کتاب کے بعد کچھ بھی نہ لکھتے، پھر بھی ان کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔یہ کتاب ابواللیث صدیقی کی کتاب ''دبستانِ لکھنؤ'' کی ہم پلہ ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ لکھنؤ کے شعروادب کا مطالعہ اس کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا تو یہ بھی غلط نہ ہوگا۔

''لکھنو کا شعروادب'' پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔اس کتاب کے ابتدا میں ہی مصنف نے واضح کردیا ہے کہ اس کتاب میں لکھنؤ کے شعروادب کا جائزہ وہاں کی تہذیبی و معاشرتی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔اس میں انہوں نے نہ صرف لکھنؤ کے شعروادب کا مطالعہ کیا ہے بلکہ جہاں جہاں بھی ضرورت پڑی وہاں دبستانِ دہلی سے اس کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے اور اس کے دوررش نتائج بھی اخذ کئے ہیں۔مگر وہ کہیں بھی اپنے مقصد سے ہٹتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں۔پوری تصنیف میں لکھنؤ کے طرزِ معاشرت اور اور وہاں کے ادب کے ارتکاز کا خیال رکھا ہے۔اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو انہوں نے لکھنؤ اور فیض آباد جو اس وقت اودھ میں شمار ہوتا تھا نیز اس کے گردونواح کا پورا علاقہ جس کے اثرات ادب میں نمایاں ہورہے تھے اس کو بھی انہوں نے اجاگر کیا ہے۔ڈاکٹر عبدالباری کی تحقیق کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ اس عہد میں وہ کون سے نمایاں رجحانات تھے۔جس کے سماجی وتمدنی احوال اس کے ادب میں نمودار ہوئے۔اس لئے سب سے پہلے انہوں نے معاشرے کی اہمیت پر گفتگو کی اور اس کے بعد اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''معاشرہ انسان کی اجتماعی زندگی کا اولین تقاضا ہے۔وہ بغیر معاشرہ کے وجود کے اپنی زندگی بحیثیت انسان بسر نہیں کرسکتا اور جب وہ اپنے ہم جنسوں سے ربط وتعلق میں آتا ہے تو معاشرہ فطری طور پر خود بخود وجود میں آجاتا ہے۔آدمی اپنی فطرت سے مجبور

ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ اجتماعی زندگی گزارے۔اس کے لئے تنہا زندگی گزارنا تقریباً ناممکن ہے۔کوئی بھی فرد متوازن اور ہم آہنگ زندگی معاشرہ سے قطع تعلق کر کے گزار ہی نہیں سکتا۔کیوں کہ معاشرہ صرف افراد کے مجموعے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ روابط کے اس نظام کا نام ہے جو افراد اوران کے مجموعہ کے درمیان پایا جاتا ہے‘‘۔۱۹

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے انسان کی زندگی میں معاشرے کی کیا اہمیت ہے۔یہ اس کی اجتماعی زندگی کا اہم تقاضا ہے۔جس پر وہ زندگی گزارنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔اپنی ان باتوں کو مدلل بنانے اوراس کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے مختلف مغربی اور مشرقی مفکروں کے افکار ونظریات کا سہارا لیا ہے۔جس سے ان کی تحریر میں استقلالیت پیدا ہوگئی ہے۔معاشرے کے بعد وہ ثقافت کی تشریح کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ جب معاشرہ اپنے تمام مراحل سے گزرتا ہے تو ثقافت کا وجود لازمی طور پر ہوتا ہے۔یہ ثقافت معاشرے میں رہنے والے افراد کے علوم وفنون ،طور وطریقے اوران کے عقائد ونظریات ،رسم ورواج اور عادات واطوار کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے اور ہر فرد اس معاشرے میں ایک رکن کی حیثیت سے اسے انجام دینے کے لئے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

’’معاشرے کے اعلیٰ ترین مرحلوں میں ثقافت وجود میں آتی ہے۔یہ ثقافت بقول ٹائلر دراصل ان علوم ،عقائد،فن ،اخلاقیات ،قانون ،روایات اور ہراس عادت و صلاحیت پر محیط ہوتی ہے جو معاشرہ کے ایک رکن کی حیثیت سے فرد انجام دیتا ہے۔‘‘جب معاشرہ اجتماعی تعامل کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے تو افراد ایک دوسرے کے ساتھ عمل وردِعمل کرتے ہیں اوراس کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ ایک فرد کردار کے انداز سیکھتا ہے بلکہ کس طرح کے اعمال کن مواقع کے لئے موزو ومناسب ہیں انہیں بھی پہچانتا ہے اور اختیار کرتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ثقافت سے پہلے معاشرہ عالمِ وجود میں آتا ہے لیکن جب فرد نشو ونما کے مختلف مدارج سے گزرتا ہے تو وہ تجربات اور طریق ہائے عمل کے ایک سرمایہ کو بھی اپنے ذہن اور یادداشت میں محفوظ کرتا ہے۔اور یہ سرمایہ ایک مدوری (cyclical) انداز میں فرد کے گرد گردش کرتا ہے جس کے ذریعہ وہ معاشرے کی ثقافت کے درمیان تسلسل کا وسیلہ بن جاتا ہے‘‘۔۲۰

اس طرح ڈاکٹر سید عبدالباری نے ثقافت کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ثقافت کم سے کم دو یا

دو سے زیادہ افراد کے تال میل سے وجود میں آتی ہے اور وہ بتاتے ہیں کہ ثقافت جبلت کی تابع داری سے فرد کو آزاد کرتی ہے، ان کے مطابق ثقافت کی تعمیر وترقی میں فرد کو اپنی بہت سی نفسانی خواہشوں کو دبانا پڑتا ہے جوان کے اندر فطری ہوتا ہے اور اس کے لئے اسے جدوجہد کرنا پڑتا ہے۔غرض انہوں نے ثقافت پر طویل گفتگو کرتے ہوئے اس پر مفصل و مدلل بحث کرنے کے بعد ادب میں معاشرے اور ثقافت کے باہمی رشتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔اس موضوع پر تمام ناقدوں اور مفکروں کی مناسبت سے وہ لکھتے ہیں کہ ادب سماج کا آئنہ دار ہوتا ہے اور معاشرے کے افراد کے اظہارِ خیال وابلاغ کا ذریعہ بھی ہے۔اس ضمن میں انہوں نے ادب کی بنیاد زبان کو دیا ہے۔جس کے بغیر کوئی بھی فن پارہ وجود میں نہیں آسکتا ہے،اس لئے اس موضوع پر انہوں نے تفصیلی گفتگو کرنا ضروری سمجھا اور بڑی سنجیدگی سے اس پر غور وخوص کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس طرح وہ ادب کی ہئیت یا فارم پر جب گفتگو کرتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ یہ بھی سماج کے مختلف عوامل اور تعامل سے منظرِ عام پر آتا ہے اور ادب میں ایک روایت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔غرض سبھی ادبی فن پارے اپنے سماج کی عکاسی کرتے ہیں اور معاشرتی زندگی کے تمام پہلوؤں اور مختلف سطحوں کو واضح کرتے ہیں۔ان ادبی فن پاروں سے کسی عہد میں تخلیق ہونے والے ادب سے اس زمانے کے نظام،سماج کے عادات واطوار اور ان کی سبھی خوبیوں اور خامیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے کسی خاص عہد کے ادب اور سماج کے آپسی تعلق کو سمجھے کے لئے تین نقطے پر غور وفکر کرنا لازمی قرار دیا ہے اور مغربی مفکر آئن واٹ سے اتفاق رکھتے ہوئے وہ تین باتیں اس طرح واضح کرتے ہیں:

> ''کسی خاص عہد کے ادب اور سماج کے رشتہ پر غور کرتے وقت آئن واٹ کے مطابق تین خطوط پر غور وفکر کرنا ضروری قرار پاتا ہے۔پہلی بات تو یہ دیکھنے کی ہوتی ہے کہ ادیب کو اس عہد کے معاشرے میں کیا حیثیت حاصل ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ اس کا اپنے قارئین سے کس طرح کا رشتہ ہے۔تیسرے یہ اس عہد کے ادب من حیث الجموع معاشعرتی رول کیا ہے اور کس حدتک معاشرتی اقدار ادبی اقدار سے ہم آہنگ ہیں۔'' ۲۱

غرض کسی سماج کا گہرا مطالعہ اور ادیب کی سماجی و معاشرتی اہمیت کا اندازہ لگائے بغیر کسی بھی فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس سلسلے میں نہ صرف ادیب یا فن کار کے عادات واطوار اور اس کے رہن سہن کا مطالعہ کرنا ضروری ہے بلکہ اس کی معاشی زندگی کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے اور اس کے قارئین کی اس سے کس حدتک مرعوبیت ہے اور کیوں ہے۔ان سب باتوں کا خیال رکھ کر ہی کسی ادب کا سماجی مطالعہ کرنا

خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالباری نے لکھا ہے کہ ہر سماج مختلف طبقوں میں منقسم ہوتا ہے۔ جس میں امیر، غیر یب، شہری اور دیہی طبقے کا ذکر انہوں نے کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان میں تمام طبقات کے درمیان آپس میں بڑی کشمکش رہتی ہے جس کا عکس ادب میں بالکل واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''معاشرہ ایک اور جہت پر دو مختلف جمیعتوں میں منقسم ہوتا ہے۔ پہلی جمیعت شہری اور دوسری جمیعت دیہی طبقوں کی ہوتی ہے۔ پہلے طبقے میں رسوم و رواج اقدار و معیار میں تیز رفتار تیزی ہوتی رہتی ہے کیوں کہ مدنی طبقہ میں انتقال مکان کرنے والے منجبلت آتے اور جاتے رہتے ہیں جن کے اثرات معاشرہ کے مختلف ثقافتی پہلوؤں پر بھی پڑتے رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف دیہی طبقہ اپنے اعتقاد، رسوم و رواج اور اقدار و معیار سے بڑی حد تک وابستہ رہتا ہے۔ اس میں فکری و تصوری تبدلیاں بے حد سست رفتاری سے ہوتی ہیں کیوں کہ اس کی بنیادی ہیئت میں تبدیلی کے تیز رفتار امکانات نہیں ہوتے ہیں۔'' ۲۲

ڈاکٹر عبدالباری کے مطابق شرفا میں وہی ادب مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ جس کا تعلق شہری زندگی سے ہوتا ہے۔ جسے انہوں نے مدنی زندگی کہا ہے۔ ایسا ادب اشرافیہ کے اردگرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے اور اس میں اس طبقے کی منظر کشی دکھائی دیتی ہے۔ اسی مناسبت سے اس کے ادب میں اسی طبقے کے اشارات و کنایات استعارات و تلمیحات سب کچھ دیکھنے یا پڑھنے کو ملتے ہیں۔ دراصل جو ادب اس میں تخلیق ہو رہا ہے اس کے قارئین یا سامعین کا ایسا طبقہ ہوتا تھا۔ جس کا تعلق اس عہد کے امرا یا نوابین اور سلاطین سے ہوا کرتا تھا۔ اس لئے تخلیقات کو ان کے شایانِ شان بنانے کے لئے فن کار کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی پسند اور ان کے عمل اور ردِ قبول کو ہر حال میں پیشِ نظر رکھنا ہوتا تھا۔ یہی سبب ہے ایسا ادب مدنی اشرافیہ طبقے کی نمائندگی سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

ادب، معاشرے اور ثقافت کا باہمی تعلق واضح کرنے کے بعد ڈاکٹر عبدالباری اصل موضوع پر آتے ہیں اور اودھ کے معاشرے اور ثقافت کی خصوصیات کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اس تصنیف میں جس عہد کا جائزہ لیا ہے وہ نواب شجاع الدولہ کے عہد سے واجد علی شاہ کے عہد تک کے معاشرے پر محیط ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے لکھنؤ کے پورے معاشرے کی تمام خصوصیات اور وہاں کے رسم و رواج اور ذات پات، شادی بیاہ ، اور مذہب کو لے کر جو کشمکش تھی، ان سب کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

اس ضمن میں انہوں نے اودھ کے معاشرے کے ساتھ ساتھ وہاں کے اقتصادی حالات کا جائزہ بھی لیا ہے اور لکھتے ہیں کہ ملک کی دیگر ریاستوں کی بنسبت یہاں پر صورتِ حال بہت اچھی تو نہیں تھی مگر غنیمت تھی۔لیکن جب پورے ہندوستان کا گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنوٗ کا معاشرہ بھی معاشی اور اقتصادی ہیجان کا شکار تھا۔اودھ کی اقتصادی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے اس کے زوال کی مختلف وجوہات اور اسباب وعوامل کی نشان دہی کی ہے۔جس کے سبب عوام میں بے چینی و بے قراری پائی جاتی تھی اور ان حالات میں معاشرے کے افراد کس طرح عدم توازن کا شکار ہوتے ہیں ان سب باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لکھنوٗ میں جو نشاط انگیزی اور عیش وعشرت کا ماحول دکھائی دیتا ہے وہ یہاں کے اقتصادی حالات کی وجہ سے صناعی اور بناوٹی ہے۔وہ یہاں کے اقتصادی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ان وجوہات کو واضح کرتے ہیں جس سے یہاں کے معاشی حالات کافی پیچیدہ ہو چکے تھے۔وہاں کے حکمرانوں کی فضول خرچی،حسن پرستی،کاہلی اور عیش پرستی کو انہوں نے اقتصادی زوال کا اہم نکتہ بتایا ہے۔

مصنف نے اقتصادی حالات کے بعد اس عہد کے زراعتی حالات اور صنعت وحرفت کی پوری تصور یرکشی کی ہے اور اس کا تجزیہ پیش کیا ہے۔اس ضمن میں انہوں بتایا ہے کہ آب و ہوا اور اپنی زرخیزی کے اعتبار سے یہاں کے زیادہ تر لوگوں کے روزی روٹی کا ذریعہ کھیتی باڑی تھی۔مگر اس عہد میں یہ کام کچھ ایسے طبقے تک محدود تھا جو نیچی ذات کے لوگ تھے اونچی ذات کے لوگوں میں صنعت کاری کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ان سب باتوں کے علاوہ انہوں نے یہاں کے سبھی کاروباروں اور ان کی تجارت کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے اس اعتبار سے یہاں کے حالات کافی مطمئن بخش تھے۔صنعت کی ان تمام ترقیات کو عبدالباری صاحب مدِ نظر رکھتے ہوئے افسوس ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر اس عہد کے تمام ایجادات کو اٹھارویں صدی کے یوروپ کے سامنے رکھ کر دیکھیں تو احساس ہوتا ہے یہ معاشرہ اب بھی بہت پیچھے ہے۔لوگ امراوسلاطین کو خوش کرنے کے لئے نہ جانے کیا کیا بنادیتے تھے۔مگر عوام کی سہولیت اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے صنعت وحرفت کو فروغ دینے کی فکر کسی کو نہ تھی۔اس عہد میں انگریز یہاں پوری طرح مسلط ہو چکے تھے۔مگر کسی نے یہ نہیں سوچا ان کی مدد سے کوئی کارخانہ لگایا جائے۔جس سے یہاں کی صنعت میں اضافہ ہو۔غرض ان حالات میں اودھ کے معاشرے میں تصنع،بے عملی تعیش پسندی اور غفلت شعاری کی جو خرابیاں رونماں ہوئیں اس سے اس عہد میں زبردست سیاسی زوال ہوا۔جس سے معیشت پوری طرح تباہ وبرباد ہو چکی تھی اور عوام کی آمدنی کا ذریعہ بند ہو چکا تھا۔اس سیاسی بحران میں مصنف نے لکھا ہے کہ آداب مجلس اور تکلفات کو خوب فروغ حاصل ہوا اور تمام فنونِ لطیفہ کو اس سے

کافی فروغ حاصل ہوا۔

اودھ کے سیاسی زوال پر غور وخوض کرنے کے بعد ڈاکٹر عبدالباری اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اودھ کے سیاسی ومعاشی زوال کا سبب عسکری نظام تھا۔کیوں کہ اب اس نظام میں انتشار پیدا ہو چکا تھا۔اودھ کے سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے اودھ کی ثقافت پر جو ایرانی اثرات مرتب ہوئے ہیں اس کا جائزہ پیش کرتے ہیں اور اس کی اصل وجہ بتاتے ہیں کہ اس سلطنت کے بانی سعادت یار خاں برہان الملک ایران سے ہندوستان آئے تھے اور اس سے پہلے مغل خاندان پر ایرانی اثرات پوری طرح مسلط تھے۔چناچہ انہوں نے جو قائدے قانون بنائے وہ ایرانی تہذیب وثقافت کی طرز پر تھے، اسی لئے یہاں پر ایرانی اثرات اگر نمایاں ہوتے ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔اس عہد میں یہاں کے معاشرے پر جو ہمہ گیر ثقافتی جمود طاری ہو گیا تھا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس عہد کی منجمد ثقافت میں زندگی حرکی (dynamic) تصور کو خیر آباد کہہ دیا گیا تھا اور ایسے مشاغل پر ساری توجہات مرکوز ہو گئیں تھیں جو انسانی شریانوں کے لہو کو یخ بستہ بنانے والے تھے۔نمود ونمائش وزیبائش کا شوق جنوں کی حد تک پہنچ گیا تھا۔جلال کو جمال پر استحکام و پائیداری کو نزاکت ونفاست پر قربان کر دیا گیا تھا۔لباس نہایت ہلکے پھلکے اور نازک ولطیف چال ڈھال نہایت معشوقانہ،خورد ونوش میں نہایت نفاست و لطافت، زبان ولہجہ نہایت نرم وشیریں غرض پوری زندگی ایک کارگہہ شیشہ گری بن کر رہ گئی تھی۔اس تمدن کے اسٹیج پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انسانوں کے بجائے موم کی پتلیاں نہایت پر تصنع ماحول میں زندگی کے ایک نشاطیہ اور رومان انگیز ڈرامہ میں اپنا پارٹ ادا کر رہی تھیں۔طاقت غلبہ واستیلا کا تصور اس معاشرے سے رخصت ہو چکا تھا۔قہرمانی اور جاہ و جلال کی اس عہد کے درباروں میں پر کوئی پرچھائیں بھی نہیں تھی۔انفعالیت ومجہولیت حسن کردار بن گئی تھی۔جانوروں کی لڑائی کے تماشے اور قدیم فنون حرب وضرب کی بے مقصد نمائش بھی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کی چنگاریاں دلوں میں نہ پیدا کر سکتیں تھی۔''

۲۳

غرض ڈاکٹر عبدالباری نے اس عہد کی جتنی برائیاں معاشرے میں موجود تھیں، ان سب کو اودھ کی ثقافت

اوراس کے جمود کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔اس عہد کے زوال میں موسیقی اور رقص اس منجمد ثقافت کو اور بھی فروغ دے رہے تھے۔موسیقاروں اور طوائفوں اوران کی نوک جھونک پر شہر میں عوام وخواص جان نچھاور کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔کوئی بھی محفل طوائفوں اور موسیقاروں کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی تھی۔اگر کوئی شخص اپنے یہاں شادی یا کسی اور پروگرام میں ان سب کا اہتمام نہیں کرتا اسے معاشرے میں تہذیب وشائستگی کی سند نہیں مل سکتی تھی۔غرض معاشرے میں باوقار بن کر رہنے کے لئے یہ سب کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔طوائف اس معاشرے کا جز ولاینفک بن گئی تھی۔اس عہد میں تسکین کا سب سے بڑا وسلیہ تھی۔عبدالباری صاحب نے اودھ میں طوائفوں اوراس سے یہاں کے معاشرے اورثقافت پر پڑنے والے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کی اصل وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں حسن وجنس سے دلچسپی لینا معاشرے میں ایک عام بات ہو چکی تھی۔اس کولوگ کوئی عیب نہیں مانتے تھے۔اس لئے لوگوں نے اپنی نفس پروری کے سارے ساز وسامان اس میں مہیا کر رکھا تھا۔طوائفوں کے ساتھ ساتھ اددھ میں موسیقی کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا۔واجد علی شاہ نے تو اس فن کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔عبدالباری نے لکھا ہے کہ واجد علی شاہ خود اس فن میں ماہر تھے اور کئی راگنیاں تخلیق کرنے کے ساتھ اس پر کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔اس فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔واجد علی شاہ نے موسیقی کا ایک اسکول قائم کیا اور خود معلم کی حیثیت سے درس وتدریس کی خدمت خود انجام دیتے تھے۔اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

''اودد میں موسیقی نے بھی طوائفوں کی طرح بے حد فروغ حاصل کیا شجاع الدولہ جب فیض آباد میں اقامت گزیں ہوئے تو ان کی قدردانی کے سبب ہندوستان کے گوشے گوشے سے اس فن کے ماہر یہاں جمع ہو گئے۔ویسے اودھ میں پہلے سے اجودھیا ،بنارس، جون پور وغیرہ میں موسیقی کے بڑے بڑے مراکز تھے لیکن دہلی کے گانے والوں کی آمد سے یہاں موسیقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔فیض بخش نے اپنی تاریخ فرح بخش میں لکھا ہے کہ فیض آباد میں ہزار گانے والی رنڈیوں اور اربابِ نشاط کی بھیڑ جمع تھی۔نواب وزیر کے علاوہ جب سرداران فوج اور امرا بھی کسی طرف کوچ کرتے تو ان کے ساتھ طوائفوں کے علاوہ موسیقی کا بھی ایک قافلہ ہوتا۔آصف الدولہ کو اس فن سے اس قدر دلچسپی تھی کہ اس نے فارسی زبان میں موسیقی پر مشہور کتاب ''اصول النغمات الآصفیہ'' لکھوائی جو بقول شرر آج بھی بے بدل ہے۔غازی الدین حیدر ونصیر الدین حیدر تو گانے کے رسیا تھا انہوں نے اس فن کو پوری سرپرستی کی۔اس عہد میں ہزاروں کی تعداد میں گانے والے

شہروں میں پائے جاتے تھے۔اودھ کے آخری تاجدار نے تو گویا اس فن کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا۔‘‘ ۲۴

جب نوابین خود اس طرح عیش وعشرت کی محفلوں میں ڈوبنے لگے تو آہستہ آہستہ معاشرے سے بہادری وشجاعت اور سپاہیانہ جاہ وجلال ختم ہوتا گیا اور یہاں بے کاری کے علاوہ کوئی مشغلہ نہیں رہ گیا تھا۔لوگ صرف دکھاوے کی زندگی بسر کرر ہے تھے۔امرا،وزراء،فوجدار اور مالدار صرف نام کے اپنے عہدوں اور منصب پر قائم تھے۔ان کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد رہ گیا تھا،وہ اسے زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور رنگا رنگ بنائیں،جس سے انہیں ہم چشموں میں عزت حاصل ہو سکے۔اس عالم اور نفاست پرستی کی وجہ سے علمِ مجلس کو خوب فروغ حاصل ہوا۔جو آداب پہلے شاہی دربار میں برتے جاتے تھے،اب وہ امرا اور رؤسا کی محفلوں اور صحبتوں میں برتے جانے لگے۔رفتہ رفتہ یہ آداب لکھنؤ کے پورے معاشرے میں عام ہوتے گئے اور آج بھی ان سب کے اثرات لکھنؤ میں بخوبی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔مگر مجلسی زندگی کے اس عیش وطرف کی محفلوں اور رکھ رکھاؤ کے باجود سماج کے کھوکھلے پن اور شوبازی سے پردہ پوشی نہ ہو سکی اور سب کچھ عیاں ہوتا گیا۔نمود ونمائش کی جو زندگی یہاں لوگ بسر کرر ہے تھے عبدالباری نے اس کا بھی جائزہ پیش کیا ہے۔اس میں جو فضول خرچیاں اور دکھاوا پن تھا،ان سب کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔نوابین اور ان کی بیگمات کے جو یومیہ خرچ تھے اس ظاہر کو کرتے ہوئے یہاں کے عیش وعشرت کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔

ڈاکٹر عبدالباری نے ان سب حالات کا جائزہ لینے کے بعد اودھ کی ثقافت کا فکری ونظریاتی پس منظر پیش کیا ہے۔اس باب میں انہوں نے اسلام اور تصوف کا جو پیغام تھا اس پر تبصرہ کیا ہے۔اودھ میں رہنے والے ہندوؤں کا اس معاشرہ میں جو حال تھا اس پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی تہذیب وثقافت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے مقدس شہروں کا ذکر کیا ہے۔ہندو اور مسلم مذاہب کے درمیان جو کشمکش تھی اس کو بھی اپنی تحریروں میں واضح کیا ہے۔ہندو وچار دھارا اور ان کی ریت ورواج کے جو اثرات یہاں کے معاشرے میں تحلیل تھے،مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی یہ اثرات یہاں پوری طرح غالب تھے،خود مسلمان بھی اسے اپنائے ہوئے تھے۔اس میں ایک علم نجوم بھی تھا جو یہاں قدیم زمانے سے رائج ہے۔اس زمانے میں لکھنؤ کی تہذیب وثقافت کا اہم حصہ بن چکا تھا اور اسے خوب فروغ حاصل ہوا۔ان سب حالات کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے اس عہد کے ہندو اور یہاں کے اخلاقی احوال کا ذکر کیا ہے۔اس باب کے آخر میں یہاں کے تمام رسم ورواج،یہاں کے حالات،ان

کے مشاغل، رجحانات وتوہم پرستی کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ جس نتیجے پر پہنچتے ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’اس باب میں ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ فیض آباد ولکھنؤ میں معاشرہ وثقافت کی ساخت اور نوعیت تقریباً وہی ہے جو دہلی اور پورے شمالی ہند میں تھی۔ مغلیہ عہد میں مسلمان اور ہندوؤں کے معاشرتی اختلاط اور تہذیبی لین دین نے نتیجے میں جو ثقافت نمو پزیر ہوئی تھی اس کا تسلسل ہم لکھنؤ میں بھی دیکھتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ لکھنؤ کی ثقافت پر دربار اور طبقۂ اعلیٰ کے افراد کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔ یہی لوگ پورے معاشرے کا آئیڈیل ہیں اور معاشرتی زندگی کی آرائش اور ثقافتی رنگ وروغن انہیں کے ذوق کے مزاج کے تابع ہے۔‘‘ ۲۵

ان تمام واقعات وحالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ ان سب کی جھلک اس عہد کے ادب میں صاف طور پر دیکھنے کو ملتی ہے، ادب کی جتنی بھی اصناف ہیں ان سب پر اس معاشرے اور تہذیب نے گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ اس عہد کے ادب میں وہ شعری ہو یا نثری سب میں لکھنوی تہذیب کے عمدہ نقوش واضح طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس عہد کی ادبی سرگرمیوں میں کارفرماں ثقافتی اور معاشرتی عوامل کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے شمالی ہند کی پوری تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس وقت ملک کے عام ہیجان پر روشنی ڈالی ہے۔ اس عہد میں دہلی سے جو شعرا لکھنؤ سکونت اختیار کر چکے تھے ان کا ذکر کرتے ہوئے، لکھنؤ کے ادب کا دہلی کے ادب سے تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ ان میں جو داخلیت اور خارجیت کا مسئلہ تھا، اس کو بھی انہوں نے واضح طور پر پیش کیا ہے۔ غرض ڈاکٹر سید عبدالباری نے لکھنؤ کے ادب میں جو ثقافتی اور معاشرتی پس منظر دیکھنے کو ملتا ہے، اس پر مفصل روشنی ڈال کر تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ عبدالباری نے ہر اس موضوع کو قلم بند کیا ہے جس کا تعلق ذرا بھی یہاں کی تہذیب، ثقافت اور معاشرت سے جڑا ہوا تھا۔ مذکورہ بالا تمام امور کا تفصیل سے جائزہ لینے کے بعد انہوں نے اودھ کی ثقافتی ومعاشرتی عوامل کی روشنی میں تمام اصنافِ سخن نثر ونظم کا جائزہ پیش کیا ہے۔

تمام اصنافِ سخن کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے سب سے پہلے غزل کو موضوع بحث بنایا ہے۔ انہوں نے شجاع الدولہ سے لے کر واجد علی شاہ کے عہد تک کے سبھی شعرا کی غزلوں پر مختصراً گفتگو کی ہے۔ مصنف لکھتے

ہیں کہ دہلی کی شاعری کے موضوعات میں لکھنو سے زیادہ فرق نہیں تھا مگر شجاع الدولہ کے وقت ہی سے یہاں کا شہری سماج، حکمرانوں کا مخصوص رنگ ڈھنگ، ان کی افتادِ طبع اور یہاں کی سیاسی اور اقتصادی حالات کے سبب ادب میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ان تبدیلیوں کو واضح کرنے کے لئے انہوں نے دونوں دبستانوں لکھنؤ اور دہلی کی غزل کا موازنہ پیش کیا ہے اور لکھنؤ کے مختلف ادوار کے شعرا کی غزلوں کا جائزہ لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ لکھنؤ میں دورِ اول سے ہی غزل کی حکمرانی رہی ہے اور مصحفیؔ، جرأتؔ، انشاؔ اور رنگینؔ اس کی آبیاری کرتے رہے ہیں۔اسی عہد میں میرؔ، سوداؔ، حسرتؔ اور سوزؔ بھی یہاں موجود تھے، لیکن ان کی شاعری یہاں کے اثرات قبول کرنے سے قاصر رہی۔اس کے بعد انہوں نے ناسخ اور آتش کے عہد کا ذکر کیا ہے اور اس عہد میں غزل کے موضوعات میں جو کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اس کے دامن میں جو وسعت پیدا ہوئی، اس نے اپنی قدیم روایات سے ہٹ کر اردو غزل کو نئے راستوں سے ہموار کیا۔آخر میں اس عہد کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے کلام پر بات کرتے ہوئے انہیں اس عہد کی تہذیب و ثقافت کا عمدہ ترجمان قرار دیتے ہیں۔ڈاکٹر عبدالباری نے غزل پر بات کرتے ہوئے اس عہد کے تمام شعرا کے کلام کا فنی جائزہ لیتے ہوئے ان کے کلام کی تمام خصوصیات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے اور اپنی بات کو مدلل بنانے کے لئے انہوں نے جابجا ان شعرا کے کلام کو پیش کرتے ہوئے اپنے تحقیقی مقالے میں کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا ہے۔

غزل کے بعد ڈاکٹر عبدالباری مثنوی کو اپنا موضوع بناتے ہیں، مثنوی سے متعلق ان کا خیال ہے کہ انسانی تہذیب و معاشرت کی ترجمانی کرنے میں اس سے زیادہ کوئی اور صنف کارآمد ثابت نہیں ہوسکتی ہے۔انہوں نے اس کی مقبولیت اور اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس کے فن پر بھی بحث کی ہے۔مثنوی کا تعارف پیش کرنے کے بعد انہوں نے سوداؔ، میرؔ، حسرتؔ، میر حسنؔ، مصحفیؔ، جرأتؔ، انشاؔء، رنگینؔ، دیاشنکر نسیمؔ، میر اثر، مومنؔ، قلقؔ، شوقؔ اور واجد علی شاہ کی مثنویوں کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے اور ان کے حسن اور کلام کی خوبصورتی اور ان میں یہاں کی تہذیب و ثقافت کے اثرات کو نمایاں کیا ہے۔

اس عہد میں غزل اور مثنوی کے علاوہ مرثیہ کے فن پر شعرا نے خاص توجہ مرکوز کی۔ڈاکٹر عبدالباری کے مطابق مرثیہ کا ذخیرہ دیگر اصنافِ سخن سے کہیں زیادہ وسیع اور وقیع ہے۔لکھنؤ دراصل شیعہ مسلک کا مرکز رہا ہے اور یہاں کے تمام نوابین بھی اسی مسلک سے جڑے ہوئے تھے۔مرثیہ کا غیر معمولی فروغ اودھ کے اس مخصوص معاشرتی اور تہذیبی اسباب کا مرہونِ منت ہے۔یہی وجہ ہے موضوعاتی اعتبار سے اس میں عرب تہذیب کی

نمائندگی ہوتی ہے مگر ان میں ہندوستانی روسم و رواج، روایات اور جذبات کا عکس کہیں نہ کہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر نظر ہی آ جاتا ہے۔ مگر مرثیہ یہاں کے عوام کے جذبات اور تہذیبی مزاج کے عین مطابق ترجمانی کرتی تھی۔ اس لئے اسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ مرثیہ کے فن اور موضوعات پر گفتگو کرنے کے بعد انہوں نے اس کی روایت پر سرسری نظر سے جائزہ پیش کیا ہے۔ ان ارتقائی مراحل میں میرؔ و سوداؔ نے لکھنؤ میں آ کر جو مراثی قلم بند کئے ہیں اس کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس روایت کو ادبی شان و شوکت عطا کی۔ لکھنؤ دراصل شعیہ مسلک کا گڑھ تھا اس لئے وہاں محرم اور عزاداری کا اہتمام بڑے زور و شور سے ہوتا تھا۔ اس میں نوابین خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اس مذہبی ماحول نے مرثیہ نگاری کو خوب فروغ دیا جس سے متعدد شعرا بحیثیت مرثیہ نگار وجود میں آئے۔ جن میں میر خلیقؔ، فصیحؔ، ضمیرؔ، انیسؔ و دبیرؔ کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے انیسؔ اور دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کی طرف خصوصی توجہ مرکوز کی ہے اور بتاتے ہیں کہ یہ دور لکھنؤ کے تہذیب و تمدن کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس لیے اس صنف میں اس عہد کے جملہ رجحانات کی ترجمانی ملتی ہے۔ بلکہ یہ صنف دیگر تمام اصنافِ سخن پر سبقت حاصل کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ غزل، مثنوی اور مرثیہ کے بعد انہوں نے قصیدہ، شہر آشوب واشوخت اور ریختی پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ نثری ادب پر بھی لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کی نشان دہی کی ہے۔ تمام اصنافِ سخن کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد نتائج اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''معاشرہ کے مقبول عام رجحانات اور ثقافتی اثرات کی ان پر گہری چھاپ پڑی ہے۔ غزل اس عہد میں ناسخ تک آتے آتے ان مخصوص معاشرتی عوامل کی تابع ہوگئی جو لکھنؤ میں موجود تھے۔ مثنوی کو غیر معمولی مقبولیت و عروج حاصل ہوا اس لئے کہ وہ انسانی معاشرے کے سطحی و خارجی مظاہر کی دلکش تصویریں بنا سکتی ہے اور خوابوں کے سنہرے جزیرے میں کچھ دیر کے لئے منتقل کر سکتی ہے۔ مرثیہ سے مذہبی تسکین کا سامان ہوتا تھا اس لئے اس عہد کے معاشرے نے اسے سینے سے لگایا لیکن اس عہد کے مرثیہ نگاروں نے کربلا کے عظیم المرتبت شخصیتوں پر بھی اس عہد کی ثقافت کا رنگ چڑھا کر پیش کیا ہے اور ابلاغ و اظہار کی ان مقبول عام روایت کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے جو اس عہد کے نفیس و نازک احساسات رکھنے والے افراد کو مرعوب تھیں۔ واسوخت و ریختی خاص طور سے اس معاشرے کے ادبی دسترخوان کی مرغوب غذا تھی جس سے کام و دہن کو آسودگی حاصل ہوتی تھی لیکن زمانے کے آشوب و انتشار کا احساس بھی کم نہ تھا۔ اس کا اندازہ ہمیں شہر آشوب

سے ہوتا ہے۔اس عہد کے شعور اور لاشعور میں اخلاقی اقدار کے احترام کے جذبات کس حد تک موجود تھے اس پر اس عہد کے قصائد سے اور دیگر اصنافِ سخن کے اندر جگہ جگہ پائے جانے والے معارف وحقائق کے نور سے منور اشعار سے ہوتا ہے۔اس عہد کی نثر میں سب زیادہ عروج داستان کو حاصل ہوا ہے۔داستان اس معاشرہ اور ثقافت کی بہترین ترجمانی بن کر سامنے آئی اور اس نے پوری دیانت داری سے اس عہد کے جملہ ثقافتی عوامل کو وا شگاف کیا۔ڈراموں اور تذکروں میں بھی ہم نے اس عہد کی تمدنی زندگی کی جھلک دیکھی ہے۔''۲۶

تمام شعرا و ادبا کی تخلیقات کا جائزہ لینے کے بعد وہ جس نتیجے پر پہنچتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسوی صدی کے نصف آخر اور نصف اول کے اودھ میں اردو شعر و ادب کا جو سرمایہ عالم ظہور میں آیا اور اس کے اندر جن ثقافتی اور معاشرتی عوامل کی ترجمانی ہوتی ہے اس کا قدرے تفصیل سے تجزیہ پیش کیا ہے۔اس کتاب کا گہرائی سے مطالعہ کرنے سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ اس عہد کا شعر و ادب لکھنؤ کے تہذیب وثقافت کی ہر پہلو سے ترجمانی کرنے سے محروم رہا ہے۔اس نے صرف دربار،امرا اور خاص طبقے کی نمائندگی کی ہے اور عوامی طبقے کو یکسر نظرانداز کر دیا ہے،مگر جس حد تک بھی ممکن ہوسکا ہے اس عہد کے ثقافت اور معاشرے کی عکاسی یہاں کے ادبا وشعرا نے بھرپور طریقے سے کی ہے اور جو بھی منظرکشی کی ہے وہ بالکل سچی اور نہایت مکمل ہے۔

اس کتاب کا عمومی جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لکھنو کا شعر و ادب اودھ کی تہذیب و ثقافت اور معاشرے کو صرف ایک ہی رخ سے پیش کرتا ہے۔یہ معاشرے کی گہرائیوں میں اترنے سے قاصر رہا ہے جس سے بہت سے ایسے حقائق ہیں جو سامنے نہیں آسکے ہیں۔اس عہد کے ادب نے قصبات اور دیہی علاقوں کے آداب و اطوار اور مسائل و مشاغل کو نظرانداز کر دیا۔اس لئے اس عہد کے ادب نے معاشرے و ثقافت کی جو جھلک پیش کی ہے وہ نامکمل اور ایک رخی ہے۔مگر جو کچھ بھی ادب میں پیش کیا ہے اسے بہر حال اس معاشرہ کی تہذیب وثقافت کی نہایت دیانتدار عکاسی قرار دیا جاسکتا ہے۔اس لئے کہ اس عہد کے ادب میں زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہمارے سامنے آتیں ہیں وہ کسی دوسرے عہد کے ادب میں نہیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس عہد کے ادب نے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے سب کچھ پیش کر دیا ہے۔اس لئے اس عہد کے ادب میں اگر کچھ کمی یا کوئی پہلو چھوٹ گیا ہے تو اسے نظرانداز کرتے ہوئے ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ ثقافتی اور ومعاشرتی نقطۂ نظر سے اس عہد کا ادب پوری اردو ادب کی تاریخ میں ایک خاص امتیاز و مرتبے کا حامل

ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کی یہ تصنیف ''لکھنؤ کا شعر وادب'' یقیناً مایہ ناز کتاب ہے،اس پر اہل اردو جتنا ناز کریں کم ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے ہندوستان خاص طور سے لکھنؤ کی تہذیب وثقافت کو سمجھنے کی راہ آسان ہوتی ہے۔ابھی تک اردو ادب میں متعدد کتابیں اس حوالے سے وجود میں آئیں۔مگر کوئی تصنیف اس کی ثانی نہیں ثابت ہوئی ہے۔عبدالباری نے اپنی تحقیق میں جس محنت ،لگن اور دیانتداری کا ثبوت دیا ہے،اس سے اندازہ ہوتا ہے ان کے اندر تحقیقی شعور بدرجۂ اتم موجود ہے اور وہ مبادیاتِ تحقیق سے باخوبی واقف تھے۔جس دیدہ وری،فراخ دلی ،صبر وتحمل سے انہوں نے لکھنؤ کے شعر وادب کا وہاں کے تہذیب وثقافت کے آئینے میں جائزہ پیش کیا ہے اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

☆☆☆

لکھنؤ کے ادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء

لکھنؤ کے ادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر ڈاکٹر سید عبدالباری کا تیسرا تحقیقی مقالہ ہے۔ یہ کتاب ان کی سابقہ کتاب ''لکھنؤ کا شعر وادب'' کا دوسرا حصہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کی اشاعت ۲۰۰۶ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے ہوئی۔ پہلی کتاب کا عہد نواب شجاع الدولہ ۱۷۶۵ء سے آخری نواب واجد علی شاہ ۱۸۵۷ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اگر اس کتاب کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو اس کے بعد جو بات ہمارے ذہن میں نتیجے کے طور پر آتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہی وہ عہد ہے جس میں لکھنوی تہذیب اپنے عروج پر تھی اور اس عہد کے ادب سے اندازہ ہوتا ہے لکھنؤ اپنا تہذیبی وقار قائم کرنے میں حتی الامکان کوشش کرتا رہا اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوا ہے۔ دوسری کتاب چونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے ادب کا احاطہ کرتی ہے اس لئے اس کو اگر برطانوی عہد میں لکھنؤ کی تہذیب ومعاشرت سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کتاب میں اس عہد کے لکھنؤ میں جو ادب وجود میں آیا ہے اس کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو تنقید میں ادب کے عمرانیاتی مطالعہ کی یہ پہلی کوشش ہے اور اس لئے کافی اہم بھی ہے کہ اس کتاب میں مصنف نے ادب کا معاشرہ اور ثقافت سے جو گہرا تعلق ہوتا ہے اس کی عمدہ نشان دہی کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے پہلے باب میں مصنف نے معاشرہ وتہذیب اور ادب سے باہمی رشتے کا جائزہ لیتے ہوئے نظریاتی گفتگو کی ہے۔ جو اس سے پہلے ''لکھنؤ کا شعر وادب'' والے حصے میں بھی اس موضوع پر گفتگو ہو چکی ہے۔ غرض ڈاکٹر سید عبدالباری نے تہذیب وثقافت کے حوالے سے تقریباً وہی تمام باتیں یہاں بھی پیش کیں ہیں مگر یہاں اس انداز سے پیش کیا ہے جس سے دونوں میں فرق معلوم پڑتا ہے تاہم دونوں کے نظریات یکساں ہیں۔ اردو تنقید میں عام دستور ہے کہ کسی بھی موضوع پر نظریاتی بحث کرنے کے لئے مغربی ادب کے حوالے اور مغربی مفکرین کی فکری آراء کی روشنی میں اپنی بات کو مدلل بنایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالباری نے بھی اپنی اس کتاب کو دوام بخشنے کے لئے اس روایت سے استفادہ کیا ہے اور جا بجا مختلف مغربی مفکروں کے نظریات کا حوالہ دے کر اپنی بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ایک خامی جو ان کے تمام تحقیقی کتابوں میں (مذکورہ کتاب کو چھوڑ کر) ہر جگہ دیکھنے کو ملتی ہے، وہ حوالہ تو دیتے ہیں مگر کہاں سے لیا ہے کون سی کتاب کا کون سا صفحہ ہے اس کو نظر انداز کر جاتے ہیں جو ان کی تحقیق کی سب سے بڑی خامی ہے۔

دوسرے باب میں بھی انہوں نے غدر سے پہلے اودھ کی ثقافت اور معاشرے کا جو عکس ادب میں نمایاں ہوا ہے اس کی تصویر کشی کی ہے اور اس امر کی تلاش وجستجو کی ہے کہ اودھ کی ثقافت یہاں کے ادب میں کس طرح نظر آتی ہے۔ یہ بات بھی اسی کتاب کی کی ایک کڑی ''لکھنؤ کا ثقافتی پش منظر'' سے پورا ملتا جلتا ہے جس پر گفتگو ہو چکی ہے۔ تیسرے باب میں انہوں نے اسی خیال کو ذرا وسعت دے کر ۱۹۴۷ء تک اسی نقطۂ نظر سے اودھ کی تہذیب وثقافت کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ اس کتاب کے سارے موضوعات پہلی کتاب سے مشترک ہیں۔ اگر کچھ فرق محسوس ہوتا ہے تو وہ تیسرا باب ہے جس میں انہوں نے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کے عہد میں معاشرہ و ثقافت کا جائزہ مغربی فکر اور نقطۂ نظر سے لیا ہے۔ اس عہد میں لکھنوی تہذیب کے باقیات اپنی واضح شکل میں موجود تھے، مگر اس وقت مغربی تہذیب ونئی تعلیم اور مغربی فکر یہاں کی تہذیب وثقافت پر غالب ہونے لگی تھی اور انگریزی اقتدار یہاں پوری طرح پورے سماج پر مسلط ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے نظم ونسق کا بہترین نظام قائم کیا جس سے ملک کے صنعتی اور تجارتی کاموں کو بہتر طریقے سے انجام دیا جا سکے قدیم وجدید قسم کے تعلیمی ادارے بنائے گئے جس سے یہاں ثقافتی اور تہذیبی ہماہمی کا آغاز ہوا۔ ان دو تہذیبوں کے آپسی ٹکراؤ کی وجہ سے انیسوی صدی کے نصف آخر میں عہدِ جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ جس سے یہاں کے معاشرے میں کافی تبدیلیاں رونماں ہوئیں، یہاں نئے رجحانات پیدا ہوئے، نئے ادارے قائم کئے گئے، لوگوں کے خیالات اور سوچ میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ انہیں سب تبدیلیوں کا ڈاکٹر سید عبدالباری نے بڑی ہنرمندی سے احاطہ کیا ہے اور آزادی تک کے ادب کا جائزہ پیش کرتے ہوئے اس میں ادب کا جو اہم رول واہمیت تھی اس کو واضح کیا ہے۔

ان سب کی وضاحت کے بعد عبدالباری نے ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک اودھ و معاشرے کی جو جھلک تمام اصنافِ سخن میں دیکھائی دیتی ہے اس کو اپنی تحقیق وتنقید کے ذریعے واضح کیا ہے اور عہد بہ عہد ان میں برطانوی لکھنؤ تک آتے آتے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ہیں اس کی نشان دہی کی ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ غدر کے بعد پورے ملک میں تبدیلیاں رونما ہوئیں ذہنی وفکری تغیرات نمایاں ہوئے اور علم وادب کی دنیا میں بھی کافی ہلچل پیدا ہوئی، مگر اودھ کی تہذیب وثقافت اور یہاں کے ذوق ومزاج میں آئندہ پچاس سال تک کوئی خاص تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ مگر اس کے بعد تمام اصنافِ سخن غزل، نظم، رباعی، قصیدہ، مرثیۂ، انشائیہ، ڈرامہ، طنز ومزاح، مثنوی، افسانہ اور نئی نظم غرض تمام اصنافِ سخن میں جیسے جیسے تبدیلیاں رونماں ہوئیں مصنف نے اسے مختلف نظریہ سے واضح کیا ہے۔ انہوں انجمنِ پنجاب، سرسید تحریک اور ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر جو تبدیلیاں ادب میں آئیں اس کے اثرات کو بھی واضح کیا ہے اور تمام اصناف پر اس کے گہرے نقوش کو ظاہر

کرتے ہوئے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے تمام اصنافِ سخن پر گفتگو کرتے ہوئے ہر ایک شعرا اور ناول نگاروں ، افسانہ نگاروں غرض سبھی فن کاروں کے فن کا جائزہ تہذیبی و ثقافتی نقطۂ نظر سے بھر پور طریقے سے لیا ہے اوران کے فن پاروں میں عمرانیات کے پہلو کو بخوبی و بحسن تلاش کر کے ہمارے سامنے اس کے نتائج بھی اخذ کئے ہیں۔ پروفیسر ملک زادہ منظور نے ان کی اس کتاب کے سرورق پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اردو تنقید و تحقیق کی دنیا میں ادب کے تہذیبی و معاشرتی تناظر میں مطالعہ کی روایت کو یہ تصنیف آگے بڑھاتی ہے۔اس سے قبل متعدد مصنفین بالخصوص ڈاکٹر ابنِ فرید اور ڈاکٹر محمد حسن نے اسے خاص طور پر اپنا موضوع تحریر بنایا ہے۔ڈاکٹر عبدالباری نے باضابطہ اس وادی میں قدم رکھا اور اٹھارویں انیسوی صدی کے دبستانِ لکھنؤ کے ادب کی جملہ اصناف کا تہذیبی و معاشرتی تناظر میں بھر پور جائزہ لیا ہے۔انہوں نے ادب،تہذیب اور معاشرہ کے باہم روابط پر بھی مشرق و مغرب کے نقادوں کے خیالات کے حوالے سے فکر انگیز گفتگو کی ہے۔انہوں نے پوری دو صدی کے دوران اودھ کے اہم خط تہذیب و معاشرت کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ادب پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں اس کی طرف نشان دہی کی ہے۔موجودہ کتاب غدر ۱۸۵۷ء سے آزادی ہند ۱۹۴۷ء تک کے عہد سے متعلق ہے۔اس سے قبل مصنف ۱۷۶۵ء تا ۱۸۵۷ء تک نوابینِ اودھ کے دور کے ادب کا بھی مفصل جائزہ اپنی کتاب ''لکھنؤ کا شعر ادب'' میں لے چکے ہیں۔مصنف نے ان ضخیم مجلدات کے ذریعہ ادب کے ثقافتی و عمرانی مطالعہ کی راہ آسان کر دی ہے۔'' ۲۷

غرض اس کتاب کے مطالعہ سے ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء تک کے ادب کا جو تہذیبی و معاشرتی پس منظر ہمارے سامنے ابھر کر آتا ہے،اس سے اس عہد کی معنویت اور اس کے کردار کو سمجھنے میں بے حد آسانی ہوتی ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے آئندہ اس عہد پر کام کرنے والے طالب علموں کو ایسے اشارات اور ایسے انکشاف تک رسائی ہوگی جن کی مدد سے وہ ہندوستان کی تاریخ کے ایک اہم دور میں اردو کے ایک اہم ثقافتی مرکز کی ذہنی وفکری تہذیبی و تخلیقی کاوشوں کا ٹھوس انداز سے ادراک کر سکیں گے۔

بیسوی صدی کے اردو ادب کا جائزہ

''بیسوی صدی کے اردو ادب کا جائزہ'' یہ مقالہ ڈاکٹر سید عبدالباری نے ۲۰۰۴ء میں تحریر کیا تھا۔ یہ یو جی سی کا ایک پروجیکٹ تھا جس پر انہوں نے اودھ یونیورسٹی سے سبک دوش ہونے کے بعد کام کیا۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کی اجازت سے ۲۰۱۱ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔اس مقالے میں عبدالباری صاحب نے بیسوی صدی کے اردو ادب کا جائزہ مشرق ومغرب کی تہذیبی اقدار وافکار کی کشمکش کے حوالے سے لیا ہے۔اس کتاب کا بھی سلسلہ کہیں نہ کہیں ان کی مذکورہ تین کتابوں سے ملتا ہوا نظر آتا ہے۔ کیوں کہ اس میں بھی انہوں نے وہی ساری باتیں بیان کیں ہیں جو انیسوی صدی اور بیسوی صدی سے متعلق دوسری کتابوں میں کر چکے ہیں۔تاہم یہ کتاب اس نظریہ سے بھی کافی اہم ہے کہ اس میں انہوں نے مغربی اور مشرقی تہذیب اقدار وافکار کی کشمکش کا زبردست موازنہ کرکے اردو ادب کی تمام اصنافِ سخن کا اسی نقطۂ نظر سے جائزہ پیش کرتے ہیں اور اس اثرات سے بیسوی صدی کے اردو ادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا احاطہ کیا ہے۔ یہ کتاب بہت حد تک ان کی پہلی تصنیف ''اردو کا تہذیبی تناظر'' سے مشترک حیثیت رکھتی ہے اس میں بھی زیادہ تر باتیں وہیں ہیں جو اس کتاب میں تہذیب کے حوالے سے عبدالباری نے کی ہے بلکہ ابتدائی حصے میں جو ابواب اس میں شامل ہیں اگر دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے ساری باتیں وہی ہیں بلکہ جملے بھی من وعن وہی ہیں۔اس کتاب میں جو توسیع ہوئی ہے وہ جدیدیت کا باب ہے جس میں انہوں نے اردو ادب پر مغربی تہذیب کے جو اثرات نمایا ہوئے ہیں اس موضوع پر بحث کی ہے اور اردو شاعری اور نیا افسانہ پر اپنی بصیرانہ تنقیدی نظر ڈالی ہے نیز اس کو بھی اپنے تعمیری ادب کے نقطۂ نظر سے ادب کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔جس پر آگے چل کر گفتگو ہوگی۔ پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پورے ادب پر اپنا یہی نظریہ تھوپنا چاہتے ہیں۔کسی بھی تحریک یا نظریہ کا انہوں نے اسی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے جسے وہ مشرقی تہذیب کا ایک اہم جز وتصور کرتے ہیں اور آخر میں وہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں موجودہ نسل جدیدیت، مابعد جدیدیت، مادیت، بے یقینی اور قنوطیت کے چنگل سے آزاد ہوکر ادب میں مثبت پہلو کی ترجمانی کررہی ہے۔ پوری تصنیف میں وہ جدیدیت کے مخالف نظر آتے ہیں،اسے منفی ادب قرار دیتے ہیں اور تعمیری ادب کو وہ مثبتی ادب کہتے ہیں۔اس طرح کہیں کہیں جدیدیت پر گفتگو کرتے ہوئے کافی جھنجھلائے ہوئے بھی نظر آتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے تعمیری ادب جس کا سارا دار ومدار اسلامی نظریات پر ٹکا ہوا ہے اس

سے بہتر کوئی ادب نہیں ہے باقی سب نظریات میں نقص ہے خامی ہے۔

اس کتاب کی ابتدا میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے تہذیب کی تعریف و تشریح پیش کی ہے جس پر انہوں نے اس ''اردو ادب کا تہذیبی تناظر'' میں بھی گفتگو کر چکے ہیں۔ باتیں تمام وہیں ہیں جو گزشتہ صفحات پر ہو چکیں ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مشرقی اور مغربی تہذیب کا الگ الگ جائزہ لیتے ہوئے اس پر مفصل گفتگو کی ہے اور پھر ان دونوں کی فکری، کشمکش کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے مشرقی تہذیب جس کو وہ اسلامی تہذیب سمجھتے ہیں اس پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا مودودی جیسے اور کئی اسلامی مفکروں کی باتوں کو جابجا پیش کر کے اپنی بات کو مدلل بنانے کی کوشش کی ہے۔ مشرقی تہذیب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مشرقی تہذیب انفرادیت کے بجائے اجتماعیت پر زور دیتی ہے اور نسل، قوم، زبان اور وطن کے امتیازات اور کشمکش کو ختم کرتی ہے۔ تہذیب اگر مذہب سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے، اس میں اخلاقی حیثیت محض انسان کے تابع ہو کر رہ جاتی ہے۔ مشرقی تہذیب کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''مشرقی تہذیب کی ایک اہم خوبی یہ رہی ہے کہ یہ دیگر تہذیبوں کے ساتھ تصادم کے بجائے تفاہم اور بقائے باہم کا انداز اختیار کرتی ہے اور اچھائی کو اختیار کرنے اور خرابیوں کو نظر انداز کرنے کا یہ رویہ اختیار کرتی ہے۔ اس نے قوت دولت اور اقتدار سے زیادہ بلند اخلاقی اور عظمت کردار کو اہمیت دی۔ مشرقی تہذیب نے انسان کو عزت و وقار کا درجہ عطا کیا اس نے غلامی کی زنجیروں کو توڑا ہے اور آزاد فضا میں میں سانس لینے کی سہولت مہیا کی۔ مشرقی تہذیب جس کا جزو غالب اسلام ہے سیاسی اور ذہنی دونوں طرح کی آزادی انسان کو عطا کرتی ہے۔'' ۲۸

مشرقی تہذیب کا تصور پیش کرنے کے بعد انہوں نے مغربی تہذیب پر بھی اپنی گہری بصیرت کا ثبوت مہیا کیا ہے اور مختلف مغربی افکار و نظریات کو پیش کر کے مغربی تہذیب اور اس کے تصور کو واضح کیا ہے۔ اس کے بعد دونوں تہذیبوں میں فرق بیان کرتے ہیں، پھر ہندوستان کے مشرقی معاشرے پر مغربی تہذیب کس طرح حاوی ہوتی ہے اس کے کیا سیاسی و سماجی اسباب تھے، اس کشمکش پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی خامیوں اور خوبیوں کی بھی نشان دہی کرتے ہیں بالخصوص مغربی تہذیب کی مادیت اور عقلیت پرستی کی وہ پوری تصنیف میں مذمت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔

مشرقی ومغربی تہذیب کا جائزہ لینے کے بعد عبدالباری نے دونوں تہذیبوں کی فکری کشمکش کا جائزہ انیسوی صدی کے اختتام تک لیا ہے۔اس باب میں انہوں نے جب انگریز ہندوستان آئے اور اپنے ساتھ یہاں جو تہذیب لائے اس کو یہاں کے لوگوں نے کتنی مشکل سے قبول کیا ہے اس کی وضاحت کی ہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد اس ملک کی کیا فضا تھی اس میں ایک نئی تہذیب کس طرح مشرقی تہذیب سے ہم آہنگ ہوتی ہے اس کے ارتقا کا نقشہ کھینچا ہے۔اس مرحلے میں انہوں نے سرسید احمد خاں کی خدمات کا بھر پور جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سرسید نے پہلی بار یہاں کی عوام کو نئی تعلیم سے روشناس کرایا۔اس سے قبل یہاں کے لوگ مغربی تہذیب اور تعلیم کو آسانی سے قبول کرنے کو تیار نہیں تھے لیکن سرسید کی اصلاحی تحریک نے ان کے مثبت پہلوؤں کو قبول کرنے کی جو کوشش کی اس سے یہاں کی تہذیب و ثقافت میں تبدیلیاں رونماں ہونے لگیں۔لوگ سائنس اور کائنات کی بسیط حقیقتوں سے آشنا ہوئے۔اس مرحلے میں انہوں نے ان دشواریوں اور پریشانیوں کا بھی ذکر کیا ہے جس سے سرسید کو نئی تعلیم اور یہاں کے لوگوں کو بیدار کرنے میں کافی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

سرسید کی خدمات کا جائزہ لینے کے بعد عبدالباری صاحب مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے اقدار وافکار کا جو تصادم ہندوستان میں غدر کے بعد بر پا ہوا، اس کے سیاسی پہلو پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں اور ادب میں اس کا جو عکس ابھر کر سامنے آیا ہے اس پر مختصراً گفتگو کی ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے اس وقت کے سیاسی ومعاشرتی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اردو کی تمام اصنافِ سخن کو اپنا مطالعے کا محور ومرکز بنایا ہے اور سبھی فن کاروں کے ذریعے وجود میں آنے والے فن پاروں کا اسی کشمکش کے آئینے میں جائزہ پیش کیا ہے۔انیسوی صدی میں اردو ادب کے فروغ میں جتنے بھی عوامل کارفرماں تھے، ان سب کا انہوں نے تاریخی، سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی نطقۂ نظر سے اپنی تحقیق کا حصہ بنایا ہے۔جس میں انہوں نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ، دہلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی، نول کشور پریس لکھنؤ سبھی کی ادبی خدمات کا جائزہ تفصیل سے پیش کیا ہے اور ان اداروں کے زیر سایہ جو ادب منظرِ عام پر آرہا تھا اس سے جو ملک کی تہذیبی عکاسی ہوتی تھی، اس موضوع پر وضاحت کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ان درس گاہوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے یہ بات ظاہر کی ہے کہ یہ ادارے انگریزوں نے اپنے ایک عظیم مقصد کے تحت قائم کئے تھے لیکن غیر شعوری طور پر اس سے اردو ادب کو کافی فروغ ہوا۔جس کا انہیں اندازہ بھی نہیں تھا۔مگر ملک میں جو تہذیبی اور فکری تصادم بر پا ہوا یہ ادارے اس کے بہت حد تک ذمہ دار بھی ہیں، ان درسگاہوں میں مشرق اور مغرب دونوں تہذیبوں کے لوگ ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے، یہاں پر

ہندو مسلم، عیسائی، فرانسی اور جرمنی سبھی طبقے کے لوگ ایک ساتھ غور وفکر کرتے تھے گویا یہاں کئی تہذیبوں کا سنگم تھا جس کے نتیجے کے طور پر جب کئی تہذیبیں آپس میں ٹکرائیں تو ان کے افکار واقدار کا جو تصادم پیدا ہوا اس موضوع پر ڈاکٹر سید عبدالباری نے بڑی باریکی سے غور وفکر کر کے اسے اپنی تحریروں میں واضح کیا ہے۔ان کالجوں اور اداروں کی وجہ سے مشرق ومغرب کے درمیان آویزش اور آمیزش سے انیسوی صدی کے ادب میں جو گہرے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ڈاکٹر عبدالباری نے اس کو بھی اپنی تحقیق کے ذریعے واضح کیا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

''انیسوی صدی کے ہندوستان میں اردو ادب پر مغربی ومشرقی تہذیبوں کی آویزش واختلاط کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔اگرچہ یہ اثرات علی گڑھ تحریک سے پہلے نمایاں نہیں ہوئے لیکن غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزی حکومت پورے ملک میں قائم ہوگئی اور جگہ جگہ انگریزی تعلیم کے ادارے کھلنے لگے اور انگریزی زبان وادب اور علم و فکر سے لوگ روشناس ہوئے تو مغربی اثرات ہندوستان کی تہذیبی وادبی زندگی پر نمایاں ہونے لگا۔''۲۹

ان سبھی عوامل کے اثرات سے اردو ادب پر گہرے نقوش مرتب ہوئے۔غرض غدر کے بعد ہندوستان کی عوام مغربی تعلیم وتہذیب کے مثبت کارناموں کو قبول کرنے لگی تھی، اس میں خاص طور سے وہ طبقہ شامل ہے جو شہری زندگی گزر بسر کر رہا تھا اور نئی تعلیم سے کافی حد تک روشناس ہو چکا تھا۔غالب نے بھی اس زمانے میں نئی ذہنیت اور اس کی تہذیب کے اثرات کو قبول کیا اور پرانی روش کو ترک کر کے نئی ہواؤں کے استقبال کا پیغام دیا۔پھر اس تہذیب کو اور بھی ہوا پانی دینے میں سرسید تحریک نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے اس کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری نے سرسید اور ان کے رفقاء کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہیں اس ضمن میں شبلیؔ حالیؔ اور آزادؔ نے ادب سے متعلق جو اصلاحی کاوشیں پیش کیں ہیں ان سب محرکات وعوامل کو انہوں نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ڈاکٹر عبدالباری اس تحریک کے زیر اثر ادب میں نمایاں ہونے والی تبدیلیوں سے متعلق لکھتے ہیں:

''انیسوی صدی کے نصف آخر میں ہم غیر معمولی انقلاب علم وثقافت کی دنیا میں دیکھتے ہیں۔علی گڑھ تحریک نے تو گویا کایا پلٹ دی اور نئی منزلوں کی نشاندہی کی۔''۳۰

اس عہد میں سرسید اور ان کے رفقا نے مغربی تہذیب کے اثرات کو خوب قبول کیا اور اردو ادب وشاعری

کو ایک نئی سمت و رفتار دینے میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ اس عہد میں شاعری کا رشتہ یہاں کی تہذیب سے مضبوط ہوتا گیا۔ حاؔلی نے مقدمہ شعروشاعری لکھ کر اردو ادب خاص طور سے شاعری کو نئے ادبی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی بھر پور کوشش کی اور خود سر سید نے رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے اردو نثر کو جو نئی راہ دکھائی اس سے مغربی انشا پردازی و مضمون نگاری کا انداز اردو میں مقبول عام ہوا اور اسی تحریک کی بدولت اردو ادب میں ایک نئی تازگی کا احساس ہوا جس سے غالب کی نثر کے بعد ایک بار پھر انشائیہ نگاری اور مضمون نگاری کے فن نے ترقی کی کئی منزلیں طے کیں۔ سر سید نے جس مغربیت کو فروغ دیا اس سے جدید علوم وفنون سے یہاں کی عوام میں ہم آہنگی پیدا ہوئی جو آگے چل کر قومی فلاح و بہود کا ذریعہ بھی بنی۔ لیکن کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو مغربی تہذیب وتمدن کے سخت مخالف تھے، اس میں ایک نام اکبر آلہ آبادی کا ہے جو مشرقی مغلوبیت کا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اس کی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے اپنی شاعری میں اس کی مزاحمت اور سر سید کی مخالفت بھی کی۔ اکبر کے علاوہ نذیر احمد کے ناولوں میں بھی طنز ومزاح کی آڑ میں اس درد کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریزی تہذیب کے ساتھ طرزِ فکر اور طرزِ تعلیم یہاں کی تہذیب پر غالب ہو رہی ہے، اسی لیے ان کے یہاں حسرت و مایوسی کی کیفیت صاف جھلکتی ہے۔ مغربی تہذیب کے اثرات اس عہد میں زندگی کے سبھی شعبہ ہائے حیات میں جزوی حیثیت اختیار کرتے جا رہے تھے لیکن اسی نظام تعلیم اور تہذیب کے آغوش میں کچھ ایسی شخصیتیں بھی وجود میں آئیں جو مشرقی تہذیب کی مٹتی ہوئی اقدار کی فکر میں مبتلا تھے اور اس کی دفع میں جی جان سے لگے ہوئے تھے اس میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، حسرت موہانی، ظفر علی خاں اور علامہ اقبال کا نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری اس باب میں اقبال اور چکبست کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان میں مغربی اور مشرقی تہذیب کی جو کشمکش تھی اس کو اپنی تحقیق کے ذریعے واضح کیا ہے۔ انھوں نے اقبال کی شاعری پر بالخصوص توجہ فرمائی ہے اور لکھتے ہیں:

> ''پہلے شاعر ہیں جو مغربی تہذیب کی یلغار کے نقطۂ عروج پر اعتماد و یقین سے بھرے ہوئے لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔ مشرقی تہذیب وتمدن واصول واقدار اور شناخت کے تعلق سے ان کا لہجہ پر اعتماد اور یقین آفریں ہے۔
>
> انھوں نے مشرق ومغرب کو سنجیدہ عمیق اور پھر فلسفیانہ اور عقلی تجزیہ اور تحلیل کے ذریعے پرکھا ہے اور دونوں کے خصائص اور تضادات کی نشاندہی کی ہے۔ مغرب کا اس قدر شناس اور نباض شاعر کوئی اور بیسوی صدی میں نظر نہیں آتا۔''۳۱

یہی سبب ہے کہ اقبال کی شاعری میں مشرقی اقدار کے زوال کا عکس ان کی فکر میں ہر جگہ نمایاں ہوتا

ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری اقبالؔ کی شاعری سے کافی متاثر نظر آتے ہیں اور انہیں اسلامی نقطۂ نظر سے ایک عظیم شاعر تصور کرتے ہیں۔اقبال کے بعد انہوں نے ترقی پسند تحریک کو موضوع گفتگو بنایا ہے اور اس تحریک پر مغرب کے جو اثرات نمایاں ہوئے تھے اس کو اپنی تحقیق کا اصل موضوع بنایا ہے۔اس تحریک نے مذہب اور روحانیت کا جو مذاق اڑایا ہے اس سے ڈاکٹر عبدالباری کی تحریروں میں ان کی جھنجلاہٹ صاف نظر آتی ہے۔اس تحریک کے اوصاف اور خامیوں کو انہوں نے بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے اور اس پر مشرقی تہذیب اور تعمیری ادب کو فوقیت دیتے ہیں۔مگر اس تحریک کے جو سیاسی اور مغربی افکار و خیالات کے اثرات اہلِ قلم نے قبول کئے ہیں اس کی چھاپ اس عہد کے ادب میں خاص طور سے نمایاں ہے۔

ترقی پسند تحریک سے اردو ادب میں آزادئ خیال اور آزادئ رائے کی صدائیں بلند ہوئیں اور لوگوں میں قومی شعور بیدار ہوا، جس کے سبب جنگ آزادی کی تحریک میں اس نے اہم کردار نبھایا۔مگر اس تحریک نے مذہب اور اخلاق کے ازلی اصولوں سے جو بغاوت کی اس کو ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنی تنقید کا سخت نشانہ بنایا ہے اور اس تحریک نے پرانی تہذیب کو جو رجعت پسندی کا نام دیا ہے ان سب موضوعات کو انہوں نے اپنی تحقیق کا حصہ بنایا ہے اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان سب قلم کاروں کے پاس پرانی تہذیب اور قدیم سماج پر تنقید کرنے کے علاوہ کوئی مثبت پیغام نہ تھا۔اس ضمن وہ مزید لکھتے ہیں:

> ’’ترقی پسند تحریک بربریت اور شہنشاہیت کے خلاف لڑنے کا ولولہ ظاہر کر رہے تھے مگر ان الفاظ کی معنویت تک رسائی نہ تھی اس لئے کہ انصاف تعلیم و تہذیب فقر و سادگی اور اخوت و مساوات کی تابناک قدروں کو یہ رجعت پسندی قرار دے چکے تھے۔جدلیاتی مادیت نے ان کو روحانیت سے برسرِ پیکار بنا دیا تھا۔اخلاقیات اور مذہبیت کے سلسلہ میں ترقی پسندوں کا مسلک وہی تھا جو مغرب کے سرمایہ دار ممالک کے فلسفیوں نے ان کو عطا کیا تھا۔‘‘ ۳۲

غرض ڈاکٹر عبدالباری نے یہ بات ثابت کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کی ہے کہ مغربیت کی انتہا پسندانہ تعبیر ہی مارکسیت ہے۔بیسوی صدی کے نصف آخر میں ترقی پسند تحریک کے بالمقابل مشرق کی بازیافت کی تحریک اور مثبت رجحانات کے لئے تعمیری ادب کی تحریک وجود میں آئی جس کے نظریات قرآن کریم اور اسلامیات پر منحصر ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری خود اس تحریک کے روح رواں اور کئی عرصے تک صدر کے عہدے

پر فائز رہے ہیں، اس لئے انہوں نے اس تحریک کو اس تصنیف میں تحقیق کا لازمی جزو بنایا ہے اور اس کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس تحریک کے زیرِ اثر ایک بڑا حلقہ وجود میں آیا جس نے اقبالؔ، حالیؔ اور شبلیؔ کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے، ادب میں مشرقی تہذیب اور اقدار کی جو شمع ان بزرگوں نے روشن کی تھی اس سے استفادہ کرتے ہوئے اس روایت کو ادب میں کافی فروغ دیا۔ اس باب میں انہوں نے اس تحریک کے زیرِ اثر وجود میں آنے والی تمام تخلیقات اور فن پاروں کا جائزہ لیا ہے، خاص طور سے شاعری میں اسلامی تحریک کے زیرِ اثر مشرقی تہذیب کی جو بازیافت اس کے ادب میں ہوئی اس کی نشان دہی کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے تعمیر پسند تحریک کے سبھی شعرا کے کلام کو جا بجا پیش کر کے مشرقی تہذیب کے جو نقوش ہیں ان کو اشعار کے ذریعے واضح کیا ہے۔

اس عہد میں ان تحریکات کے شانہ بشانہ ادب میں جدیدیت کا تصور بھی وجود میں آیا۔ جس کا سارا فلسفہ وجودیت اور مادیت کے نظریات کو پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ادب میں زندگی کا عکس آنا کوئی لازمی نہیں ہے ادب زندگی کا آئینہ نہیں بلکہ انسان کے وجود کو ثابت کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ جس کے سبب فنکار اپنے آپ کو تلاش کرتا رہتا ہے، جس سے اس کے اندر پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ادب میں بھی اسی طرح کا ابہام اور پیچیدگی دیکھنے کو ملتی ہے، جو بالکل بے معنی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے اسے ایک منفی اور گھناونی تحریک قرار دیا ہے۔ اس باب میں انہوں نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے زیرِ اثر وجو میں آنے والی شاعری اور افسانے کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کے زیرِ اثر جو بھی فن پارہ وجود میں آیا ہے اس کا تہذیبی مسائل سے دور دور تک کوئی رشتہ نظر نہیں آتا۔ اس نے قاری کو ابہام، الحاد، وجودیت اور لایعنیت کے طلسم میں الجھا کر ادب سے دور کر دیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری جدیدیت کے خلاف ڈٹ کر قلم اٹھاتے ہیں اور جدیدیت کے فلسفوں کو اپنی تنقید کا سخت نشانہ بھی بناتے ہیں۔

اس کتاب کے آخر میں انہوں نے بیسویں صدی کے آخری دہائیوں میں تہذیبی مسائل کی جو کشمکش تھی اس موضوع پر اپنے قلم کا زور دکھایا ہے اور لکھا ہے کہ اس عہد میں جدیدیت کے زیرِ اثر مغربی تہذیب حاوی ہو رہی تھی مگر اس ناسازگار حالات میں کچھ اہلِ قلم نے اپنی تہذیب کی بقا کے لئے ولولہ انگیز کارنامے انجام دیئے ہیں اور انہوں نے مغربی تہذیب کے سارے تصورات و نظریات کا طلسم توڑ دیا۔ سید عبدالباری کا جھکاؤ ان قلم کاروں کی طرف ہے جو اسلامی ادب کے زیرِ اثر ادبی تخلیقات پیش کر رہے تھے۔ انہوں نے پوری کتاب میں

اسی نظریہ کو ہر جگہ بروئے کار لایا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے پورے بیسویں صدی کے ادب کا جائزہ پیش کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

''اس جائزہ کا ماحصل یہ ہے کہ بیسویں صدی میں برصغیر کے اردو کے بیش تر قلم کاروں نے اپنے تخلیقی عمل میں اپنے ماحول اپنے گرد وپیش اپنے معاشرے اور اپنی تہذیب نیز اپنی ذات کے تئیں ذمہ دارانہ رویہ اختیار کیا۔ نظموں غزلوں افسانوں اور علمی تصانیف میں مشرقی تہذیب کے امتیازات، مساوات، اخوت، رنگ ونسل کے امتیازات سے بالاتری بلندی کردار کی فضیلت، اعلیٰ اخلاقی زندگی کی اہمیت، انصاف پروری اور عدل گستری کو تہذیبی قوت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ حسن وخیر کا محور مادی دلکشی کے اسباب کے بجائے اخلاق حسنہ کو قرار دیا۔ وہ بیڑیاں اور زنجیریں توڑ دی گئیں جنہیں مغربی تہذیب وافکار نے مشرق کے قدموں میں ڈال رکھا تھا۔ اس سے یہ توقع روشن ہوتی ہے کہ موجودہ صدی میں مشرق کی آرزوؤں اور خوابوں کے مطابق انسان کے جمالیاتی مذاق اور فکری تشنگی کی زیادہ بہتر طور پر آسودگی وآبیاری ہو سکے گی۔''۳۳

اس پورے مقالے میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے بیسویں صدی کے اردو ادب کا مجموعی جائزہ لیا ہے اور مغرب ومشرق کے مابین جو ادبی نظریات اور زندگی وکائنات کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی جو جھلک ادب میں دیکھنے کو ملتی ہے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ مگر اسلامی نقطۂ نظر ہر جگہ غالب رہا ہے اور آخر میں لکھتے ہیں کہ ہمارے فن کاروں کا ایک بڑا طبقہ مغرب کی نقالی کرنے کے بجائے مثبت عناصر قبول کرتے ہوئے مشرقی تہذیب کے آئینے میں ادبی نظریات اور حیات وکائنات سے متعلق نقطۂ نظر کو خود اعتمادی کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔ غرض اس کتاب میں مشرقی اور مغربی تہذیبی اقدار وافکار کے حوالے سے جو موازنہ پیش کیا گیا ہے، اس نقطۂ نظر سے یہ تصنیف کافی اہمیت کی حامل ہے اور امید ہے کہ اس کے مطالعے سے ادب میں اس حوالے سے نئی راہیں ہموار ہوں گی۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی بیش تر تحقیق کا موضوع ثقافتی اور عمرانی مطالعے کو ہی بنایا ہے اور اس موضوع کے اعتبار سے انہوں نے جو تحقیقی کارنامہ پیش کیا ہے اس سے اردو ادب کے طالب علموں کے لئے مستقبل میں ادب کے ثقافتی اور عمرانی مطالعے کی راہ

آسان ہو جاتی ہے۔خاص طور سے لکھنؤ کے شعر وادب کے حوالے سے ان کی دو کتابیں کافی اہمیت رکھتی ہیں جس کے مطالعے کے بغیر دبستانِ لکھنؤ کی تاریخ کے کسی نتائج کا اخذ نہیں کیا جا سکتا ہے۔انھوں نے اپنی تحقیق میں جس ایمان داری اور خودداری سے باتوں کو پیش کیا ہے وہ واقعی کوئی باشعور ادیب یا قلم کار ہی یہ کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ان تصانیف میں ڈاکٹر عبدالباری کی زبان وہی ہے جو اس وقت کی ادبی و معیاری زبان کہی جا سکتی ہے، جو بات کہتے ہیں دلیل کے ساتھ صاف اور سلیس انداز میں کہتے ہیں ان کی تحریروں میں کہیں بھی الجھاؤ یا پیچیدگی نظر نہیں آتی۔امید ہے میرے اس مقالے کے بعد ادب میں ان کی اہمیت میں اضافہ ہوگا جو ان کا بنیادی حق بھی ہے۔

☆☆☆

حواشی

(۱) ڈاکٹر سید عبدالباری، پیش لفظ، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔۹

(۲) ابنِ فرید، مقدمہ، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔۱۴

(۳) ابنِ فرید، مقدمہ، اردو ادب کا تہذیبی تناظر، ڈاکٹر سید عبدالباری ص۔۱۴

(۴) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔۱۶

(۵) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔۱۷

(۶) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔(۱۸)

(۷) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔۲۰

(۸) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔۲۱

(۹) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔۲۴

(۱۰) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔۲۵

(۱۱) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔۳۸

(۱۲) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔۴۶

(۱۳) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔۵۸

(۱۴) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔۶۲

(۱۵) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔۸۲

(۱۶) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو ادب کا تہذیبی تناظر ص۔۱۱۷

(۱۷) اردو ادب کا تہذیبی تناظر، ڈاکٹر سید عبدالباری ص۔۱۲۱

(۱۸) اردو ادب کا تہذیبی تناظر، داکٹر سید عبدالباری ص۔۲۱۱

(۱۹) لکھنؤ کا شعر و ادب، ڈاکٹر سید عبدالباری ص۔۱۳

(۲۰) لکھنو کا شعر و ادب، ڈاکٹر سید عبدالباری ص۔۱۶

(۲۱) ڈاکٹر عبدالباری، لکھنؤ کا شعر و ادب۔ ص۲۴

(۲۲)ڈاکٹر سید عبدالباری لکھنؤ کا شعر وادب،ص۔۲۶
(۲۳)ڈاکٹر سید عبدالباری،لکھنؤ کا شعر وادب،ص۔۸۰
(۲۴)ڈاکٹر سید عبدالباری،لکھنؤ کا شعر وادب،ص۔۹۳
(۲۵)ڈاکٹر سید عبدالباری،مقدمہ،لکھنؤ کا شعر وادب،ص۔۸
(۲۶)ڈاکٹر سید عبدالباری،مقدمہ لکھنؤ کا شعر وادب،ص۔۹
(۲۷)ملک زادہ منظور،سرورق،لکھنؤ کے ادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر،
(۲۸)داکٹر سید عبدالباری،بیسوی صدی کے اردو ادب کا جائزہ،ص۔۲۴
(۲۹)ڈاکٹر سید عبدالباری،بیسوی صدی کے اردو ادب کا جائزہ،ص۔۶۸
(۳۰)ڈاکٹر سید عبدالباری،انیسوی صدی کے ادب کا جائزہ،ص۔۶۹
(۳۱)ڈاکٹر سید عبدالباری،بیسوی صدی کا ادب،ص۔۹۹
(۳۲)ڈاکٹر سید عبدالباری،بیسوی صدی کے اردو ادب کا جائزہ،ص۔۲۵۳
(۳۳)ڈاکٹر سید عبدالباری،بیسوی صدی کا شعر وادب،ص۔۲۶۰

باب سوم (ب)

ڈاکٹر عبدالباری کا نظریہ نقد اور عملی تنقید کا جائزہ

موجودہ عہد میں اردو ادب کی دنیا میں غیر معمولی ہما ہمی اور تنوع ہے۔ بے شمار تنقیدی مضامین و مقالات کے مجموعے یکے کے بعد دیگرے منظرِ عام پر آرہے ہیں، جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیسوی صدی کے اواخر میں جب زمانے نے نئی کروٹیں لیں تو ہمارے ادب وتنقیدی رویہ میں بھی کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔اس صدی کی تیسری دہائی میں مغربی تنقید کے جدید پیمانوں سے اردو ادب میں اپنی تنقیدی روایات کی روشنی میں ایک صحت مند ادب کی تفہیم اور قدر شناسی کا میلان پیدا ہوا، جس سے زندگی اور ادب کے اندر کچھ ٹھوس مقاصد اور کچھ ایسے مفاہیم کی تلاش ہوئی ہے، جس سے مشرق کے کھوئے ہوئے اقدار کی بازیافت میں ایک اہم رجحان منظرِ عام پر آیا۔ان رجحانات کی روشنی میں تنقید وتحقیق کے متعدد افکار، نظریات اور نکات پیش کئے جا رہے ہیں ۔اس کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری تنقید زوال پذیر ہے۔اردو ادب میں محمد حسین آزاد، مولانا حالؔی، علامہ شبلی ،اور کلیم الدین احمد وغیرہ نے اپنی بصیرت و ذہانت سے جو تنقیدی پیمانے بنائے تھے، ان کی شکست وریخت کے سوا کوئی بھی تعمیری، متوازن اور شائستہ طرزِ فکر کسی نے آج تک پیش نہیں کی ہے۔ ہمارے ادب میں جو کچھ ہے سب پرانا ہے کچھ بھی نیا نہیں ہے اور اسی کے سہارے اردو تنقید آج تک پھل پھول رہی ہے۔ادھر کچھ ناقدوں نے ادب کی مملکت سے نظریات واقدار کو بے دخل کر کے ہمارے ادب میں بڑی افراتفری کی صورت پیدا کر رکھی ہے ۔زبان و بیان، اسالیب ،فن اور ہیئت کی خوب بحثیں ہو رہی ہیں، قاری، ادب کا مطالعہ کیوں کرے؟ اور کس طرح کرے؟ ادب سماج اور قاری ان تینوں کی ادب میں کیا اہمیت ہے؟ وغیرہ موضوعات پر بڑی موشگافیاں ہو رہی ہیں۔لیکن کسی نے اس بات پر توجہ نہیں کی کہ ادب میں جو مواد و موضوعات پیش کئے جا رہے ہیں ان کی اہمیت اس کے وزن اور ان کے اعتبار پر بھی غور وفکر کیا جانا چاہئے۔مغرب کے افکار ونظریات کی اندھی تقلید نے ہمارے اہلِ قلم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے، وہ اپنی تہذیب و اقدار اور اپنے شاندار ماضی کو جو ہمارا بیش قیمتی سرمایہ ہے، اس کو از کار رفتہ اور بے مقصد قرار دے کر دفن کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور جو کچھ نئی نسل کو دے رہے ہیں، وہ نہایت سطحی، پراگندہ اور منتشر افکار کا مجموعہ ہیں۔لیکن اس ماحول میں کچھ ایسے نقاد بھی موجود ہیں، جن کو اپنے ماضی کے تہذیبی ورثے اور اقدار کا خیال ہے اور وہ اپنی اصل کی اساس کا شعور بھی رکھتے ہیں۔ وقت کی آندھی میں اڑ جانے کی بجائے فن کار کے ساتھ انصاف کرتے ہیں اور اس کے خونِ جگر، اس کے خلوص کی اہمیت اور بنی نوع انسان کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ان میں ایک تابناک شخصیت کا نام ڈاکٹر سید عبدالباری کا بھی ہے، جن کی تنقید نگاری میں موجودہ

عہد کی تنقید نگاری سے مختلف طرزِ فکر دیکھی جا سکتی ہے اور اس عہد کے ہجوم میں ان کی تحریروں اور تنقیدی نظریات وافکار میں ایک طرح کی انفرادیت اور ان کے امتیازات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کی ہمہ جہت شخصیت اردو ادب اور تنقید کی دنیا میں اپنا ایک الگ امتیاز رکھتی ہے۔ وہ بیک وقت ایک دیدہ ور محقق، نقاد، پر مغز دانشور، فن شناس، کہنہ مشق شاعر اور بیباک صحافی تھے۔ انہوں نے سر سید، حالی، شبلی اور اقبال کی ادبی روایات اور فکری ورثہ کے تسلسل کو اپنی تحریروں میں ہمیشہ برقرار رکھا اور کلاسیکیت، رومانیت، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے درمیان فکر وتحقیق کی ایک منفرد اور متوازن راہ بنائی۔ انہوں نے سماج، معاشرہ، اقدار، تہذیب اور عصری تقاضوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے فن وتخلیق کی دنیا میں اپنا قدم بڑی مضبوطی سے جمایا۔ عبدالباری تحریکِ ادب اسلامی کے روحِ رواں اور ادارہ اسلامی ہند کے کل ہند صدر بھی رہ چکے ہیں، اس لئے ان کی شناخت اسلامی فکر کے ترجمان کی حیثیت سے بھی ہوتی ہے۔ دراصل وہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں ہی جماعتِ اسلامی ہند سے وابستہ ہوگئے تھے اور پوری زندگی اسی زاویۂ فکر کو اپنی تنقیدی وتحقیقی سرگرمیوں کی بنیاد بنا کر قوم کی رہنمائی اور اردو زبان وادب کی آبیاری کرتے رہے۔ ان کی کوئی بھی تنقیدی یا تحقیقی تحریر ایسی نہیں ہے، جو اسلامی فکر سے خالی ہو۔ تنقیدی مضامین میں بھی انہوں نے جو ذاتی نظریات وافکار پیش کئے ہیں ان میں بھی اس فکر کی کارفرمائی ہر جگہ نمایاں ہے۔ ڈاکٹر عبدالباری نے اپنے بیش تر مضامین میں اسی فکر کو اپنا محور مان کر اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے اور پوری یکسوئی اور سچی لگن کے ساتھ اخلاقی وتہذیبی اقدار کی روشنی میں شعروادب کے میدان میں بڑی خاموشی سے تاحیات ادب کی خدمت کرتے رہے۔

غرض یہ کہ سید عبدالباری صاحب صالح اور پاکیزہ ادب کے ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ ادب برائے ادب اور زندگی برائے بندگی کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب، اخلاق اور اقدار کا پہلو ان کی تحریروں میں واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دراصل عبدالباری صاحب کو زندگی کی اعلیٰ قدروں اور اصولوں سے غیر معمولی دلچسپی رہی ہے، جس کی جھلک ان کی تحریروں اور شخصیت دونوں میں نظر آتی ہے۔ ان کی تحریریں نہایت پختہ اور فکر نہایت مستحکم ہے۔ وہ حق وناحق اور خیر وشر کا ایک متعین پیمانہ رکھتے ہیں اور اسی کی روشنی میں متوازن رائے فراہم کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے قلم کو کبھی بیچا نہیں اور نہ ہی کسی عہدے یا منصب کو حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا، بلکہ خلوص کے ساتھ ایک سچے فنکار کی مانند تعمیری رویہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، ادب کی بے لوث خدمت انجام دیتے رہے۔ اگرچہ آپ نے جس زمانے میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا، وہ ترقی پسند

تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ دنیا میں ہر سو اس کی پذیرائی ہو رہی تھی۔ آپ کے کچھ ہم عصروں نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا لیکن آپ نے اس وقت بھی اپنے قلم کو نہ صرف اس کے سائے سے محفوظ رکھا، بلکہ اس کے ساتھ ہی اسلامی اصول پر مبنی ''تعمیر پسند ادب'' کے نظریہ کو پیش کیا اور نزاکت پر مبنی ترقی پسند تحریک کے نظریہ کا اپنے زورِ قلم سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس وقت اگر آپ بھی چاہتے تو دولت، شہرت و مقبولیت سب کچھ حاصل کر لیتے، لیکن آپ نے اپنے اصول پر قائم رہنے کو ترجیح دی۔

تنقید کی دنیا میں ڈاکٹر سید عبدالباری کے مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے یہ مضامین ادب میں گراں قدر سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تنقید میں ان کی اپنی ایک الگ شناخت ہے۔ موجودہ عہد میں اردو کے بہت سے نقاد احساسِ کمتری کا شکار نظر آتے ہیں اور وہ مغرب سے درآمد نظریات، تجربات و افکار کو عقل کی معراج اور ادب کا اعلیٰ معیارِ نقد سمجھتے ہیں۔ ان تمام ادیبوں اور ناقدوں نے مغرب کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے لیکن اس ماحول میں ڈاکٹر سید عبدالباری کے مضامین ایک نیا رنگ و روپ اور الگ آہنگ رکھتے ہیں۔ انہوں اپنے تنقیدی مضامین میں اپنے عہد کے ممتاز شعرا، معاصرین اہلِ قلم اور نثر نگاروں کی کاوشوں کا بھرپور جائزہ پیش کرتے ہوئے، اپنی آزادانہ رائے، نظریات و افکار کے ادراک سے ادب کی شناخت اور اس کے مستقبل پر فکر انگیز گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے مضامین میں جو سب سے اہم باتیں کی ہیں وہ ادب، فن اور ہئیت پر ہونے والی بحثیں ہیں۔ یہ مضامین قطعیت کے ساتھ تنقید کے محکم اصولوں و اقدار کی روشنی میں لکھے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے ان کی وسیع النظری اور ادب سے ان کی گہری وابستگی کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کی اہمیت اس اعتبار سے بھی نمایاں ہے کہ انہوں نے انتشار، لاسمتی اور عدم تیقن کے اس دور میں خود اعتمادی کے ساتھ خوش گوار اسلوب میں صحت مند نظریہ پیش کیا۔

ادب کی تفہیم و تعبیر کے سلسلے میں غور و فکر کرتے ہوئے انہوں نے کچھ اصولی بحثیں کی ہے اور کچھ تاریخی الجھنوں کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ عملی تنقید کے کچھ ایسے متوازن نمونے پیش کئے ہیں۔ جن سے ہمارے ذہن میں سولات کے کئی سوتے پھوٹتے ہیں، جو ہمارے لئے ایک نئی راہ ہموار کرتے ہیں، جس کی روشنی میں ہمیں عصرِ حاضر کے اہلِ قلم کی ادبی خدمات کا جائزہ لینے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالباری نے ادب کی تعبیر و تشریح کے سلسلے میں جہاں تک ممکن ہو سکا انتہا پسندیوں سے، جن کے سبب ادب کئی طرح کی لغزشوں اور ٹھوکروں سے دوچار رہا ہے، اپنا دامن بچاتے ہوئے ادب کے مروج نظریات و تصورات کو سامنے رکھ کر ایک

جادۂ اعتدال کی جستجو کی ہے۔انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین میں مشرق ومغرب میں حیات وکائنات اورانسان کے ذوقِ جمال،کاوشِ فکراور تخلیق وتنقید کے جوخیالات مدت سے بکھرے پڑے ہیں اور جن کی وجہ سے مختلف تحریکیں وجود میں آئیں،ان کے حسن وقبح کوسامنے رکھ کرمشرق کے متعدددانشوروں،نقادوں خصوصاً حالیؔ،شبلیؔ،سرسیداورعلامہ اقبالؔ نے فکروفن کے سلسلے میں جونظریات پیش کر کے قرآن وحدیث کی روشنی میں ادب کی جو رہنمائی کی ہے،اس سے حتیٰ الامکان استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے یہ مقالات اسی کوشش کی ایک اہم کڑی ہیں،ممکن ہے کہ ان پر تحقیقی مقالہ لکھنے سے اردوادب میں کوئی نیا،متوازن اورٹھوس نتیجہ برآمد ہوسکے۔

اس باب میں مذکورہ بالا تمام باتوں کی روشنی میں ڈاکٹر عبدالباری کے سبھی تنقیدی مجوعوں کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔ان میں انہوں نے جونظریاتی تنقید پیش کی ہےاس کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان کی عملی تنقید پر بھی بحث کی جائے گی۔ان کے تنقیدی مضامین کے کل آٹھ مجموعے ہیں جن میں مختلف موضوعات پر مضامین موجود ہیں۔یہاں ان سب پر بالترتیب عہد بہ عہد بحث کی جائے گی جومجموعہ پہلے شائع ہوااس پر پہلے گفتگو کرتے ہوئے،آخری مجموعے پر بحث کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ان تمام مجموعوں میں کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جن کا ادب سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے،وہ یا تو مذہبی ہیں یا کسی مذہبی شخصیت کے کارناموں کا احاطہ کرتے ہیں۔اس باب میں انہیں موضوع بحث نہیں بنایا جائے گا بلکہ صرف ایسے مضامین پر بات کریں گے جوخالص ادبی ہیں اور جن سے کچھ ٹھوس ادبی نتائج برآمد کئے جاسکتے ہیں۔

ادب اور وابستگی

''ادب اور وابستگی'' ڈاکٹر سید عبدالباری کا پہلا تنقیدی مجموعہ ہے، جس کی اشاعت ۱۹۸۵ء میں دانش بک ڈپو، ٹانڈہ سے ہوئی۔ اس وقت باری صاحب اودھ یونیورسٹی گنپت سہائے پوسٹ گریجوٹ کالج سلطان پور میں صدرِ شعبہ تھے۔ اس مجموعے میں آٹھ مضامین ان کی نظریاتی تنقید کا احاطہ کرتے ہیں اور پانچ مضامین عملی تنقید کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ یہ سبھی مضامین ان کے ادبی زندگی کی ابتدائی زمانے کے لکھے ہوئے ہیں، جو ان کی پچیس سالہ ادبی زندگی کا سرمایہ ہیں اور ان کی ابتدائی ادبی جانچ پرکھ اور ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس مجموعے کا پہلا مقالہ ''ادب اور نظریاتی وابستگی'' کے عنوان سے ہے۔ جس وقت یہ مضمون شائع ہوا ،اس وقت ادبی دنیا میں اس موضوع پر خاصی گفتگو چل رہی تھی۔ چنانچہ مصنف نے بھی اس موضوع پر مضمون لکھ کر ادب اور نظریات کے باہمی رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے یہ سوال قائم کیا ہے کہ ''ادب کسی نظریہ، کسی فکر، کسی فلسفے یا کسی تحریک سے وابستہ رہ کر کیا ادب برقرار رہ سکتا ہے؟ اس سوال کے بعد انہوں نے اس پر مختلف تحریکوں اور نظریات کے حوالے سے اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ ادب اور نظریاتی وابستگی پر ڈاکٹر عبدالباری نے لکھا ہے کہ کوئی بھی بہترین ادب بغیر کسی نظریے کے وجود میں نہیں آ سکتا۔ انہوں نے نظریات کے علاوہ کسی ادیب کے ذاتی تجربات اور اس کے مشاہدات کو بھی ادب کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ اس کی مثال انہوں نے حالی، اکبر اور اقبال سے دی ہے، جنہوں نے کبھی کسی نظریہ کی پاسداری نہیں کی مگر انہوں نے اپنی شاعری میں انہیں چیزوں کو پیش کیا، جو ان کا ذاتی تجربہ تھا۔ یہ لوگ ادب میں اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور غور و فکر کی کئی منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے تھے۔ ان ادیبوں نے کسی بھی نظریہ کا خول نہیں اوڑھا۔ اس کے باوجود اعلیٰ قسم کی تخلیقات پیش کیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری اپنے اس مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''ہم یہاں ادب کے لئے وابستگی کی حمایت کرتے ہوئے کسی نہ کسی نظریہ کی ترجمانی خواہ وہ کیسا بھی ہو، لازمی نہیں قرار دیتے نہ کسی مقتدر طبقہ، گروہ یا ادارہ (ESTABLISHMENT) سے عہد وفاداری یا اس کے خلاف اعلان جنگ کو ادیب پر تھوپنے کی وکالت کر رہے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ ضرور خیال ہے کہ ادیب کے ذاتی تجربات پر کسی طرح کی قدغن نہ لگائی جائے اور اپنے گرد و پیش پر نگاہ ڈالنے، اپنے ضمیر کی آواز پر کان دھرنے اور مشاہدات و تجربات کی صداقت کا اعتراف کرنے سے اسے یہ کہہ

کرنہ روکا جائے کہ اس طرح کا طرزِ عمل ادیب کو غیر ادبی انسان بنا سکتا ہے۔ اگر ادیب اپنے غور و فکر کے نتیجے میں اپنے فکری تضادات، ذہنی آوارگی اور سطحیت سے نجات حاصل کر رہا ہے اور کھرے کھوٹے کو پرکھنے کے لئے معیاروں کو معتبر سمجھ کر اختیار کرتا ہے تو اسے آپ یہ کہہ کر مطعون نہیں کر سکتے کہ وہ نظریہ کی چاکری کر رہا ہے۔ انسان کی ذات کے اندر نمو پذیر ہونے والے نظریات اس کی شخصیت اور اس کی تخلیقی صلاحیت دونوں کو بالیدگی عطا کرتے ہیں بلند نظریات بلند شخصیتوں کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں''۔۱

ڈاکٹر سید عبدالباری کا نظریہ صاف ہے کہ وہ ادب میں نظریات کی پاسداری کے قائل ہیں، چاہے وہ نظریہ اجتماعی ہو یا انفرادی ہو۔ مگر ان کا زیادہ تر جھکاؤ انفرادی نظریہ کی طرف ہے، جو انسان کے اندر سے بے شمار تجربات و مشاہدات کے بعد وجود میں آتا ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کی خامیوں کا واضح کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس نے نظریہ کو سیاسی نعرہ بازی میں محدود کر دیا، جس سے اس عہد کے ادب نے اردو ادب کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچایا ہے۔ اسی طرح وہ جدیدیت کے نظریات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جس نے نہ صرف ادب میں نظریے کی پاسداری سے انکار کیا بلکہ اس نے تمام عقائد، اخلاقی روایات اور ہر طرح کے فلسفے اور فکر سے ادب کو آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس تحریک نے ادب کے لئے کسی بھی نظریے کو مہلک قرار دیا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری مزید لکھتے ہیں:

''یہ لوگ ادب اور نظریہ کو آگ اور پانی کے لئے ایک دوسرے کی ضد قرار دینے لگے۔ ان لوگوں نے اہل قلم کو مشورہ دیا کہ وہ نظریات کے صنم کدوں سے سر جھکائے ہوئے اور فکر و خیال کے کسی بت سرکشی پر نگاہ اٹھائے بغیر گزر جائے۔ ان کے خیال میں کسی بھی سیاسی اور مذہبی نظریہ کی پابندی اور اس کی روشنی میں اپنے اعمال کی ترتیب و تنظیم ہمیں اور کچھ بنا دے لیکن ایک فن کار نہیں بننے دے گی۔ ان کے نزدیک ادب کا ذاتی زندگی یا اس کے کردار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''۲

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سید عبدالباری ادب کو زندگی سے وابستہ کر کے پیش کرنے کے قائل ہیں اور کسی عقیدہ یا نظریہ کے زیرِ اثر ادب تخلیق کرنے کی پرزور حمایت کرتے ہیں۔ ان کے مطابق کوئی نظریہ، عقیدہ اور اقدار ایک ایسا نظام ہے، جس سے فن کار اپنے فکر کی شمعیں روشن کرتا ہے، جو صرف اس کی

شخصیت ہی کو نہیں بلکہ اس کے فن پارے کو بھی آب ورنگ عطا کرتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے مطابق ادیب کے اندر سے ابھرنے والا ذاتی نظریہ نہ صرف لامحدود ہوتا ہے بلکہ اسے آفاقیت بھی ملتی ہے۔یہ نظریہ فن کار کے لئے خارجی حقیقت نہیں بلکہ ذاتی حقیقت بن جاتا ہے۔یہ ادیب کو زمانہ شناس اور خود شناس بھی بناتا ہے اور اس کی فکر کو آزادی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ آس پاس کے حالات اور اس کے تقاضوں سے آگاہ بھی کرتا ہے۔غرض ڈاکٹر سید عبدالباری ایک ادیب یا شاعر کے لئے کسی نظریات کا حامل ہونا ضروری قرار دیتے ہیں مگر وہ نظریات میں تخریب کی بجائے تعمیر کے قائل ہیں اور مذہب وعقائد کی روشنی میں ادب سے وابستگی پر زور دیتے ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے مطابق ایک اچھا ادب فکر ونظر سے وابستگی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا ہے۔غرض انہوں نے اس مختصر سے مقالے میں ادب اور نظریاتی وابستگی کے موضوع پر جامع اور مدلل گفتگو کی ہے، جس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کسی بھی نظریاتی وابستگی اور اعلیٰ اقدار کے بغیر اعلیٰ ادب وجود میں نہیں آسکتا ہے۔

اس مجموعے میں دوسرا مضمون ''ادب: معاشرہ اور ثقافت'' ہے۔اس مضمون میں انہوں نے ان تینوں کے باہمی رشتے کو واضح کیا ہے۔یہ وہی مضمون ہے جس کو انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے ''لکھنؤ کا شعروادب'' میں پیش کیا ہے۔اس موضوع پر پچھلے صفحات پر گفتگو ہو چکی ہے، اس لئے اب ان کے تیسرے مضمون پر بات کرتے ہیں، جس میں انہوں نے تعمیری ادب کا تعارف پیش کیا ہے اور اس کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے تعمیری ادب کے ماضی اور اس کی رفتار پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے موجودہ صورت حال پر تبصرہ کیا ہے۔اس مجموعے میں چوتھا مضمون ''نیا افسانہ: منظر وپس منظر'' ہے، جس میں انہوں نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ موجودہ عہد کے تقاضے کچھ اور ہیں، اس لئے اب افسانے میں تبدیلی ضروری ہے۔آج افسانہ کے فن و ہیت میں کافی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔اب افسانہ وہ نہیں رہ گیا ہے جو پریم چند کے زمانے میں تھا۔اس لئے گزشتہ پچاس برسوں میں دنیا میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور انسانی زندگی کی پیچیدگیاں اور ان کے مسائل پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئے ہیں۔اس لئے ڈاکٹر سید عبدالباری کے مطابق اگر نئے افسانے نے اپنے عہد کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ نہیں کیا تو یہ صنف ایک شاخِ بے ثمر بن کر اپنی اہمیت وافادیت کھو دے گی۔اس مضمون میں بھی انہوں نے اس بات پر خاص توجہ مرکوز کی ہے کہ کسی نظریے کے بغیر بہترین افسانہ نہیں لکھا جا سکتا ہے، مگر جدیدیوں نے اس صنف میں بھی نظریہ وعقائد اور اقدار کو یکسر سے نظر انداز کیا۔وہ جدید افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسلوب وہئیت پہ تیشہ زنی کے ساتھ نظریہ کو بھی جدید افسانہ نگاروں نے ترقی پسندوں کی ضد میں ایک شجرِ ممنوعہ سمجھ لیا۔ یہ بات پرایا شگون بگاڑنے کے شوق میں خود اپنی ناک کاٹنے کے مصداق تھی۔ اس لئے کہ نظریہ کی گرمی کے بغیر انسانی مشاہدات کی حیثیت خس وخاشاک کے بکھرے ہوئے ڈھیر کی مانند ہے جس میں کوئی نظم، کوئی ترتیب اور کوئی مرکزیت نہیں۔''۳

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری افسانے کو بھی کسی نظریے یا عقیدے کے ترجمان کے طور پر پیش کرنے کی حمایت کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے جدید افسانہ نگاروں نے نظریہ سے جس طرح کنارہ کشی کی ہے اور آزادانہ طور پر افسانے میں جو کچھ پیش کیا ہے، اس کو ہدف تنقید بنا کر کافی لعن طعن کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ نظریے سے محرومی کے سبب اس عہد کے افسانوں کو مجموعہ اضداد بنا دیا ہے۔ وہ افسانے کے فن پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے اس کی اہمیت و ماہیت پر روشنی ڈالتے ہیں اور افسانہ نگاروں کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس کراتے ہیں:

''انسانی جذبات کی گہرائیوں میں اترنا اور احساسات کی ہر لرزش پر نگاہ رکھنا افسانہ نگار کی اولین ذمہ داری ہے۔ فقط چونکا دینے والی باتیں اور قاری کو حیران وششدر بنا دینے والی سچویشن پیدا کر دینا افسانہ کی معراج نہیں ہے۔ ایک بالغ النظر فن کار ہمارے جذبات کی گہرائیوں میں اترتا ہے اور ہمارے تجربات ومشاہدات کی معنی خیز توضیح کرتا ہے۔''۴

ڈاکٹر سید عبدالباری افسانہ نگار سے یہ امید کرتے ہیں کہ وہ اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں انسانی زندگی کی حقیقی تصویر کشی کرے۔ اس طرح وہ افسانے کے فن پر اپنے نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہمارے جدید افسانہ نگار افسانے کی معنویت اور اس کے توازن پر خاص توجہ صرف کر رہے ہیں اور افسانے میں یہ لوگ تصور اور نقطۂ نظر کی اہمیت کو سمجھنے لگے ہیں اور وہ نظریات وعقائد کی زندگی میں کسی نہ کسی سطح پر ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر عبدالباری افسانے میں کسی نظریے کی حمایت کرتے ہوئے جدید افسانہ نگاری کے منظر وپس منظر میں اپنے نظریات وخیالات کی وضاحت کی ہے اور افسانے میں اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی توازن کو برقرار رکھنے کی افسانہ نگاروں سے گزارش بھی کی ہے۔ وہ پیچیدہ علامتوں اور پر اسرار واقعات کو افسانے کے لئے مضر قرار دیتے ہیں۔ ایسے افسانے چند قارئین کے علاوہ عام انسان کے ذہن و

دل پر تاثر پیدا کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں ۔ یہ پیچیدہ علامتیں اوراستعاراتی تحریریں افسانے کوایک معمہ بنا دیتی ہیں ۔اس ضمن میں وہ بلراج مین را،انورسجاد،سریندر پرکاش ،شمس نعمانی اور بہت سے افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے افسانوں کو پڑھ کر کسی ڈائجسٹ کی خواہش شدت سے محسوس ہوتی ہے۔غرض ان کی افسانہ نگاری کوہضم کرنا ہر کسی و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ان کے افسانوں کو پڑھ کر ادبی معدہ انتشار کا شکار نہ ہو جائے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس مضمون میں ایسے جدید افسانہ نگارں کا بھی ذکر کیا ہے، جنھوں نے اپنے گہرے علم وفن اور تکنیکی مہارت سے مختلف قوموں ،تہذیب ،تاریخ ،مذاہب ،اساطیر اور لوک کہانیوں اور داستانوں سے اپنے علائم اخذ کئے ہیں اورانہیں احساسات و جذبات کے سانچے میں ڈھال کر کہانی کے انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اس میں علامتوں اور ظاہری ابہام کے باوجود قاری ایسے افسانوں کو پڑھ کر آسانی سے ہضم کر لیتا ہے اور اسے کسی طرح کی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے بلکہ وہ جدت ،تہداری ،معنویت اور فنی عظمت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔اس ضمن میں انہوں نے انتظار حسین ،غیاث احمد گدی اور عبداللہ حسینی کا ذکر خاص طور سے کیا ہے اور ان کی افسانہ نگاری کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

> ''جدید افسانہ بہر حال اس منزل کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں وہ اس دور کے فرد و سماج کے تصادم و تضادات کو اس عہد کے انسان کی پیچیدگی شخصیت کو اس عہد کے سنگین مسائل کو پیش کرنے کے لئے واحد موزوں ترین صنف ادب کی حیثیت سے سامنے آئے گا۔اس میں خیال وفکر کی صداقت ،عصری حسیت ،دردِ آدمیت کی جھلک پیدا ہو رہی ہے۔اس میں آپ بیتی کو جگ بیتی اور جگ بیتی کو آپ بیتی بنانے کا انداز نمایاں ہو رہا ہے۔آج کے بکھرے ہوئے انسانوں کے لمحاتی تجربوں کو نئی معنویت عطا کرنے اور کھوئے ہوئے رشتوں کو پھر سے دریافت کرنے کی طرف میلان پیدا ہو رہا ہے۔ یہ فن کار کی انفرادیت اور اس کے سماجی رشتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہے۔''۵

ڈاکٹر سید عبدالباری کے مطابق جدید افسانہ نگاری اپنے مقاصد ونظریات کی ترسیل میں آج کافی ترقی یافتہ ہوگئی ہے،جس میں زندگی کے تمام واقعات ومسائل اور ہمارے تجربات ومشاہدات کو معنی خیز بنا کر پیش

کرنے کے ساتھ ساتھ ذہن کی گتھیوں کو بھی سلجھایا گیا ہے، جس کے مطالعے سے قارئین کو اپنے دکھ درد کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہونے لگتا ہے اور وہ کچھ دیر کے لئے مسرور ہو جاتا ہے۔ ان افسانوں میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ پڑھنے والا اپنے نفس کا تزکیہ بھی کر لیتا ہے۔ جدید افسانہ نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس مجموعے میں ''جدیدیت اور اس کے مسائل'' کے موضوع پر فکر انگیز گفتگو کی ہے، اس مجموعے میں زیادہ تر مضامین ایسے ہیں جو ان کے تحقیقی مقالوں میں شامل ہیں، مگر انہوں نے اس میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اسے اور بھی فکر انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے ادب میں جدیدیت کے ذریعے درآمد ہونے والے خیالات و موضوعات کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کے مطابق جدیدیت کی بنیاد الحاد، مادہ پرستی، منجمد روحانیت اور اشتراکیت پر قائم ہے۔ اسے خود اپنے وجود پر بھروسہ نہیں ہے، اس کے باوجود وجودیت کے فلسفے کو کافی اہمیت دیتی ہے۔ جدیدیت کے انہیں فلسفوں کے خلاف ڈاکٹر سید عبدالباری نے اسلامی ادب کا نظریہ پیش کیا ہے، جس کے مطابق جدیدیت کا فلسفہ بالکل بے سود ہے اور انسانوں کو راہِ راست پر لانے کے بجائے بھٹکانے کا کام کرتا ہے۔ جدیدیت پر سخت تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمیں دیکھ کر انتہائی مایوسی ہوتی ہے کہ غلط فلسفوں اور مکروہ نظریوں، گمراہ کن توہمات اور فرسودہ روایتوں، ظالم و بے رحم سماج کی بد اعمالیوں اور تہذیب جدید کی ریاکاریوں سے بیزار ہونے کے باوجود جدید انسان ابھی تک ان سے دامن کش نہیں ہو سکا ہے۔ اسی تمدن کی بہت سی خباثتوں سے وہ ہنوز لذت اندوز ہو رہا ہے۔ فرائڈ نے انسان کی حیوانی خواہشات کی آزادانہ تکمیل کے لئے جو گرین سگنل دیا تھا اور جسے دیکھتے ہی یورپ کے آرٹ و ادب اور معاشرہ و تہذیب میں جنسی بے راہ روی اور حیوانی تلذذ پسندی کی طوفانی لہریں چل پڑیں اور اس کے نتیجے میں جو اعصابی ہیجان، اخلاقی فساد اور جسمانی و روحانی ضعف وجود میں آیا، جدیدیت کے علمبردار اس ہمہ گیر (IMPOTENCY) کا ماتم کرتے ہیں مگر خود اپنی فکر و کاوش میں جنسی تلذذ کی اس چنیا بیگم سے دل بہلائے بغیر نہیں رہ سکے۔''٦

ڈاکٹر سید عبدالباری نے جدیدیت کے زیر اثر ادب میں ابھرنے والے تنہائی کے احساس کو اسے وہ مستقبل میں کسی بڑے سماجی انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیا ہے اور ان کی یہ پیش گوئی آج بالکل سچ ثابت ہو رہی

ہے۔موجودہ عہد میں جملہ سیاسی وسماجی ہنگامہ آرائیوں کے باوجود آج کا سماج انسانوں کے ذہنی تھکن اور خلا کو محسوس کر رہا ہے۔ ہر انسان کو اپنے وجود میں ایک خلا کا احساس ہو رہا ہے اور وہ زمین اور آسمان دونوں سے بیزار نظر آتا ہے۔موجودہ عہد کا انسان جدیدیت کے زیر اثر بے یقینی کا فضاؤں میں سانس لیتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے مطابق آج کا انسان حقیقت سے آنکھیں بند کر چکا ہے اور وہ ادب میں جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے، جس کا نتیجہ یہ دکھائی دے رہا ہے کہ ایک تازہ جنم لینے والے عہد کو ادب کے ذریعے کسی صحت مند رخ پر موڑنے کا ایک گراں قدر موقع وہ کھو چکا ہے اور آج کا ادیب لاشعوری طور پر اپنے اضطراب کا اظہار ادب میں کر کے ان بنیادوں کو ٹٹول رہا ہے جہاں شخصیت کو قرار اور ثبات حاصل ہو سکے ،کیونکہ سارے مادی اور خارجی سہارے اس کے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو سنبھالنے میں ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔اس لئے اس نے اپنی ساری توجہ اپنی ذات پر مرتکز کر دی ہے۔اس طرح ڈاکٹر سید عبدالباری نے جدیدیت پر اپنے نظریات کا اظہار کرتے ہوئے فرد کی تنہائی اور اس کی بے چارگی پر طویل گفتگو کی ہے فرماتے ہیں:

> ’’ کل کے انسان کی خلوتیں اسے توانائی اور تازگی بخشتی تھیں۔اس کے احساسِ تنہائی میں بے چارگی و بے بسی کی آمیزش نہیں تھی۔اسے اپنی خلوتوں سے اپنی جلوتوں کو حسین بنانے کا عرفان حاصل ہوتا تھا۔حیات و کائنات کے کتنے سربستہ رازوں کو بشر کی اسی طرح کی تنہائیوں نے فاش کیا ہے۔مگر اس دور کا احساس تنہائی انسان کی رہی سہی توانائیوں کو بھی سلب کرتا جا رہا ہے۔اس احساس کا دائرہ اس کی ذات کے گرد دن بدن اتنا تنگ ہوتا جا رہا ہے کہ شاید ایک دن یہ اس کے گلے کا پھندا بن کر رہ جائے۔‘‘ [۷]

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے اس مقالے میں جدیدیت کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے نہایت منطقی اور استقلالی انداز میں اپنی بات کہی ہے۔ان کی پیش کی گئی ان تاویلات سے شاید ہی کوئی ذی فہم شخص انکار کرسکتا ہو۔انہوں نے تعمیری ادب کے نقطۂ نظر سے جس انداز میں جدیدیت کو رد کیا ہے وہ یقیناً بڑی ہمت اور حوصلہ مندی کا کام ہے، جسے ڈاکٹر سید عبدالباری جیسی بیباک شخصیت ہی انجام دے سکتی ہے۔ان کی یہ بات سہی بھی ہے کہ ادب میں جس طرح مختلف نظریات کی لوگ پذیرائی کر رہے ہیں،اسی طرح اسلامی ادب یا تعمیری ادب کی بھی کرنی چاہیئے ،کیونکہ یہ نظریہ اپنے آپ میں ایک آفاقی نظریہ ہے۔باقی نظریات وہ ہیں جس

کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔اسلامی ادب کا نظریہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ادب کی ترجمانی کرتا ہے،اس لئے اس عہد کے ناقدوں کو اس سے شکن آلود ہونے کے بجائے اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔غرض ڈاکٹر سید عبدالباری کے مطابق جدید نظریہ جو الحاد اور مادیت پر ٹکا ہوا ہے اس نے انسانوں کو ایک ایسے خوف ناک کنویں میں پھنسا رکھا ہے جہاں سے انسان کا نکلنا بہت مشکل ہے اور وہ اسی کرب وتنہائی کے عالم میں اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس مجموعے میں ''اردو شاعری میں ہماری تہذیب کے نقوش'' کو واضح کیا ہے جس میں انہوں نے خاص طور سے اسلامی تہذیب وتمدن کو مختلف اشعار کے ذریعے واضح کیا ہے اور مختلف ادوار اور دبستانوں کی تہذیب وثقافت پر روشنی ڈالتے ہوئے ملک میں آزادی اور اس کی جدجہد نیز آزادی کے بعد نئے ہندوستان کی تعمیر کا ولولہ اور آزادی وجمہوریت کی نغمہ طرازی،غرض ہماری تاریخ کے ہر موڑ پر اردو زبان و ادب نے ہمارے معاشرے اور تہذیبی اقدار کے جو نقوش ثبت کئے ہیں،ان کی آرزوؤں،امنگوں اور حسرتوں کو مؤثر پیرایے میں اشعار کے ذریعے عکاسی کی ہے۔اردو شاعری میں ملک کی تہذیب کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر عبدالباری لکھتے ہیں:

> ''ہماری تہذیب کا جوہر بھی نہایت قابلِ قدر ہے کہ اس نے انسانی اخوت اور ہمدردی کا ایک بلند تصور ہمیں عطا کیا ہے۔صوفیا کرام نے اسی تصور کی روشنی میں سارے انسانوں کو سینے سے لگانے اور دل کے آبگینہ کو ٹھیس نہ پہنچانے کا سبق دیا۔تصوف کی ساری عمارت اسی احترام آدمیت اور دردِ انسانیت کے وسیع تصور پر کھڑی ہے۔اردو شاعری میں دل کی عظمت اور انسان سے محبت کا ایک سیل رواں ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔''۸

اس مضمون میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے ہماری دلنواز اور انسانیت نواز تہذیب کے صدہا جلوؤں کو اردو شاعری کے آئینے میں پیش کیا ہے۔اس کے بعد انہوں نے ''عربی شاعری کا جاہلی دور'' پر ایک مبسوط مضمون پیش کیا ہے،جس سے ان کی عربی ادب پر گہری نظر اور اس کے مطالعہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اس مجموعے میں انہوں نے علامہ شبلی کے چھوٹے بھائی مہدی حسن کے خطوط کا جائزہ پیش کیا ہے،جو انہوں نے لندن سے علامہ شبلی اور اپنے چچا کو ارسال کئے تھے۔یہ خطوط ڈاکٹر عبدالباری کو شبلی کے خاندان کے کسی فرد سے موصول ہوئے

ہیں، جن کی تعداد تقریباً پچاس کے آس پاس ہے۔ ان خطوط کو مصنف نے من وعن نقل کر دیئے ہیں، مگر اس سے پہلے تمام خطوط کے تاریخی پس منظر اور ان کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ جس سے مہدی حسن کی افتادطبع ، ہندوستان کی تاریخ ، انگریزوں کے بارے میں مہدی حسن کے تاثرات ، اس عہد کی تہذیب اور رسم و رواج وغیرہ کی تفصیلات کا علم ہوتا ہے۔

اس مجموعے میں سب سے طویل اور ہنگامہ خیز مضمون ''فراق: مجموعہ اضداد'' ہے، جو انہوں نے فراق کی شاعری پر قلم بند کیا ہے۔ اس میں انہوں نے فراق کی فکر وفن ، قول وفعل اور نظریات وخیالات کا مجموعی جائزہ پیش کیا ہے اور فراق کی شاعری کو اپنی تنقید کا سخت نشانہ بنایا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے فراق کو ایک اچھا شاعر تسلیم کیا ہے مگر ان کی نظریں ضرب کاری اور نگاہِ بیدار سے محروم ہیں۔ فراق کی شاعری سے متعلق زیادہ تر ناقدین کا خیال ہے کہ انہوں نے پہلی بار ہندوستانیت سے اردو شاعری کو روشناس کرایا۔ یہ بات صحیح بھی ہے کہ قدیم ہندو فلسفہ و دیو مالا ، ہندوستانی مناظر اور علامات کو انہوں نے بڑے سلیقے سے اردو شاعری کی زینت بنایا مگر ڈاکٹر سید عبدالباری ناقدین کے اس نظریہ کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان دعوؤں کو آنکھ بند کر کے وہی مان سکتا ہے، جس کی نظر میں ہندوستان کے فارسی شعرا، قدیم اردو شاعری کا ذخیرہ اور متقدمین کا سرمایہ نہ ہو۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

''جو شخص ہندوستان کی قدیم صوفیانہ روایات کے اسلامی عہد میں احیا اور بھگتی تحریک کے اردو ادب پر اثرات سے واقف ہے وہ کبھی فراق کو اس میدان میں یکتہ وتنہا شہسوار تسلیم نہیں کر سکتا۔ فطرت سے انسان کے قرب کا جو تصور فراق نے پیش کیا ہے وہ اردو شاعری کے لئے نیا نہیں ہے۔''[۹]

ڈاکٹر سید عبدالباری اسی طرح اس مضمون میں فراق کی شاعری سے متعلق کئی نظریوں سے اختلاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ان کی رباعیات کے حوالے سے بھی لکھا ہے کہ روپ کی رباعیاں سراپا نگاری کا اچھا نمونہ تو ہیں لیکن ان میں نہ تو کوئی تخلیقی درد ہے اور نہ کائنات کا غم ونشاط بن جانے کی قوت و گہرائی ہے۔ ان رباعیوں سے فراق کی فن کارانہ صلاحیتوں کا اظہار ضرور ہوتا ہے، مگر ان کی شخصیت اور ان کے فکر وفن کی سطحیت ہمیں مایوس کرتی ہے۔ ان سب اعتراضات کے باوجود فراق کے کلام کی مختلف خوبیوں، ان کے اشعار کی

تہہ داری، فکر کی بلندی، زبان کی گھلاوٹ اور ان کی فن کارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ساری تضاد بیانیوں کے باوجود، نیز فکری کوتاہیوں کے باوصف فراق اس عہد کے ایک بڑے شاعر ہیں جنہوں نے نہ صرف یہ کہ اردو ادب کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ کیا بلکہ موجودہ دور پر وہ احسان بھی کر گئے ہیں کہ فکری خلا، ذہنی انتشار، اور جذباتی تشنج میں گرفتار اس دور کو ان اقدار سے روشناس کرایا جو ان کی زندگی کو پر کیف بنا سکتی ہیں۔ انہوں نے موجودہ دور کے انسان کو اپنے غم کو انگیز کرنے کا ایک نیا انداز عطا کیا۔ ان کی بدولت نئی نسل شائستہ کلامی کا ہنر حاصل کر سکے گی۔''۱۰

اس مضمون میں ڈاکٹر سید عبدالباری کی تنقیدی بصیرت اور وسعتِ نظر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ فراق کے بعد منشی پریم چند کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے پریم چند کو ''قصرِ افسانہ کا اولین معمار'' قرار دیا ہے۔ پریم چند نے اردو افسانے کو ایک نیا رنگ و روپ عطا کیا اور اپنے مخصوص انداز بیان کے سبب عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ انہوں نے سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور فکر و فن اور مواد کے پہلو سے ماضی کی برگزیدہ اقدارِ حیات کے جوہر کو اپنے افسانوں میں نمایاں کیا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے پریم چند کے فکر و فن پر بات کرتے ہوئے ان کی افسانہ نگاری کی اہم خصوصیات کو واضح کیا ہے۔ پریم چند کے بعد انہوں نے ظریف لکھنوی کی مزاحیہ شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے جس میں انہوں نے ظریفؔ کو لکھنؤ کی مزاحیہ شاعری کا ایک اہم ستون قرار دیا ہے۔ اس مجموعے کے آخر میں انہوں نے علامہ شفیق جونپوری کی شاعری کا جائزہ پیش کرتے ہوئے انہیں شاعر خوش فکر و خوش بیان کا خطاب عطا کیا۔ اس مضمون میں انہوں نے شفیق جونپوری کے مختلف اشعار کے ذریعے ادب میں ان کے فنی و فکری امتیازات کو واضح کیا ہے۔

ادب اور وابستگی ڈاکٹر سید عبدالباری کا پہلا تنقیدی مجموعہ ہے، جس کے مطالعے سے ان کی تنقیدی بصیرت اور تجزیاتی مطالعہ کی صلاحیت دیکھنے کو ملتی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر ادب کو ایک نئے زاویے سے پرکھنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس مجموعے میں انہوں نے عملی تنقید سے زیادہ نظریاتی تنقید کا رویہ اختیار کیا ہے اور فن سے زیادہ فکر پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ پورے مجموعے میں کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جس میں تعمیر پسند فکر اور صالح رجحانات کی جھلک دیکھنے کو نہ ملتی ہو۔

نقدِ نوعیار

''نقدِ نوعیار'' ڈاکٹر سید عبدالباری کا دوسرا تنقیدی مجموعہ ہے، جو نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ سے دسمبر ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ اس زمانے میں معاشرے، تہذیب و تمدن میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں، جس کے زیر اثر اردو ادب و تنقید کی دنیا میں بھی بڑے تغیرات ہوئے اور اردو ادب میں اپنی تنقیدی روایات کی روشنی میں ایک صحت مند طرز تفہیم و قدر شناسی کا میلان پیدا ہوا۔ ادب اور زندگی کے اندر کچھ ٹھوس مقاصد اور کچھ بسیط مفاہیم کی تلاش ہوئی اور مشرق کے کھوئے ہوئے اقدار کی بازیافت کا ایک عام رجحان منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں سب سے پہلے انہوں نے اردو کے موجودہ ادیبوں کی ماحول سے لاتعلقی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مضمون میں انہوں نے ان لوگوں کے اس سوال کا جواب دیا ہے جن کو یہ شکایت ہے کہ اردو ادب کے موجودہ ادیب اپنے گرد و پیش کے حالات سے لاتعلق کیوں ہیں؟ ڈاکٹر سید عبدالباری کے مطابق لوگوں کا یہ شکوہ بجا بھی معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے عہد کے فن کاروں نے اپنے گرد و نواح میں اٹھنے والے دھوئیں اور اس سے لپٹے ہوئے شعلوں میں جل کر راکھ ہونے والے جسموں اور انسانوں کے کرب اور ہولناک مناظر کو پوری شدت کے ساتھ نہیں محسوس کیا، اگر ان کے احساسات کی دنیا، ان حالات کے نشیب و فراز سے مانوس ہوتی تو ان کا دل و دماغ ان خون فشاں مناظر سے کانپ گیا ہوتا اور ان کے ادب میں اس کی جھلک ضرور دیکھنے کو ملتی۔ مصنف ادیبوں کی ماحول سے لاتعلقی کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس لاتعلقی کا سبب مغرب کی ٹھیٹ مادہ پرستی انسانی رشتوں کی شکست و ریخت اس کی اصل مجرم ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے ترقی پسند کے اشتراکی نظام اور جدیدیت کے فلسفہ وجودیت اور مادیت کو خاص طور سے ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

مگر ڈاکٹر سید عبدالباری کے مطابق اردو ادب میں جدیدیت اور ترقی پسند کے علاوہ ایک جماعت ایسی بھی تھی جس نے ۱۹۶۱ء کے بعد ملک میں برپا ہونے والے متواتر فسادات اور بربادیوں کے ہولناک مناظر سے متاثر ہو کر ان اہم مسائل کو اپنی فکر و فن کا محور و مرکز بنایا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کا اشارہ تعمیری ادب کے فن کاروں کی طرف ہے، جنہوں نے اپنے حالات اور گرد و پیش کے حالات پر بے شمار تخلیقات پیش کیں اور اپنے فکر و فن کے ذریعے انسانوں کے ضمیر کو بیدار کرنے کی حتیٰ الامکان کوششیں کیں۔ انہوں نے اپنی بات کو مدلل بنانے کے لئے تعمیری ادب کے مختلف شعرا کے اشعار کا حوالہ دیا ہے جن میں موجودہ عہد کے احوال کی منظر کشی

ملتی ہے اپنی بات کو مدلل اور منطقی انداز میں پیش کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

''اردو زبان کے سرمایہ فکر وفن پر جدیدیت اور عصری مسائل کی روشنی میں غور کرتا ہوں تو مایوس نہیں ہوتا۔ ہمارے بے شمار فنکاروں نے گرد وپیش کے احوال پر قلم اٹھایا اور اپنے فکر وفن سے ضمیر کی بیداری کا سامان پیدا کیا ہے۔ وہ خواہ دوسری یا تیسری صفوں میں ہوں لیکن احتراز و لاتعلقی کی پرچھائیوں سے ان کا قلم محفوظ ہے اور وہ آج اردو ادب کی گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں یا دے چکے ہیں۔''۱۱

''نقد نو عیار'' کا دوسرا مضمون ''اردو افسانہ: امکانات اور وسعتیں'' ہے۔ اس میں انہوں نے پریم چند کے عہد سے لے کر اب تک کے افسانوں کا فکری وفنی جائزہ پیش کیا ہے اور لکھا ہے اردو افسانے نے نوے سال پورے کر لئے ہیں، اس درمیان حالات کے پیش نظر افسانے میں بھی کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ہئیت اور اسلوب کے نئے نئے تجربات ہوئے مگر پھر بھی اردو افسانہ دیگر اصناف کی طرح عروج نہیں حاصل کر سکا اور اردو ادب میں زیادہ اعتبار حاصل نہ کر سکا۔ اس مضمون میں بھی انہوں نے افسانے کی اس صورت حال کا ذمہ دار جنس پرستوں، رومانی افسانہ نگاروں اور ترقی پسند تحریک کے قلم کاروں پر تھوپا ہے، جس کے سبب اسے ایک مدت تک صحیح خطوط پر فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری نے لکھا ہے کہ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے انسانوں کو بالکل برہنہ کر دینے کا نام حقیقت نگاری دیا اور افسانے کو جنس پرستی کا ذریعہ بنایا، جس سے یہ صنف ادب کے دائرے سے خارج ہونے لگی۔ انہوں نے اس ضمن میں منٹو کی افسانہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''منٹو ایک عظیم فنکار اور بے اندازہ افسانوی صلاحیت کے حامل انسان تھے مگر افسوس کہ ان کے فکر وخیال کی دنیا بے حد تنگ تھی۔ انہوں نے اپنے طرز بیان سے انسانی وقار کو اکثر ٹھیس پہنچائی اور تہذیبی اقدار کو پامال کیا۔ وہ انسان کی محرومی، مجبوری، حیوانیت، دیوانگی اور توازن کو بے نقاب تو کرتے ہیں لیکن اس طرح کہ ہمیں خود انسان سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے یا پھر ہم انہیں آلودگیوں کے دلدل میں گرنے لگتے ہیں اور ہمارے اندر خلش اور حوصلہ نہیں پیدا ہوتا کہ ہم فکر مند ہوں کہ ایسے انسانوں کے درد کا کچھ مداوا ہونا چاہئے۔''۱۲

ڈاکٹر سید عبدالباری کے مطابق ترقی پسند افسانہ نگار اسی طرح جنسی تلذذ کا شکار ہوتے گئے، اس کے بعد جدید افسانہ نگاری کا دور آتا ہے، جس نے اس صنف کو پیچیدہ بنا کر اس کا رشتہ عوام سے منقطع کر دیا۔ جنہوں نے علامات واشارات کی پر اسرار بھول بھلیوں میں افسانے کو ایک معمہ بنا دیا، جس کو حل کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ پلاٹ، کردار اور واقعات سے دامن چھڑا کر ان لوگوں نے افسانے کی ایک نئی شناخت قائم کرنی چاہی، لیکن ان تینوں کے نظر انداز کرنے کے بعد افسانے کو مقبولیت ومحبوبیت حاصل نہیں ہو سکی اور عوام کا ایک طبقہ اس صنف سے دور ہوتا چلا گیا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری جدید افسانہ نگاری سے متعلق لکھتے ہیں:

''وہ بے سمتی لا مقصدیت اور نظریاتی تہی دامنی پر ناز فرماں تھے۔ قاری و معاشرے کی کوئی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ ترسیل وابلاغ کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے ان کو وحشت تھی چنانچہ علامتی وتجریدی افسانوں کے نام سے ایسی باتیں کرنے لگے جو مجذوب کی بڑ معلوم ہونے لگی۔ ان افسانوں سے نہ انسانی روح کی تنہائی کا المیہ واشگاف ہوا نہ میکانکی زندگی کا عذاب یہ ہم کو محسوس کرا سکے۔''

مضمون کے آخر میں انہوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے افسانے میں مثبت تجربات کئے ہیں اور اس طرف ہماری موجودہ نسل کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور اب اردو افسانہ بے شمار ٹھوکروں کے بعد کچھ سنبھلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے امکانات روشن ہیں کیوں کہ اس عہد کے افسانہ نگاروں میں وقت کی نبض کو پہچاننے کی صلاحیت نظر آ رہی ہے، اس لئے انہوں نے امید جتائی ہے کہ آنے والے وقتوں میں افسانہ نگاری کا فن انسانی ضمیر کی آواز بن کر اردو کی مقبول ترین صنف بن جائے گی۔

''نقد نو عیار'' میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے ڈرامہ کی روایت پر بھی ایک مضمون تحریر کیا ہے، جس میں انہوں نے آغاز سے لے کر عصرِ نو تک ڈرامہ نگاری اور اس کی خصوصیات، مسائل اور اس میں آنے والی تبدیلیوں اور ڈرامہ نگاری کے فن وروایت پر فکر انگیز باتیں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے مولانا آزاد کی شخصیت اور فن کو ایک نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی سیاسی وملی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی فرزانانیت سے لے کر شکستِ ذات تک کے سبھی

پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اسی طرح انہوں نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی شخصیت پر بھی قلم اٹھایا ہے۔آزادی کے بعد ملک کی جو صورتِ حال تھی اس کے سیاسی وسماجی پس منظر میں مولانا کی صحافتی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی تنقیدی بصیرت اور ادبی وملی خدمات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے آزادی کے بعد ملک میں جمہوریت اور سیکولرزم کی تصویر بگاڑنے والے مجرموں کی اپنے اداریوں میں خوب خبر لی ہے۔مولانا نے اپنے صحافتی خدمات کے ذریعے مشرقی تہذیب اور اس کے تحفظ کی بھرپور وکالت کی ہے بلکہ انہوں نے ''سچ'' اور ''صدق'' علمی وفکری اعتبار سے اسلامی افکار ونظریات کی تائید وترجمانی کی غرض سے ہی نکالا تھا۔مولانا کے ان رسائل نے اردو صحافت میں حق گوئی، بیبا کی اور جرأتِ اظہار کی ایک روشن روایت قائم کی اور اردو صحافت کو ادبی تقاضوں کے ساتھ پیش کرکے اس کے وقار میں خوب اضافہ کیا۔ان کے صحافتی مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالباری لکھتے ہیں:

> ''مولانا کے صحافتی مشن کا مرکزی اور بنیادی پہلو غالباً مشرقی اور اسلامی اقدار کی حفاظت تھا۔وہی مشن جس میں ان سے قبل حالی وشبلی سرگرم عمل تھے اور جس کے لئے لسان العصر اکبرالہ آبادی نے شعر کی دنیا میں ظرافت کا پرچم بلند کیا تھا اور جس کے دفاع کی خاطر اقبال اور ابوالکلام بھی اپنی نظم ونثر میں سرگرمِ جہاد تھے۔مولانا کو احساس تھا کہ یوروپ کی مادہ پرستی اور کام جوئی انسانی معاشرہ اور انسانی شخصیت کو تباہ وبرباد کرنے کی موجب ہوگی وہ مشرق کو اس معاملے میں یوروپ کی نقالی کے خوف ناک نتائج سے آگاہ کرتے ہیں۔''۱۴

غرض مولانا مغربی تہذیب اور اس کی مادیت کے سخت مخالف تھے،انہوں نے اپنے اداریوں میں اس کی سخت مخالفت کی ہے اور مختلف عنوانات سے اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے مادیت پرستی، جدید فیشن، اصراف پرستی اور فحاشی کی سخت مذمت کرتے رہے۔مولانا نے اپنی کوششوں اور کاوشوں کے ذریعے اردو صحافت کو علم وادب، عبرت وعظمت اور حق گوئی وبیبا کی کا مرقع بنادیا۔اس امر میں وہ مولانا محمد علی جوہر سے کافی متاثر دکھائی دیتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے وہ ان کی اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اردو صحافت میں گرانقدر خدمات انجام دے رہے تھے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے تعمیری ادب کے روح رواں ''م نسیم'' کی شخصیت اور ان کی خدمات پر بھی ایک مضمون قلم بند کیا ہے۔جس میں انہوں نے م نسیم سے ذاتی مرعوبیت کا اظہار اور ان سے اپنے مراسم کا ذکر کیا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں ایک با مقصد مزاح نگار قرار دیا

ہے۔اردو ادب میں پیروڈی کی طرف انہوں نے خاص توجہ مرکوز کی۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے مطابق پیروڈی کو م نسیم نے جس مقام پر پہنچا دیا ہے ابھی تک یہ صنف اس سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔اس مضمون میں انہوں نے م نسیم کے تعمیری ادب کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی کوششوں اور کاوشوں کی بدولت اسلامی فکر ایک روشن حقیقت، مسلم صداقت اور وقت کی ایک ناگزیر ضرورت بن کر سامنے آ گئی۔

م نسیم کے بعد جمال احمد پاشا کے فن و شخصیت پر بھی ڈاکٹر عبدالباری نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں،اس مضمون میں انہوں نے ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔جمال احمد پاشا نے اپنے طنزیہ ومزاحیہ مضامین میں لکھنؤ کی تہذیبی نفاست و جمال کو علی گڑھ کی شائستگی ،حاضر دماغی اور دانشوارنہ کمال کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے،جس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رشید احمد صدیقی ،پطرس بخاری اور یلدرم کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں۔اس مضمون میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے جمال احمد پاشا کے مزاحیہ مضامین ''شکر کا چکر''،''ستم ایجاد کرکٹ''،''غدر ۱۸۵۷ء کے اسباب''اور''کتے کا خط پطرس کے نام'' کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔جمال احمد پاشا کے مضامین کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کی تمام فنی خوبیوں کو واضح کیا ہے اور لکھتے ہیں ان کی تحریر اتنی سادہ سلیس اور رواں ہے کہ ہر عبارت کو وہ اپنی شوخیٔ طبع سے دلکش بنا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے مثنوی سحرالبیان کو نئے تنقیدی میزان پر پرکھنے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ میر حسن نے اپنی دانست میں ایک تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا تھا،مگر اس وقت اس کی پذیرائی نہیں ہوسکی۔دراصل اس وقت لکھنؤ میں جس زبان کا رواج تھا میر حسن اس کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکے۔وہ اس عہد کے خاص عنصر مبالغہ آرائی اور تصنع کا حق ادا کرنے سے محروم رہے۔مگر ڈاکٹر سید عبدالباری ان کی مقبولیت کے اسباب تلاش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دراصل اس مثنوی میں غدر سے پہلے کے حالات اور اس کی تہذیب واقدار کی بھرپور عکاسی ہوئی ہے،جس کے سبب لوگوں نے سحرالبیان کو ایک صدی تک اپنی آنکھوں کا سرمہ بنائے رکھا۔اس کی دوسری خوبی میر حسن کا انداز بیان اور زبان و بیان کی بے پناہ لطافت ہے،اسی انداز بیان اور انفرادیت کے سبب میر حسن نے اس مثنوی کا نام سحرالبیان تجویز کیا۔جس سے اندازہ ہوتا ہے میر حسن کو خود اپنی زبان دانی کا احساس تھا،جو ان کے اندر فنی ریاض کے ذریعے پیدا ہوئی تھی،ان کی اس خود اعتمادی نے یقیناً اس مثنوی کو بام عروج پر پہنچانے میں اہم رول ادا کیا ہے،جس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالباری اس مضمون میں مثنوی سحرالبیان کی تمام فنی خوبیوں کا جائزہ لینے کے بعد اس کی تہذیبی اور تاریخی معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میر حسن اپنے ماحول کے سچے نقاد نہ ہوں مگر سچے ترجمان ضرور ہیں۔ وہ اپنے عہد کی ترجمانی اور اس کے جذبات و احساسات کی ترجمانی بالکل حقیقی اور مصورانہ انداز میں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری جدید دور کے تنقیدی تناظر کو واضح کرتے ہوئے، یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ کیا نئے تنقیدی میزان پر مثنوی سحرالبیان اپنی قدر و منزلت برقرار رکھ سکے گی؟ پھر اس کے جواب میں اس کی خصوصیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میر حسن کے کشکول میں کچھ ایسے نوادارت ضرور ہیں جو دورِ جدید کے نقاد کو بھی اپنی طرف متوجہ کریں گے وہ اس مثنوی کی بلاغت اور سحر بیان کے ماسوا اس کے اندر متضاد عناصر میں توافق و ہم آہنگی پیدا کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اسے دورِ زوال کے درباری ادب کے محدود دائرہ میں ایک فنکار کی ایک قابلِ قدر کوشش قرار دے گا اپنے آئینہ تہذیب کی ٹوٹی بکھری کرچوں کو جمع کرکے اور حسن ترتیب کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دوسرا آئینہ بنانے کی جدوجہد کرتا ہے اور یہ سچ ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہے۔'' ۱۵

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اردو زبان کا فروغ اور اس کے مسائل پر ایک طویل مضمون قلم بند کیا ہے، یہ مضمون اس وقت لکھا گیا تھا جب اردو زبان کو اتر پردیش میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس وقت عبدالباری نے اردو زبان کے مسائل پر غور و فکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ صرف دوسری زبان کا درجہ مل جانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، جب تک اسے روزی روٹی سے نہ جوڑا جائے۔ اس لئے اردو کے حامیوں کو اسی پر اکتفا کر کے بیٹھ نہیں جانا چاہئے بلکہ اس کے فروغ کے لئے اپنی جدوجہد کو جاری رکھنا پڑے گا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے اردو کے فروغ اور اس کے مسائل پر بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ارشادات کی روشنی میں اپنی باتوں کو مدلل بناتے ہوئے اردو زبان کی بقا اور اس کی عظمت پر سنجیدگی سے گفتگو کی ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں مولوی عبدالحق کی اردو سے محبت اور اس کے فروغ میں ان کی کاوشوں اور تدبیروں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اردو زبان کے فروغ میں مولوی عبدالحق نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں اس کی روشنی میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے اردو زبان کے مستقبل کو تابناک بنانے اور نئے حالات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا کر اردو زبان کو جو

نقصانات ہوئے ہیں ان کی تلافی کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔

مثنوی اردو ادب کی اہم صنف سخن ہے ڈاکٹر سید عبدالباری نے اردو مثنویوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان میں حمد و مناجات کے اشعار کی نشاندہی کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے دکنی ادب سے لے کر اقبال تک لکھی جانے والی سبھی مثنویوں میں حمد و مناجات کے جو عناصر ملتے ہیں اس کی نشان دہی کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو شاعری میں ہندوستانی تہوار کی نشاندہی بھی کی ہے، جس میں انہوں نے مختلف شعرا کے اشعار کے ذریعے ہندوستانی تہواروں کی جو عکاسی ہوتی ہے اس کو واضح کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نوابین اودھ کی ادبی سرپرستی کا جائزہ لیتے ہوئے، اس سلطنت کے بانی امین الدولہ سعادت یار خاں سے لے کر نواب واجد علی شاہ تک ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ہندوستان کی تاریخ میں نوابین اودھ اس اعتبار سے منفرد و ممتاز درجہ رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی علم دوستی و ادب نوازی کی خاندانی روایات کو ہمیشہ قائم رکھا اور ان کے فیض سے اردو ادب نے ان کے عہد میں بے پناہ ترقی کی اور مختلف اصناف ادب میں ادبی سرمایہ سے مالا مال ایک ترقی یافتہ زبان بن گئی۔‘‘ ۱۶

’’نقد نو عیار‘‘ میں اردو زبان کے مسائل پر ڈاکٹر سید عبدالباری مختلف مقامات پر اپنے درد کا اظہار کرتے ہیں، انہوں نے اپنے ایک مضمون میں اتر پردیش کے اسکولوں میں اردو تعلیم کے مسائل پر غور و خوص کرتے ہوئے، ان کے حل کی کئی صورتیں پیش کی ہیں اور اہل زبان سے مخاطب ہوتے ہوئے مشورہ دیا ہے کہ اردو والے لوگ کم از کم اپنے اداروں میں اردو کی تدریس کو با مقصد اور نتیجہ خیز بنانے کی کوشش کریں، جس سے اردو زبان مستقبل میں پھول پھل سکے۔ اس مجموعے میں انہوں نے ماچس لکھنوی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا جائزہ بھی پیش کیا ہے اور انہیں لکھنوی دبستان کا ایک نرالا مزاح نگار قرار دیا ہے۔ آخر میں انہوں جیلانی بی اے کے افسانوں کا جائزہ پیش کیا ہے، جس میں انہوں نے ان کے پہلے مجموعہ ’’اذان‘‘ میں شامل سبھی افسانوں کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا ہے۔ ان افسانوں کا موضوع ملک کی تقسیم کے بعد پیدا ہوئے حالات اور تمام سنگین مسائل کا درد و غم ہے۔ مصنف جیلانی بی اے کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں اردو افسانے کی ایک منفرد آواز قرار دیتے ہیں۔

افکارِ تازہ

''افکارِ تازہ'' ڈاکٹر سید عبدالباری کا تیسرا مجموعہ مضامین ہے جو ۱۹۹۷ء میں بھارت آفسیٹ پریس دہلی سے شائع ہوا۔اس مجموعے میں ادب کی تفہیم و تعبیر کے سلسلے میں کچھ بنیادی سوالات پر تعمیری ادب کی روشنی میں غور کیا گیا ہے، کچھ اصولی بحثیں کی گئیں ہیں۔ کچھ تاریخی الجھنوں کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس مجموعے کے مطالعے سے عملی تنقید کے کچھ متوازن نمونے اور متعدد اہل قلم کی ادبی خدمات کی تفصیلات ہمارے سامنے آتی ہیں۔اس مجموعے کا پہلا مضمون ''سرورِ دو عالمؐ کا حسن کلام'' ہے، جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ آپ کے حسن کلام نے نہ صرف عربی زبان و ادب کو ایک بیش قیمتی سرمایہ عطا ہوا بلکہ عالمی سطح پر بھی آپ کی حکمت و بلاغت سے لبریز کلام نے نوع انسانی کو شائستگی عطا کی۔اس مجموعہ میں دوسرا مضمون ''نہج البلاغہ کے ادبی محاسن اور فن و ادب پر اس کے اثرات'' ہے۔ جس میں انہوں نے نہج البلاغہ کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نہج البلاغہ اسلامی ادب کے لئے فکر و فن کی ایسی منہاج کی حیثیت رکھتی ہے، جس پر فن و ادب کے قافلے صدیوں سے گامزن ہیں۔اس نے پہلی بار ادب کو صحت مند و تعمیری نظریات سے روشناس کرایا اور اہل قلم کو یہ پیغام دیا کہ اچھے ادب و فن کے لئے اچھے کردار و بلند عزائم، عظیم خیالات اور اسوۂ رسول اور اسوۂ علی اپنے اندر پیدا کرنا لازمی ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری جب اردو ادب میں جدیدیت کے زیرِ اثر مغربی اندازِ فکر اور تعبیر حیات و کائنات کا عکس دیکھتے ہیں تو مایوس نظر آتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ مادیت، عقلیت اور وجودیت کے فلسفے نے ادب میں سطحیت اور لاسمتی پیدا کر دی ہے، جس کے وہ سخت مخالف ہیں۔اس لئے انہوں نے ادب میں تعمیری نظریات کو اہمیت دی اور ادب کی تخلیق نہج البلاغہ کی روشنی میں کرنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ادب کی تخلیق و تنقید کے اسلامی منہاج کی نہج البلاغہ کی روشنی میں بازیافت کی جائے تاکہ مشرق و مغرب کی مختلف زبانوں کے ادب میں موجودہ ہوشربا مسائل کو حل کرنے اور عالم انسانیت کو اضطراب، انتشار اور انحطاط سے نجات دلا کر حقیقی ارتقاء سکون قلب، عالمگیر اخوت و مساوات اور ہم گیر دردمندی و صداقت شعاری کی سوغات عطا کرنے کی صلاحیت پیدا کی جا سکے۔''۱۷

اکٹر سید عبدالباری ادب کی تخلیق وتنقید اسلامی منہاج پر پیش کرنے کے خواہش مند تھے۔ وہ اردو ادب کو اسلامی اقدار کی روشنی میں پیش کرنے کی پرزور حمایت کرتے ہیں اور قرآن کی روشنی میں ادبی شعریات کو وضع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے اسلامی ادب کے نظریات واصول پر بحث کی ہے اور ادب میں ارسطو کے نظریۂ نقل سے انحراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج تک ہمارا ادب اسی غلط محور ومرکز پر گردش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ انہوں نے ادب میں موجودہ عہد میں جتنے بھی نظریات مغرب سے در آمد ہوئے ہیں، اسے نقادوں کی اندھی تقلید قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہمارے ادب میں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ حالی، شبلی، اقبال اور کلیم الدین احمد کے بعد سبھی نقادوں نے مغرب سے آنے والی ہر فکر، خیال و تجربہ، مشاہدہ اور علم وفن کے آگے اس طرح اپنا سر تسلیم خم کر دیا ہے گویا اس سے بہتر کوئی اور نظریہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان سب حالات جائزہ لیتے ہوئے ادب میں اسلامی تخلیق وتنقید کا راستہ ہموار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور قرآن کی روشنی میں ادب کی اہمیت و ماہیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قرآن ہمیں مجرد خیالات کا پرستار نہیں بناتا بلکہ ایک اچھے سماج اور اچھے انسان سے اس محفل کائنات کو بارونق بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ قرآن کی روشنی میں صرف حقائق کے اظہار وانکشاف کا نام ادب نہیں بلکہ سچائیوں کو اختیار کرنے کی ترغیب دینا بھی ایک مثالی ادیب کی شناخت ہے۔ قرآن انسان اور اس کی صلاحیت، فکر وتخلیق اور اہلیت، مشاہدہ و اخذ نتائج کے درمیان حائل تمام رکاوٹوں کو دور کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً جبر واکراہ، تقلید واندھی عقیدت، ہوا وہوس، ظن وتخمین، سحر وطلسم کی تمام چٹانوں کو چکنا چور جملہ علوم وفنون کی طرح ادب کی تخلیق، تنقید اور تحقیق کی شاہراہ کو ہموار بناتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ عرفان آنے والے دور میں اسلامی ادب کے افق کو تابناک سے تابناک تر بنا دے گا۔''۱۸

غرض اس مضمون میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے اسلامی ادب کی اہمیت و افادیت کو واضح کرتے ہوئے، اس کے اصول ونظریات سے ادیبوں کو آگاہ کیا ہے اور اس کی روشنی میں فنکاروں کو مثبت اور صالح ادب پیش کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اشتراکیت یعنی ادب میں ترقی پسند تحریک کے زوال سے پہلے اور زوال کے

بعد کے ادب کا جائزہ پیش کیا ہے، جس میں انہوں نے ترقی پسند تحریک کا تفصیل سے تجزیہ پیش کیا ہے اور اس کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے، اس کی تمام خامیوں کو ایک ایک کر کے واضح کیا ہے اور ادب میں اس سے ہونے والے نقصانات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اشتراکیت کے زوال کے بعد کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے زوال سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ ادب میں بطور فیشن مذہب و اخلاق کی توہین و تذلیل کا سلسلہ ختم ہو گیا اور دوبارہ ہمارا ادب راہ راست پر گامزن ہوا۔ اس تحریک کے زوال کے بعد ادب میں جو نقوش ابھر کر سامنے آئے اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اب ہمارا فن کار گروہ بندی و جانب داری یا پارٹی بندی کی عصبیت اور شہرت و مقبولیت کی خاطر گلا پھاڑ کر بات کرنے کی مصیبت سے چھٹکارا پا چکا ہے۔ اب وہ اچھی طرح سمجھ رہا ہے کہ فیصلہ کن چیز قوت استدلال، مشاہدہ کی گہرائی، فن پر عبور اور فن کار کا خلوص ہے۔ اگر اسلوب اچھا ہے، استدلال میں پختگی ہے، فن کار کے الفاظ، اس کے احساسات و خیالات کے عین مطابق ہیں یعنی اس کے جذبات بلکہ پوری شخصیت اس کی زبان و قلم کا ساتھ دے رہی ہے تو پھر فنکار قاری سے اپنی بات منوا سکتا ہے۔ باقی سب ہتھکنڈے ادب کی دنیا میں عارضی و غیر معتبر ہیں۔ اشتراکی ادیبوں نے جو نمونے پیش کیے اس سے موجودہ نسل بیزار ہے اور خود ان میں جو باشعور ہیں وہ اپنے ماضی پر پشیماں ہیں''[۱۹]

اشتراکیت کے زوال کے بعد جدیدیت نے اس خلا کو پورا کرنے کی کوشش کی، مگر اس کی فکر و نظر میں جو لاسمتی تھی اس نے بہت جلدی اپنا دم توڑ دیا اور اس کے نتیجے میں ادیبوں میں پھر سے صداقت کے اعتراف میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ ادیب کی زندگی اس کے خیالات کے مطابق ہونی چاہئے اور اس کے قول و عمل میں تضاد نہ ہو، اگر ان ادیبوں کے اندر خلوص اور صداقت کے جذبات کارفرما ہیں تو ان کی تخلیقات میں خود بخود اثر انگیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ادب میں اشتراکیت اور جدیدیت کے انتہا پسند فلسفوں سے دامن بچاتے ہوئے کچھ ادیبوں نے روشن شاہراہ پر مثبت طرز فکر اور تعمیری نظریات کو پیش کیا۔ ان ادیبوں نے اقبال، حالی اور شبلی کی روایت کو ادب میں ہر حال میں برقرار رکھا اور موجودہ عہد میں ان کی آواز عوام و خواص کے دل کی آواز بن گئی۔ اس ضمن میں انہوں نے تعمیری ادب سے تعلق رکھنے والے کچھ شعرا کے کلام کو پیش کر کے اپنی بات کو مدلل بنایا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے مولانا حمیدالدین فراہی اور شعریات مشرق کے عنوان سے ایک مضمون قلم بند کیا ہے، جس میں مولانا فراہی کے تنقیدی نظریات سے قارئین کو متعارف کرایا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے مولانا کی معروف کتاب ''جمھرۃ البلاغہ'' کی روشنی میں ارسطو کے نظریہ ادب پر زبردست تنقید کی ہے۔ مولانا فراہی کو اس بات کا افسوس تھا کہ ماضی میں سخن شناسی کا کوئی معتبر معیار قائم نہ ہو سکا اور زیادہ تر لوگ حکمائے یونان کے خیالات وافکار سے گمراہ ہوتے رہے۔ یہی سبب ہے مولانا نے یونانی شعریات کے بجائے عرب شعریات کی روشنی میں ادب شناسی کا نظریہ پیش کر کے شعر وسخن کی قدر شناسی صحیح بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ارسطو کے نظریات محاکات کو ادب کے لئے مہلک قرار دیا ہے اور بلاغت سے متعلق ارسطو کے جو تصورات ہیں، ان کو بھی آنے والی نسلوں کے لئے بے حد گمراہ کن قرار دیا ہے۔ یونان کے مفکروں سے لے کر مغرب اور مشرق تک ادب کی تنقید اور تحسین میں جو خامیاں ہوئی ہیں، اس پر پہلی بار مولانا فراہی نے بڑی جرأت کے ساتھ تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے مولانا فراہی کے تنقیدی نظریات کا جائزہ پیش کرتے ہوا لکھا ہے:

> ''مولانا کے فرمودات کی مزید تشریح وتوضیح کی ضرورت ہے اور قرآن نے فنون لطیفہ کے سلسلہ میں جو نقطۂ نظر عطا کیا ہے اور بلاغت کی جن حدوں کا تعین کیا ہے اس پر مزید غور خوض کی ضرورت ہے تا کہ یونانی ومغربی اور ایک حد تک قدیم مشرقی شعریات سے الگ اسلامی شعریات کے خد وخال متعین کئے جا سکیں۔ مولانا فراہی کی جملہ تصانیف کے گہرے مطالعہ کے بعد مستقبل کا نقاد مجھے یقین ہے کہ اسلامی شعریات کی حقیقت کو پوری طرح واضح کر سکے گا۔'' ۲۰

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اقبال کے کلام کا جائزہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کے آئینہ میں پیش کیا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے ملت کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی جو کوشش کی تھی، اسی کو موضوع بنا کر انہوں نے اقبال کی ملی وقومی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے اقبال کی مختلف نظموں کے حوالے سے مشرق بیداری اور اسلامی ادب کی جو ترجمانی ہوتی ہے، اس کے نقوش کو اقبال کے فکر وفن کے آئینے میں واضح کیا ہے نیز اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے نوجوانوں کے لئے جو ولولہ انگیز پیغام دیا ہے، اس سے عوام میں پیدا ہوئی بیداری کی لہر کو ڈاکٹر سید عبدالباری اسلامی نشاۃ ثانیہ کا نام دیا ہے۔ ان کے مطابق اقبال کی شاعری نے ہماری تہذیب اور قوم کے کھوئے ہوئے وقار کی بازیافت کی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری اسلامی نشاۃ

ثانیہ کے حوالے سے اقبال کی شاعری کی خوبیوں کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

> ''اقبال نے اپنے کلام سے اس قدر اپنی افسردہ ملت کو اچھے دن دنوں کی بشارتیں دیں اور ایک روشن و تابناک سحر کے جلوے اپنے اشعار میں دکھائے ہیں کہ اسلامی نشاۃ ثانیہ خواب سے حقیقت کی منزل میں آ گئی۔''۲۱

اقبال کی شاعری پر مزید غور وخوص کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری نے لکھا ہے کہ انہوں نے اسلام کی نشاۃ نو کو اپنی شاعری کا بنیادی مقصد بنالیا تھا اور اس کے لئے انہوں نے مغرب ومشرق کے جتنے بھی گمراہ کن چیلنج تھے، سب کو قبول کرتے ہوئے اپنی شاعری کے ذریعے ان سب کا منھ توڑ جواب دیا۔ جس سے قوم وملت کے نوجوانوں کے اندر ایک بیداری کا جذبہ پیدا ہوا اور آج بھی اقبال کا کلام اس تاثیر سے محروم نہیں ہے۔ عہد جدید میں بھی ان کی شاعری نوجوانوں کے دلوں میں سوز وگداز بن کر انہیں متحرک کرنے کا کام کرتی ہے اور ملت کے مسلمانوں کو اسلام کی عظمت اور اس کی تاریخ کا احساس دلاتی رہتی ہے۔

اقبالؔ کے بعد ڈاکٹر سید عبدالباری نے مجروحؔ سلطان پوری کی غزلوں کا جائزہ ان کے فکر وفن کے حوالے سے پیش کیا ہے اور ان کے کلام کی اہم خصوصیات کو واضح کیا ہے۔ مجروح ترقی پسند تحریک سے وابستہ ایک ایسے شاعر تھے، جنہوں نے اپنی شاعری میں تغزل کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ حالانکہ فیض بھی اس عہد میں غزل میں موضوعات کو وسعت بخش رہے تھے، مگر مجروح کا رنگ اتنا منفرد تھا کہ وہ عوام کی دلوں کی دھڑکن بن چکے تھے اور ہر کوئی ان کے کلام سے محظوظ ہو رہا تھا۔ ان کے مترنم کلام کا اس وقت یہ عالم تھا کہ نوجوان گلی کوچوں میں اسے گنگنایا کرتے تھے۔ غرض ان کے کلام میں جو بانکپن، رعنائی اور حسن ادا دیکھنے کو ملتی ہے وہ بڑے بڑے ناقدوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ مجروح کی شاعری کی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''مجروح غزل کے سچے مزاج داں اور اس کے کلاسیکی آہنگ کے نبض شناس ہیں ۔ان کے کلام کا وہ حصہ جس کے بل پر وہ اردو غزل کی دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں خالص کلاسیکی تغزل کا دلکش نمونہ ہے اور مضامین میں بھی وہی ہیں جو خود ان کی شخصیت کا آہنگ بن کر غزل کے پیمانے میں ڈھلتا ہے اور اقبال کی طرح ان کے یہاں بھی خون جگر کی فراوانی ہوتی تو یقیناً وہ اپنی شناخت قائم کر چکے ہوتے لیکن اس دعوے کے

باوجود۔۔۔سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں۔ وہ اپنی ڈگر سب سے الگ نہ بنا سکے۔ پھر بھی وہ۔۔۔۔ جہاں ساغر پٹک دیتے ہیں چشمہ زمزم ابلتا ہے کے مصداق اپنی تقریباً سبھی غزلوں میں دوامی قدر و قیمت کے حامل اشعار کہہ چکے ہیں جو اردو ادب کو شاداب رکھیں گے۔''۲۲

مجروح سلطان پوری کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرنے کے بعد انہوں نے رشید احمد صدیقی کی مجروح شناسی ان کے خطوط کے آئینے میں پیش کیا ہے اور خود مجروح سے اپنے خط و کتابت کا ذکر بھی کیا ہے، جس سے ان سے مجروح کے ذاتی روابط کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

معین احسن جذبی کا شمار اردو غزل کی معتبر آوازوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان کی شاعری کا جائزہ، ان کے افکار و خیالات اور نظریات کے آئینے میں پیش کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ انفرادیت کو واضح کیا ہے۔ جذبی نے اپنے کلام میں کلاسیکی انداز کو اس وقت بھی برقرار رکھا، جب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر مجروح اور فیض بھی اس روش سے بھٹک چکے تھے۔ مگر وہ اپنی شاعری میں اسی رنگ و روپ اور خدوخال کے ذریعے اپنی ایک الگ شناخت قائم کئے ہوئے تھے۔ انقلاب کی بہت سی آندھیاں آئیں مگر جذبی کے فن کا رخ نہ موڑ سکیں۔ معین احسن جذبی نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شاعری ضرور کی مگر ان کی شاعری میں فکر و فن کا جو توازن دیکھنے کو ملتا ہے، وہ انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔ جذبی کے کلام کا جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر سید عبدالباری رقمطراز ہیں:

''اس عہد میں جذبی اردو غزل کی آبرو ہیں اور اس کی پیچیدگی و نازک صنف سخن کی ایک معتبر آواز۔ وہ ایک ایسے فن کار ہیں جس کا احترام ہم رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں اس لئے کرتے ہیں کہ انہوں نے زندگی کی پاکیزگی اور برگزیدگی کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اسے رسوا کرنے یا رسوا ہونے میں کوئی بڑائی نہیں دیکھی۔ اس معاملہ میں ان کا قد اپنے نامور ہم عصروں میں فیض و فراق سے بھی بلند محسوس ہوتا ہے۔''۲۳

ڈاکٹر سید عبدالباری کے مطابق شعر و ادب کا مقصد صرف لطف اندوزی اور سرور و انبساط نہیں ہے بلکہ اس میں زندگی کی سچائیوں اور حقیقتوں کی ترجمانی بھی ہونی چاہئے۔ انہوں نے اس ضمن میں تعمیری فکر و نظر رکھنے

والے صف اول کے شاعر حفیظ میرٹھی کے کلام میں عصر نو کے انسانوں کے درد وغم اوران کے مسائل کی جھلک کو واضح کرتے ہوئے ان کی شاعری کے فنی محاسن اوران کے افکار وخیالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اورانہیں انسانی دردمندی کا شاعر قرار دیا ہے۔حفیظ میرٹھی اپنی شاعری میں انسانی زندگیوں اوراس کی محرمیوں کو خاص موضوع بنا کر پیش کرتے ہیں، جس کے سبب ان کی شاعری میں انسانی زندگی اوراس کی پریشانیوں کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا جاسکتا ہے۔حفیظ کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

''حفیظ عصرِ حاضر کے انسان کے سچے مونس وغم گسار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ جب وہ عصرِ حاضر میں اقدار سے محروم بیخ وبن سے اکھڑا ہوئے اور بے سمتی کے شکار انسانوں پر نگاہ ڈالتے ہیں پھر سیاست، مذہب، تہذیب ومعاش کے میدانوں میں اس کا استحصال کرنے والے فریب کاروں کے ظلم وجور کا مشاہدہ کرتے ہیں۔اس مرحلہ میں آ کر ان کا تغزل تیر ونشتر بن کر دل میں اتر جاتا ہے۔الفاظ وعلائم کو وہ نئی معنویت عطا کرتے ہیں اور رمز وکنایہ کی بلاغت کو نیا رنگ وروغن عطا کرتے ہیں۔لب ولہجے کی یہ ندرت حفیظ کے فن کی نمو پذیری، زبان وبیان کے معاملے میں ان کی قدرت اور عصری تقاضوں سے واقفیت کی غماز ہے۔وہ بیک وقت گزشتہ نسل کے شاعر بھی ہیں اور جدید عہد کے سخن ور بھی، ان دونوں حیثیتوں کو وہ بہ خوبی برقرار رکھتے ہیں اور دونوں دنیاؤں میں اپنا امتیاز قائم رکھتے ہیں۔'' ۲۴

داؔغ دہلوی کی شخصیت اوران کے مزاج میں جو کھلنڈرہ پن اور زبان وبیان کی جو کشش تھی، اس کی روشنی میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان کی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔داغ دہلوی کی شاعری کا محور ومرکز عشق وعاشقی ہے۔داؔغ کی شاعری کلاسیکی روایت کو برقرار رکھتی ہوئی نظر آتی ہے اوراس میں فکر ونظر کی دنیا سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا ہے بلکہ زبان کی نوک پلک سنوارنے میں داغ دہلوی نے جو نمونہ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے، ابھی تک اس میں ان کا کوئی ثانی ثابت نہیں ہوسکا ہے۔داغ کی شاعری میں دلسوزی ونکتہ آموزی بھلے ہی نہ دیکھنے کو ملتی ہو مگر نئی تراکیب اور نئے انداز کی باتیں ایسی تھیں کہ ہرکس وناکس کو مسحور کرلیتی تھیں۔داؔغ کی شاعری کی فنی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

''داغ شعری محاسن کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں اور حق یہ ہے کہ انہوں نے رموز و علائم، تشبیہ استعارات، صنائع و بدائع اور محاورہ و روزمرہ کے اہتمام کا حق ادا کر دیا اور اردو زبان کے آئینے کو اس طرح صیقل کیا کہ اس میں انسانی جذبات و احساسات جیوں کے تیوں منعکس ہو سکیں اور نقل پر اصل کا گمان ہونے لگے۔''۲۵

حالانکہ داغؔ جس عہد میں شاعری کر رہے تھے، اس زمانے میں سرسید تحریک کے زیر اثر ادب میں کافی تبدیلیاں رونما ہو چکیں تھیں۔ ادب کو عقلیت کے میزان پر پرکھا جانے لگا اور اس کو اخلاقی و معاشرتی اور تہذیبی اقدار سے ہم آہنگ کیا گیا اور مغربی ادب سے استفادہ کے نتیجہ میں اردو ادب کا دامن نئی فکر اور نئے نئے موضوعات سے کافی وسیع تر ہو چکا تھا، جس سے اردو ادب پہلی بار عشق و عاشقی اور گل و بلبل کے خارجی مضامین سے نکل کر ایک وسیع دنیا سے روشناس ہوا، جس کے سبب اس کے دامن میں موضوعاتی اعتبار سے کافی وسعت پیدا ہوئی اور اس کے وقار میں بھی اضافہ ہوا، مگر اس زمانے میں بھی داغ دہلوی ان تبدیلیوں سے بے نیاز اپنے مخصوص انداز بیان، لب و لہجے کے ساتھ اپنی زبان کا جادو چلاتے رہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے لکھا ہے کہ بیسوی صدی میں سبھی نقادوں نے ان کی زبان دانی کا اعتراف تو کیا ہے، مگر ان کی شاعری میں فکر کی عدم موجودگی کے سبب ان کو صف اول کے شعرا میں کوئی خاص مقام نہ مل سکا۔

تعمیری ادب کے اہم ستون اور اس کے ترجمان ڈاکٹر ابن فرید کی افسانہ نگاری کا جائزہ ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان کے افسانوی مجموعہ ''یہ جہاں اور ہے'' کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ تعمیری ادب کے نظریات کی روشنی میں ان کے افسانوں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری نے لکھا ہے کہ ابن فرید نے افسانوں کو نئی وسعت، نئی رونق اور نئی دلکشی عطا کی۔ ابن فرید کے بعد انہوں نے پرفیسر مشیر الحق کی شخصیت کا جائزہ بحیثیت افسانہ نگار لیا ہے، جس میں انہوں نے ان کے افسانے ''بڑے گھر کی بٹیا'' اور ''نئی نظیر'' کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ پروفیسر مشیر الحق کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ان کے افسانوں میں اسلامی ادب کے بنیادی تصورات کی جھلک نمایاں تھی۔ یعنی معاشرہ کی دکھتی ہوئی رگوں پر اس طرح انگلیاں رکھنا کہ وہ اپنے امراض سے شفایاب ہو سکے اور اپنی اذیتوں سے چھٹکارہ پا سکے۔''۲۶

پروفیسر مشیر الحق بہت دنوں تک اپنا افسانوی سفر جاری نہ رکھ سکے اور بہت جلدی وہ تحقیق وتنقید کی طرف متوجہ ہو گئے اور اسلامی ادب کے ترجمان کی حیثیت سے تا عمر ادب کی آبیاری کرتے رہے۔مگر اپنے چند افسانوں کے ذریعے ادب میں اسلامی رجحانات کی جھلک چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے سلطان پور کے ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر نیؔر سلطان پوری سے بھی ہمیں متعارف کرایا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان کی شاعری کا جائزہ فکر وفن کے حوالے سے لیتے ہوئے نیر سلطانپوری کو ایک روشن ضمیر اور ہنر مند فنکار قرار دیا ہے۔

اسلامی ادب کے نظریات سے تعلق رکھنے والے ایک بہت ہی باشعور اور کہنہ مشق، قادرالکلام، روشن ضمیر اور صاحب نظر فنکار فاروق بانسپاری کی شاعری کا جائزہ بھی انہوں نے ان کی مختلف نظموں اور غزلوں کے حوالے سے پیش کیا ہے۔جس میں انہوں نے ان کی نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے فاروق بانسپاری کو زندگی کا پیامبر اور عصر نو کا نبض شناس شاعر قرار دیا ہے۔فاروق بانسپاری نے مغربی تہذیب اور جدیدیت کے اس دور میں بھی مشرقی روایت کو اپنی شاعری میں برقرار رکھا اور حالی اور اقبال نے شاعری کے لئے جو راہ ہموار کی تھی، اسی شاہراہ پر چلتے ہوئے اپنی شاعری کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔فاروق بانسپاری نے اپنے عہد کے آرزوؤں ،تمدنی وتہذیبی محرکات، معاشرتی المناکیوں اور سیاسی اضطراب کو اپنی شاعری کا خاص موضوع بنایا ہے۔ان کی شاعری میں یہ سبھی موضوعات فکر وفن کے حسین پیکر میں ڈھل کر دلکشی و رعنائی اور گہرائی و گیرائی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔فاروق بانسپاری کی شاعری میں سبھی موضوعات باعث مسرت ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی زندگیوں کو بصیرت بھی عطا کرتے ہیں۔ان کی زبان کافی نکھری ہوئی، آسان، سلیس اور رواں ہے،جس میں علم وحکمت کے بے شمار خزانے موجود ہیں۔ان کی شاعری ،فکر وفن اور زبان پر علامہ اقبال کے جو اثرات نمایاں ہوئے ہیں وہ ان کے کسی اور معاصر شعرا کے یہاں نہیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔فاروق بانسپاری کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری رقمطراز ہیں:

> ’’حضرت فاروق بانسپاری کی قادرالکلامی اور اپنے عہد کی جملہ شعری اصناف پر ان کی بے پناہ قدرت اظہار ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ہماری شعری روایات اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ ان کے پردہ سخن پر پرتوفگن ہے۔دلکش محاروں اور دلفریب

روزمرہ سے ہم مسحور ہو جاتے ہیں۔اقبال کی طرح وہ بھی فکر انگیز تلمیحات ،ذہن کو منور کرنے والے استعارے اور شعلہ لپک رکھنے والی تشبیہوں کے لعل و جواہر بکھرتے جاتے ہیں۔'' ۲۷

فاروق بانسپاری کی غزلوں میں ان کا تغزل کافی نکھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ان کا نکھرا ہوا اسلوب اور زبان کی نفاست انہیں حسرت اور اصغر کے بالمقابل کھڑا کر دیتی ہے۔غرض فاروق بانسپاری اپنے عہد میں ایک ممتاز فنکار کی حیثیت کے حامل ہیں، خاص طور سے اسلامی فکر و نظر کی تبلیغ و اشاعت میں ان کا ایک الگ مقام و مرتبہ ہے،جس کو نظر انداز کرنا ان کے فن کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

بعض ناقدین کا خیال ہے جگر مرادآبادی کی شاعری حسن و عشق کی کیفیت اور سوز و گداز کا حسین مرقع ہے ۔اس میں فکر و فلسفے کا فقدان ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری اس مجموعے کے آخری مضمون میں جگر مرادآبادی کے کلام میں عصری شعور کی نشاندہی کرتے ہوئے انہیں بیسوی صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں تمام معاصرین شعرا میں سب سے زیادہ عصری شعور اور عصری آگہی کا ترجمان شاعر قرار دیتے ہیں۔بیسوی صدی میں جب اردو غزل کا دامن کافی وسیع ہو چکا تھا،اس وقت جگر نے حسرت، اقبال، فانی اور اصغر کا تتبع کرتے ہوئے غزل کو اپنے مخصوص فکر و انداز سے پیش کیا تو لوگ غزل کی لچک،توانائی، حسن و جمال، دلکشی اور رعنائی کے ایک بار پھر قائل ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو غزل کئی ٹھوکروں اور لغزشوں سے گزر رہی تھی،مگر اسی عہد میں جگر نے غزل کو ایک نیا آہنگ دے کر اسے ایک بار پھر سنبھلنے کا موقع فراہم کیا۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے تمام ناقدین فن کو نشانہ بناتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے جگر کی شاعری کے متعلق جو تاثرات پیش کئے ہیں وہ نہایت ناقص اور ناقابل اعتبار ہیں۔اس ضمن میں وہ کلیم الدین احمد اور مجنوں گورکھپوری سے بھی اختلاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''مجھے حیرت ہوتی ہے کیوں کر پروفیسر کلیم الدین احمد اور مجنوں گورکھپوری جیسے بالغ نظر نقاد جگر کے بارے میں یہ سطحی بات لکھ گئے کہ جگر کا میدان شاعری میں تنگ ہے اور ان کی شاعری میں اعصابی ہیجان تو ہے لیکن غور و فکر نہیں یا یہ کہ وہ چند سطحی تاثرات اور ظاہری خصوصیات سے ہم کو مبہوت کر لیتے ہیں اور گہرائیوں میں جانے سے باز رکھتے ہیں۔'' ۲۸

ڈاکٹر سید عبدالباری نے جگر کی شاعری سے متعلق بہت سے پرانے اور فرسودہ نظریات کی نفی کرتے ہوئے ان کی شاعری میں عصری شعور کو ان کے اشعار کے ذریعے واضح کر کے اپنی بات کو مدلل بنانے کی سعی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ فکر کے لحاظ سے وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ان کے کلام میں عصری شعور اور اپنے آس پاس کے حالات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے،جس کے سبب جگر کے تغزل کی ایک منفرد شناخت قائم ہوئی۔جگر کی شاعری پر اپنی رائے قائم کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''جگر اپنے نشاطیہ و رجائیہ لب ولہجہ اور اپنی نبض شناسی حیات وکائنات میں اصغر گونڈوی اور حسرت موہانی کے ہم رتبہ نظر آتے ہیں۔ان کے کلام میں ہمارے تمدن کی تمام نفاستیں جلوہ گر ہیں۔ان کے یہاں غزل کی صحت مند روایات ہی نہیں ہماری پوری تہذیب نغمہ خواں ونوا پیرا نظر آتی ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری تمدنی اور روحانی اقدار ان کے ساز غزل کے تار بن گئی ہیں جنہیں وہ حسبِ ضرورت چھیڑتے اور نوا پیرا ہوتے ہیں۔غزل اپنے تمام امکانات کے ساتھ ان کے یہاں جلوہ بار ہوتی ہے اور بیسوی صدی کے انسان کے درد کا مداوا بن جاتی ہے۔''۲۹

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے اس مضمون میں عصری معنویت پر گفتگو کرتے ہوئے جگر کی شعری خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔اس مجموعے میں شامل سبھی تنقیدی مضامین ڈاکٹر سید عبدالباری کی ذہانت و ذکاوت کے بہترین مظہر ہیں،جن میں ان کے تنقیدی شعور کی پختگی،تجزیہ وتحلیل کی صلاحیت اور دلکش انداز بیان،فلسفیانہ گفتگو،استقلالی انداز،یہ تمام چیزیں انہیں معاصر تنقید نگاروں میں ایک منفرد مقام و مرتبہ عطا کرتی ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے سبھی مضامین میں ادب اور تنقید کے امورِ اعلیٰ اور متوازن بحثیں کی ہیں اور عربی وفارسی مفکروں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی بات کو مدلل بنا کر پیش کیا ہے،جن سے ان کے تنقیدی شعور کی ارتقائی منزل کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے،انہوں نے کچھ ایسے مضامین بھی تحریر کئے ہیں،جن میں قرآن حکیم کی روشنی میں ایک نئے تنقیدی دبستان کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے اصول وضوابط کی وضاحت کرتے ہوئے ادب کو اسی منہاج پر پیش کرنے کی بھرپور وکالت کی ہے۔خاص طور سے مولانا حمیدالدین فراہی کے حوالے سے انہوں نے تعمیری ادب کی جو تعبیر پیش کی ہے،وہ مضمون انہیں اپنے ہم عصروں میں ایک پر مغز دانشور کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔

کاوشِ نظر

''کاوش نظر'' ڈاکٹر سید عبدالباری کا چوتھا تنقیدی مجموعہ ہے، جو ۲۰۰۱ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔اس مجموعے میں انہوں نے ادب کی تعبیر وتشریح کے سلسلے میں مروج نظریات وتصوارت کو سامنے رکھ کر متوازن اور ٹھوس نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔اس ضمن میں انہوں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلامی ادب کے نظریات وافکار کی ترجمانی کی ہے،جس میں انہوں نے حالی،شبلی اور اقبال کے فکر وخیال سے بھر پور استفادہ کیا ہے۔اس مجموعے کا پہلا مضمون ''ادب میں اظہارِ خیال کی آزادی'' ہے، جس میں انہوں نے اس بات پر غور کیا ہے کہ ادب میں اظہارِ خیال کی آزادی ہونی چاہئے یا نہیں۔ یہ وہ بحث ہے جو قدیم زمانے سے ادب کا موضوع بنی رہی ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس موضوع پر قرآن وحدیث کی روشنی میں بحث ومباحثہ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب میں لغو یا فحشی مضامین نہیں پیش کرنا چاہئے بلکہ ادیب یا شاعر کو اپنے فن کے ذریعے پاکیزہ ترین جذبات کا اظہار کرنا چاہئے ،جس سے معاشرے میں مثبت پیغام پہنچے اور ایک مہذب معاشرے کی تشکیل میں وہ معاون ثابت ہو سکے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے ادب میں اظہار خیال آزادی پر غور کرتے ہوئے ،ان ادیبوں اور فنکاروں کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے مذہب اور عقیدے کا مذاق اڑایا،ان کے خلاف احتجاج بلند ہوا اور ان کے فن پاروں پر پابندی عائد کی گئی۔ اس ضمن میں انہوں نے سجاد ظہیر،کیفی اعظمی، ن م راشد،تسلیمہ نسرین اور سلمان رشدی کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اسلامی عقائد کے خلاف اپنے دل کا بخار نکالا ہے۔ڈاکٹر عبدالباری نے قرآن کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے بدگوئی کے لئے اسلام نے آزادیٔ اظہار پر قدغن لگا دیا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے اس مضمون کا مقصد یہی ہے کہ ادب میں اظہار خیال کی آزادی وہیں سے ختم ہوتی ہے جہاں سے دوسروں کی ناک شروع ہوتی ہے۔غرض ڈاکٹر سید عبدالباری ادب میں اظہار خیال کی آزادی کے قائل تو نظر آتے ہیں مگر کچھ حدود اور شرائط کی پابندی کے ساتھ۔وہ لکھتے ہیں:

> ''آزادی اظہار کو توازن کی حدود میں مقید کرنے اور اس پر اقدار وعقائد کی بندشیں عائد کرنے اور اجتماعی زندگی کے تقاضوں کا اسے پابند بنانے کی حمایت کے

باوجود یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس کی آزادی کے سرچشموں کے اگر خشک ہونے کی نوبت آجائے تو انسان کی فکر و تخلیق کا سبزہ زار خشک ریگزار میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ایک آزاد انسان اپنی فکر کا آپ مالک ہوتا ہے اور اپنی آزادی اظہار پر کسی طرح کا قدغن برداشت نہیں کر سکتا ہے۔وہ میکانکی طرز عمل کے جبر و قہر میں مبتلا ہو جائے تو اس کا تخلیقی وفور ختم ہو جاتا ہے۔''۳۰

اس سے اندازہ ہوتا ہے ڈاکٹر سید عبدالباری ادب میں اظہار خیال کی آزادی کو ایک نپے تلے انداز میں اخلاقی وتہذیبی اقدار کی روشنی میں پیش کرنے کے قائل ہیں وہ لکھتے ہیں کہ انسان کے لئے یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے، جب وہ اس کائنات کے منشائے تخلیق اور اس کے سرچشمۂ تخلیق سے واقف ہوگا۔وہ اسلامی ادب کی روشنی میں لکھتے ہیں کہ اگر کسی انسان نے اپنے ہاتھ، پیر اور زبان سے کسی انسان کو تکلیف پہنچائی ہے تو حشر کے دن یہ سب اس کے خلاف گواہی دیں گے،اسی طرح اگر قلم کے ذریعے کسی کی آزادی یا کسی انسان یا مخصوص عقائد کے ماننے والے لوگوں کو کسی ادیب نے ٹھیس پہنچائی ہے تو یہ قلم بھی روزِ محشر اس کے خلاف گواہ بن جائے گا۔اس لئے ایک ادیب کا فرض ہے کہ وہ جو کچھ بھی تخلیق کرے یہ سوچ کر کرے کہ اسے خدا کے حضور میں جواب دینا ہوگا۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس موضوع پر کافی تفصیل سے گفتگو کی ہے اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچ کر لکھتے ہیں:

''حاصل کلام یہ ہے کہ ادب میں اظہار خیال کی آزادی اور ادیب کو اپنی انفرادیت باقی رکھنے کا حق ناگزیر ہے۔اور اسے اجتماعیت کے شکنجے میں کسنے کی کوئی تائید نہ کرے گا۔لیکن عدم رواداری، تعصب، کینہ اور بغض و خصومت کا اظہار کر کے اور صاف دلی اور اخلاص، کھرا پن اور بے لاگ رویہ کو ترک کر کے ادیب جب اس آزادی کا غلط طور پر استعمال کرتا ہے تو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ چند بلند اقدار کا اس کو پابند بنایا جائے۔''۳۱

ادب میں اظہار خیال کی پابندی عائد کرنے کے بعد وہ ادب میں توازن اور عدم توازن کے مسئلے پر غور کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ موجودہ صدی میں ادب میں عدم توازن ہے۔عدم توازن موجودہ عہد کے ہر انسان کی فکر وفن، قول و عمل ہر جگہ نمایاں ہے۔انسانی زندگی میں توازن کی یہ غیر موجودگی انسان کو بلندی اور برگزیدگی

سے محروم اور پستی اور زوال کی طرف گامزن کرنے میں اہم رول ادا کر رہی ہے۔ظاہر سی بات ہے انسانی معاشرے میں اگر عدم توازن ہوگا تو وہ فکر وفن میں تحلیل ہوکر ادب میں بھی جلوہ گر ہوگا۔ یہ ایک لاشعوری فعل ہے۔ادب میں عدم توازن کا دوسرا سبب وہ انسانی جبلت اور اس کی حیوانی خواہشات اور مادیت کو قرار دیتے ہیں، جس نے ادب میں بڑی افراتفری مچا رکھی ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری ان انتہا پسند نظریوں سے دامن بچاتے ہوئے لکھتے ہیں، خدا کی رہنمائی کے بغیر ادب میں توازن نہیں پیدا کیا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری ادب میں توازن پیدا کرنے کے لئے سماج اور معاشرے کی اہمیت پر بھی زور دیتے ہیں ان کے مطابق اگر کوئی ادیب اس سے الگ ہوکر کوئی فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو وہ عدم توازن کا شکار لازمی طور پر ہوگا، اس لئے فن کار کو چاہئے کہ وہ اپنے معاشرے سے اپنا رشتہ استوار کرے اور مغرب کے مادی، رہبانی، اور اجتماعیت کے اینٹی فلسفوں سے احتراز کرتے ہوئے انفرادیت کے خول سے نکل کر ادب تخلیق کرے۔

ادب میں اس وقت بھی عدم توازن پیدا ہوتا ہے، جب کسی شخصیت کے اظہار وانعکاس کے معاملے میں ذرا بھی لغزش ہوتی ہے۔ دوسری بات جذبات کے اظہار میں بھی اکثر ادیب عدم توازن کا شکار ہوتے ہیں۔وہ جذبات نگاری کرنے کے بجائے اس سے کھیلنے لگتے ہیں۔ادب میں عدم توازن کے اسباب اور عوامل پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری نے مارکس اور جدیدیت کے گمراکن اور انتہا پسندانہ نظریات اور فلسفوں کو زبردست ہدف تنقید بنایا ہے، ان کے خیلات وافکار سے اندازہ ہوتا ہے، ادب میں عدم توازن کی سب سے بڑی وجہ یہی جدیدیت ہے، جس نے پوری ادبی فضا کو مکدر کر رکھا ہے۔وہ ان سب امور پر غور وخوص کرنے کے بعد ادب میں توازن پیدا کرنے کے لئے اسلامی ادب ونظریات کی روشنی میں چند اہم نکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انسان کی شخصیت میں وزن وآہنگ فقط عقیدہ توحید سے پیدا ہوسکتا ہے۔اسے اپنے خالق سے جو زمین وآسمان اور تمام موجودات کا بھی خالق ہے انسان کی شخصیت میں اتھاہ گہرائی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی گہرائی سے پھوٹنے والی نوا سے متوازن ادب ایک آفاقی اور لازوال ادب کی تشکیل ہوتی ہے۔ادب میں توازن کے لئے لازمی ہے کہ نظریہ یا فکر اس پر کابوس بن کر نہ مسلط ہو اور فن کار تلقین، تبلیغ اور ترغیب کے بجائے اظہار وتشریح پر اکتفا کرے۔ادعائیت اور خطابت سے حتیٰ الامکان کنارہ کش رہے اور خود تنقیدی وخود کلامی کا انداز اختیار کرے۔''۳۲

اس طرح ڈاکٹر سید عبدالباری نے ادب میں توازن اور عدم توازن کے مسئلے پر بڑی فکر انگیز گفتگو کی ہے، جس کی روشنی میں ادیب و فنکار ایک بہترین اور متوازن ادب تخلیق کر سکتے ہیں۔ادب میں توازن اور عدم توازن کے بعد وہ ’’ادب کی تخلیق ایک انفرادی مشغلہ یا معاشرتی فریضہ ہے‘‘ کے مسئلے پر غور و فکر کرتے ہیں ۔اس موضوع پر بات کرتے ہوئے انہوں نے ادب سماج اور ادیب کے آپسی روابط پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب انسانی زندگی اور شخصیت کا سب سے دلکش مظہر ہے، جس میں انسانی زندگی کی ہر پہلو کی ترجمانی بڑے خوبصورت انداز میں ہوتی ہے۔غرض ادب کسی معاشرہ کا وسیلۂ اظہار ہوتا ہے اور کوئی فنکار معاشرے سے علاحدہ ہوکر ادب تخلیق نہیں کرسکتا ہے۔وہ ہر حال میں اپنے گرد و پیش سے اثرات قبول کر کے اسے ادب میں جذب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اگر کوئی فنکار معاشرے سے کٹ کر صرف دل بہلانے کے لئے ادب تخلیق کرتا ہے، ایسے ادب کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے اور ایسا ادب آفاقیت سے محروم ہو جاتا ہے اس میں عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے۔

غرض فرد اور معاشرے کے درمیان جو رشتے ہیں وہ کافی گہرے ہیں، جن کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔یہی وجہ ہے تخلیقی عمل اگر چہ ایک انفرادی عمل ہے، جسے کوئی فنکار تنہا انجام دیتا ہے، مگر فنکار اس عمل میں لاکھ کوششوں کے باجود اپنا دامن معاشرے سے بچا نہیں پاتا ہے، جس کے سبب اس کا یہ تخلیقی عمل ایک انفرادی مشغلہ نہ رہ کر اجتماعی کارنامہ بن جاتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنی بات کو مدلل بنانے کے لئے مشرق و مغرب اور یونان کے دانشوروں اور مفکروں کے نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے سر سید تحریک سے وابستہ حالی اور شبلی کے نظریات و خیال سے استفادہ کیا ہے اور مولانا مودودی سے اتفاق کرتے ہوئے قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ ثابت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ تخلیقی ادب انسان کا ایک ایسا اخلاقی و معاشرتی فریضہ ہے، جس میں حق و صداقت کی بات کی گئی ہو اور اس کے مطالعے سے زندگی کو خوشگوار بنایا جا سکے۔اس مضمون میں وہ متوازن اور ٹھوس نتائج اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’تخلیق ادب ایک انفرادی عمل ہوتے ہوئے ایک معاشرتی عمل بھی ہے۔اس لئے کہ ادیب اپنے گرد و پیش کی دنیا، اپنے معاشرہ اور اس میں بولی جانے والی زبان سے بے نیاز ہو کر قلم اٹھا ہی نہیں سکتا ہے اور قلم ہاتھ میں لیتے وقت اسے بہر حال خدا اور خلق خدا کے بارے میں اپنے رویہ کا تعین ناگزیر طور پر کرنا ہی پڑے گا۔اگر وہ خدا اور خلق خدا سے

بیزار ہے اور ادب کے معاشرتی رویہ کے بارے میں کچھ سننے کو تیار نہیں تو پھر وہ ایسے مبہم لایعنی اور ژولیدہ ادب کی تخلیق کرے گا جو لمحاتی ہوگا۔ اگر وہ شعر و ادب اور ترسیل و ابلاغ کی ماہیت اور اس کی سرشت سے آگاہ ہے اور انسان کو اس کائنات کے پس منظر میں سمجھنے اور اس کائنات میں بکھری ہوئی بے شمار علامات کی روشنی میں خدا اور خلق خدا کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کی شناخت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ ماضی کے عالی مرتبت اور لافانی اہل قلم کی طرح ایسے ادب کی تخلیق کرسکتا ہے جو خود اسے حقیقی مسرت سے ہمکنار کر سکے اور اس کے ابنائے جنس کو بھی مسرت عطا کر سکے۔'' ۳۳

ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان مباحث اور مختلف نظریات کی روشنی میں تعمیری ادب کے چند متوازن اصول وضوابط مرتب کرنے کے بعد انسانیت کے ارتقا میں اسلامی ادب کے کردار پر روشنی ڈالی ہے، اس مضمون میں انہوں نے ان امور پر گفتگو کی ہے، جس نے بیسوی صدی میں انسانیت اور اس کی عظمت کو تار تار کر دیا تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے مغربی تہذیب اور اس کے فلسفوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ عقلیت پرستی، سائنس کے غیر معمولی ارتقا اور تجربہ و مشاہدہ کے منہاج کی غیر معمولی مقبولیت اور اس کے نتیجہ میں جنم لینے والے الحاد و وجودیت کے فلسفوں نے انسانیت کو داغدار کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ اردو ادب میں مغرب سے درآمدان نظریات اور ذہنی وفکری انتشار کو حالی، شبلی، اقبال اور اکبر نے شدت کے ساتھ محسوس کیا اور انسان کو اس کا کھویا ہوا وقار واپس دلانے کے لئے بھرپور جدو جہد کی۔ اس کے بعد ۱۹۴۱ء میں اسلامی ادب کی تحریک کا آغاز ہوا، جس نے ادب میں کائنات جیسا حسن، تناسب اور توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک بار پھر ادب کے ذریعے انسانی رشتوں کو بحال کیا اور بڑی خود اعتمادی اور دردمندی کے ساتھ اپنی فکر و تخلیق میں خستہ حال انسانیت کے زخموں پر اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے ذریعے مرہم رکھنے کی حتیٰ الامکان کوششیں کیں۔ غرض اسلامی ادب کے قلمکاروں نے اپنی فکر وفن کے ذریعے انسانیت کے فروغ میں جو خدمات انجام دیں ہیں، اس سے بہت سے انسانی زخموں کے رستے ہوئے ناسوروں کو نجات دلانے میں انہیں کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اسلامی ادب کے بہت سے شعرا کے ایسے کلام کو پیش کیا ہے جس سے انسانیت کو فروغ ملتا ہے۔ اسلامی ادب پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اسلامی ادب ہمہ گیر تناسب و توازن کے ایک طاقتور رجحان کا نام ہے جو انسانیت کو بے اعتدالیوں اور عدم توازن سے چھٹکارا دلانا چاہتا ہے۔ اسلامی ادیب

چاہتے ہیں کہ آج کا بکھرا ہوا اور خستہ حال انسان اندر سے مضبوط ہو سکے۔اس کے لئے وہ اخلاقی اقدار کی بازیافت ضروری تصور کرتے ہیں۔اخلاقی بلندی کے بغیر محروم کی اپنے حق تک رسائی، مجبور کی آواز، ظلم واستحصال کے ازالہ، معاشی عدل اور سماجی مساوات کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔اسلامی ادب آرزومند ہے انسان کے تجربات واحساسات کو ایک وحدت عطا کی جائے۔''۳۴

غرض اسلامی ادب نے انسانیت کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے اور یہ بات سہی بھی ہے موجودہ عہد میں اسلامی ادب کے نظریات کی روشنی میں جتنی بھی تخلیقات وجود میں آرہی ہیں سب میں کہیں نہ کہیں ایسے مضامین ملتے ہیں، جس سے انسانی اقدار اور اس کی تہذیب وتمدن کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے۔جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے بالمقابل اگر اسلامی ادب کو دیکھا جائے تو یقیناً اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ادب آج بھی حالی شبلی اور اقبال کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان فکرانگیز مضامین کے بعد ہندوستان میں آزادی کے بعد اردو شاعری کا ایک جائزہ پیش کیا ہے، جس میں انہوں نے آزادی کے بعد ملک میں ہونے والے فسادات اور تقسیم ملک کے واقعات کی روشنی میں اردو شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔اس دور کے جو حالات تھے اس صورت حال کو اس عہد کے فنکاروں نے بڑے درد انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔یہی دردمندی اور رنج وملال کی نشاندہی ڈاکٹر سید عبدالباری کے اس مضمون کا اصل موضوع ہے۔اس ضمن میں آزادی کے بعد سے لے کر بابری مسجد کی شہادت تک کے تمام واقعات کے ردعمل میں جو شاعری وجود میں آئی اور اس میں حزن وملال اور غم وغصے کی جو کیفیت پائی جاتی ہے، ڈاکٹر سید عبدالباری نے اسی کو واضح کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی سوانح نگاری کا جائزہ محمد علی جوہر کی ذاتی ڈائری کے چند اوراق کے آئینے میں لیا ہے۔اس سوانح میں مولانا نے محمد علی جوہر کی زندگی کے تمام سیاسی وملی کارناموں کو قلم بند کیا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے لکھا ہے کہ اس تصنیف نے انگریزی ادب کے ممتاز سوانح نگار جیمس باسول کی ممتاز تصنیف ''دی لائف آف ڈاکٹر جانسن'' کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اس سوانح میں مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کے مرکزی پہلوان کی زندگی کے مشن اور ان کے

کارناموں کی روح کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری محمد علی کی ذاتی ڈائری کے چند اوراق کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں کہ مولانا نے اس میں سوانح نگاری کے تمام تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں اور مولانا کی یہ سوانح عمری اردو کی بہترین گنی چنی چند سوانح عمریوں میں شمار کی جائے گی۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے حکیم عبدالحئی کے تذکرہ ''گلِ رعنا'' کا بھی تفصیل سے جائزہ پیش کیا ہے اور لکھتے ہیں یہ ہمارے قدیم تذکروں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے، جس میں نہایت سلیقے سے اردو کے ۶۷ ممتاز شعراء، ولؔی سے لے کر اکبرالہ آبادی تک کے احوال بیان کئے گئے ہیں اور ان کے کلام کا بے حد خوبصورت اور موثر انتخاب پیش کیا گیا ہے۔اس مضمون میں مصنف نے ''گل رعنا'' کا تفصیلی اور جامع تنقیدی مطالعہ کیا ہے اور آب حیات سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے اس کی فنی خوبیوں کے ساتھ اس کی قدر و اہمیت کا تعین کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اسلامی ادب کے ترجمان کی حیثیت رکھنے والے صف اول کے شاعر ماہر القادری کی شاعری کا جائزہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کے آئینے میں پیش کیا ہے۔ماہر القادری نے اپنی شاعری میں تہذیبی تسلسل کو ہمیشہ برقرار رکھا اور شعر و ادب کے تعلق سے جدیدیت کے منفی اور گمراہ کن نظریات کے طلسم سے اس عہد کی نئی نسل کو آزاد کرانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ماہر القادری نے اپنی شاعری میں اقبال کی فکر و نظر سے تتبع کرتے ہوئے اسلامی ادب کی تحریک کو کافی تقویت عطا کی۔ماہر القادری کے آخری دور کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عبدالباری لکھتے ہیں:

> ''ماہر القادری نے آخری دور میں جو شاعری کی ہے وہ سراسر اسلامی فکر و نظر کے احیاء اور نظام اسلامی کی تشکیل پر مبنی موضوعات سے لبریز ہے۔ان کے کلام میں ایک روشن مستقبل کی بشارت اور حوصلہ مندانہ جذبات کی تنویر نظر آتی ہے۔اردو غزل کو اپنی فنی چابکدستی اور فکری بلندی کی بدولت انہوں نے اقبال کے بعد نئی بلندیوں سے ہم کنار کیا ہے۔''۳۵

ڈاکٹر سید عبدالباری نے عصری ادب میں مسلمانوں کی آرزوں کی جھلک پر ایک مبسوط مضمون قلم بند کیا

ہے۔جس میں انہوں نے تعمیری ادب سے وابستہ زیادہ تر شعرا کے کلام میں مسلمانوں کے دردوغم اوران کو بیدار کرنے والے اشعار کو پیش کر کے اپنے اس مضمون کو پر کشش بنایا ہے۔اپنے ایک دوسرے مضمون میں انہوں نے دعوتی اوراصلاحی ادب کی طرف قارئین کی توجہ مرکوز کی ہے۔اس مضمون میں انہوں نے مولانا مودودی اور اسلامی ادب کے نظریات وخیالات کو واضح کیا ہے،جس کا اصل مقصد لوگوں میں ملی بیداری اوران کی اصلاح کے ساتھ قرآن کے تصور اصلاح کو ادب کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنا تھا۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اسی نقطۂ نظر سے اردوادب کا جائزہ پیش کیا ہے۔یہ مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک نئی معنویت لئے ہوئے اورادب میں ایک نئے گوشے کی طرف تمام اہلِ فن اورناقدین کی توجہ مبذول کراتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کی تنقید نگاری کا یہی خاص وصف ہے انہوں نے نئے نئے گوشوں کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے جس سے ادب میں ایک نئی جہت کا در کھلتا ہوئی دکھائی دیتا ہے۔

سید سلیمان ندوی کی تنقید نگاری کا جائزہ ڈاکٹر سید عبدالباری نے تاثراتی،جمالیاتی اورسائنٹفک تنقید کے حوالے سے پیش کیا ہے۔سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد علامہ شبلی کی روایت کو اپنی تنقید میں برقرار رکھتے ہوئے اسی راہ پر چلنا مناسب سمجھا اورانہیں کے افکار ونظریات کی روشنی میں تنقید کی ایک نئی عمارت کھڑی کی۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان کی نظریاتی اورعملی تنقید کے نمونے پیش کر کے سید سلیمان ندوی کی تنقید نگاری اوران کے نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے۔خاص طور سے خیام کی رباعیات کے حوالے سے انہوں نے جو کچھ لکھا،اس کی روشنی میں ان کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اقبال کی شاعری کا جائزہ ان کی شخصیت کے آئینے میں پیش کیا ہے،جس میں ان کے ابتدائی حالات سے لے کر خاندانی پس منظر،تعلیم وتربیت اورغیر ملک جرمنی میں ان کے قیام کے بعد ہندوستان میں ان واپسی تک کے سبھی حالات کو مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے۔اس مضمون کا اصل مقصد اقبال کی شخصیت کے تابناک پہلوؤں سے آشنائی حاصل کرنا معلوم ہوتا ہے،جس سے ڈاکٹر سید عبدالباری خود بہت متاثر تھے۔یہی سبب ہے انہوں نے اقبال پر متعدد مضامین قلم بند کئے ہیں۔اقبال کے بعد انہوں نے فراق گورکھپوری کی شخصیت کا جائزہ ان کی شاعری کے آئینے میں پیش کیا ہے اوران کی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے اس کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔فراق کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فراق ادبیات فلسفہ، تاریخ اور دیگر عمرانی علوم کے وسیع مطالعہ کے باوجود اقبال وٹیگور کی طرح ایک عہد ساز شاعر نہ بن سکے مگر اس کائنات کے سربستہ رازوں اور موت و حیات کے کرشموں پر ایک فلسفی کی طرح غور کرتے ہیں۔ فراق اپنی غیر معمولی قوتِ مشاہدہ کے باوجود صحیح نتائج تک پہنچنے میں ناکام رہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے مزاج پر خودرائی اور ادعائیت (obstinacy) کا غلبہ ہے۔''

ان سب اعتراض کے باوجود ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے اس مضمون میں فراق کی عظمت کا اعتراف بھی ان کی شاعری کے حوالے سے کیا ہے۔ اس مجموعے کے آخر میں شامل سبھی مضامین وہی ہیں جن پر پچھلے صفحات میں گفتگو ہو چکی ہے۔ اسی طرح انہوں جگر کی شاعری کا بھی جائزہ ان کی شخصیت کے آئینے میں پیش کیا ہے۔ جس میں انہوں نے جگر کی شخصیت اور ان کے خد وخال کو واضح کرتے ہوئے ان کی شاعری کو سلاست، روانی اور خلوص کا بہترین امتزاج اور حق وصداقت اور خلوص کا آئینہ دار قرار دیا ہے، جس میں پاکیزہ اور حکیمانہ خیال کی فراوانی پائی جاتی ہے۔ وہ جگر کی شاعری اور ان کی بے پناہ مقبولیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جگر کی مقبولیت اس کے مرکزی نکتہ کے علاوہ دوسری خوبی سادگی وسلاست کی تھی جس نے انہیں عزیز روزگار بنایا اور جو بلاغت کی اساس ہے۔ حضورؐ کے بلیغ اقوال ،آپ کے اصحاب کے خطبات اور خود حضرت علی کے مشہور زمانہ خطبات کی جو ''نہج البلاغہ'' کے نام سے علم واب کا ایک یادگار سرمایہ ہیں مقبولیت کا یہی راز ہے کہ یہ سادگی اور پرکاری کا مرقع ہیں۔ تصنع وتکلف سے حضرت جگر کو وحشت تھی اور ثقیل و بھاری بھرکم ونامانوس الفاظ بھول کر بھی نہیں استعمال کرتے۔ سہل ممتنع کے ایسے دلکش نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں کہ ہم محو حیرت رہ جاتے ہیں''

مومن خاں مومن کا شمار اردو شاعری میں عشقیہ مضامین، معاملہ بندی اور مکر شاعرانہ کے حوالے سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے مومن کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی شاعری پر منفرد انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ اردو غزل کو مقبول صنف بنانے اور اسے ایک نیا رنگ وروپ دینے میں جن شعرا نے اپنا تعاون دیا ہے اس میں ایک نام مومن کا بھی ہے۔ مومن کی شاعرانہ خصوصیات کو واضح کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

''مومن کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی ان ناپسندیدہ فنی قلابازیوں سے محفوظ تھے جن میں ان کے معاصر گرفتار تھے یعنی غیر ضروری باتوں کو تخیل کی مدد سے پہاڑ بنانا اور ایسے مبالغے کا سہارا لینا جہاں عام آدمی کا ذہن نہ پہنچ سکے۔ دہلی میں اس زمانے میں ایہام، رعایت لفظی اور استعارہ در استعارہ کا کمال دکھانا اچھے فنکار کی پہچان تھا۔ مگر مومن کی بلندی خیال ان تمام راہوں سے ہٹ کر منفرد و ممتاز ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بات کو پیچ دار انداز سے کہنے کے وہ شائق ہیں اور مضمون کی کڑیاں بیچ سے اس طرح غائب کر دیتے ہیں کہ سننے والے کو انہیں تلاش کرنے میں لطف آتا ہے۔ لیکن انہیں وہ آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔''۳۸

پطرس بخاری کی شناخت اردو ادب کی دنیا میں طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے حوالے سے ہے، انہوں نے چند مزاحیہ مضامین کے ذریعے اردو ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ پطرس کی خصوصیت یہ ہے انہوں نے اپنے گرد و پیش کی زندگی سے کچھ ایسے کمزور پہلوؤں کا انتخاب کیا ہے، جو ہمیں ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ ان تمام واقعات کو اپنی ذہانت اور ذکاوت سے اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری کو لامحالہ ہنسی آ جاتی ہے۔ پطرس اپنے مضامین سے ہنسنے ہنسانے کا کام ضرور لیتے ہیں، مگر وہ قہقہوں کے قائل نہیں ہے بلکہ تبسم زیر لب کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے ان کا ہر مضمون دھیمی ظرافت کی بدولت ہزاروں ظریفانہ تحریروں کا حاصل ہے۔ پطرس بخاری کی مزاح نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان کا موازنہ رشید احمد صدیقی سے کیا ہے لکھتے ہیں:

''پطرس انہیں کی طرح قہقہوں کے بجائے خندۂ زیر لب کی مدد سے اپنے عہد کے تمدنی مسائل، سائنس کے کرشمے، صنعتی تمدن کے پیدا کردہ مسائل پر اپنے مخصوص پیرائے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ تراکیب اور جملوں کی برجستگی اور ندرت سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہماری معاشرتی زندگی کی وہ جب تصویر کشی کرتے ہیں تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوتا۔ وہ بے رحم طنز نگار کی طرح کسی کا چہرہ مسخ نہیں کرتے۔ کرداروں کو مکروہ سے مکروہ تر بنانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ فطرت و حقیقت سے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شگفتگی، لوچ اور دلربائی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ مخاطب کو حریف راز داں تصور کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اتنا کم لکھ کر وہ اردو ادب میں اس قدر

اہم مرتبہ ومقام کے حامل ہیں۔''۳۹

پطرس بخاری نے انگریزی انشائیہ نگاری کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا یہی وجہ ہے ان کے انشائیوں میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہوئے ہیں اور انہوں نے اسی طرز پر انشائیہ نگاری کے تمام فنی لوازمات کے ساتھ ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین تحریر کئے، جس سے ان کی تحریروں میں توازن وتناسب کے عنصر غالب ہو گئے ہیں۔ غرض وہ اردو ادب کی تاریخ میں اپنے مختصر مزاحیہ مضامین کی بنیاد پر زندۂ وجاوید رہیں گے۔

عزیز بگھروی کا شمار اسلامی ادب کے علمبرداروں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنی شاعری میں فکروفن کے ذریعے ایک منفرد مقام ومرتبہ حاصل کیا۔ ان کی کوششوں اور کاوشوں نے اسلامی ادب کے دامن میں موضوعاتی اور فنی اعتبار سے کافی وسعت پیدا کی، جس سے اس کے وقار وعظمت میں بھی اضافہ ہوا۔ عزیز بگھروی نے اپنی شاعری میں اسلامی ادب کے نظریات کو محور ومرکز بنا کر اس کی بھرپور ترجمانی کی اور یہی نظریات وافکار ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز بھی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے عزیز بگھروی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ان کے مجموعہ کلام ''حرمت فن'' کی روشنی میں کیا ہے اور آخر میں لکھتے ہیں:

> ''اسلامی شعر وادب کے حلقوں میں پورے برصغیر کے ہمارے موجودہ فنکاروں میں حضرت نعیم صدیقی، حصرت حفیظ میرٹھی اور ابوالمجاہد زاہد کے ساتھ حضرت عزیز بگھروی کا نام احترام سے لیا جاتا ہے اور ان کی بے کراں ادبی وتخلیقی خدمات کو جو اس صدی کے نصف آخر میں مغرب کے بالمقابل مشرق میں اسلامی اقدار اور عقائد پر موجودہ نسلوں کا اعتماد بحال کرانے کے لئے انہوں نے انجام دیں یقیناً ہماری ادبی وتہذیبی تاریخ میں فراموش نہ کیا جائے گا۔''۴۰

عہد حاضر میں اجمل سلطان پوری نے مشاعروں میں گیتوں، نظموں، غزلوں اور اپنے منفرد ترنم کے ذریعے ایک الگ شناخت قائم کی۔ ان کے گیتوں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت پوری طرح رچی بسی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی نظم '' تاج محل'' اور'' ہندوستان تجھے میں ڈھونڈ ھ رہا ہوں'' ایسی ہیں، جس میں ہندوستان کی قدیم تہذیب اور روایت کی پوری عکاسی ہوئی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگ مشاعروں میں ان کی یہ نظمیں سننے کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ اجمل سلطان پوری نے گیتوں کے ساتھ ساتھ غزلوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے، مگر

ان کی شہرت کا دارومدار ان کے گیت ہی ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان کی غزلوں کی طرف خاص توجہ مرکوز کی اور ان کے کلام میں تغزل کے عناصر کو واضح کیا ہے۔ان کی غزلوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حضرت اجمل کو یوں تو گیتوں اور نظموں کے ذریعہ دادِ سخن دیتے ،نغمہ سنج ہوتے اور مملکتِ خوش کلامی میں سکہ چلاتے کس نے نہیں دیکھا ہے اور سنا ہے لیکن ان کی انفرادیت کے نقوش جادۂ غزل گوئی پر بھی نمایاں ہیں۔ان کے تغزل میں قدامت کی چاشنی اور جدیدیت کی حرارت دونوں جلوہ گر ہیں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ابہام، پیچیدگی، ثقالت اور الجھاؤ سے پاک ان کی نکھری چاندنی جیسی طرز ادا سہل ممتنع کا جادو جگاتی ہے اور از دل خیز و بردل ریزد کی کیفیت کی حامل ہے۔عام انسانی تجربات و مشاہدات کو وہ نہایت بے تکلفی و سادگی سے غزل کے پیمانے میں ڈھالتے ہیں مگر اس احتیاط سے کہ تغزل کے جملہ لوازم کا اہتمام برقرار رہے۔''[41]

ڈاکٹر سید عبدالباری کے اس تنقیدی مجموعے کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو تنقید کی راہ پر بڑی تیزی کے ساتھ گامزن ہیں اور ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے اپنے گزشتہ تین مجموعے کی بنسبت ''کاوش نظر'' میں ان کے فن میں پہلے سے زیادہ پختگی، گہرائی و گیرائی دکھائی دیتی ہے۔ان کی ذہانت اور ذکاوت اور نئے تنقیدی زاویے کے سبب اب ان کا شمار اردو کے چند اہم نقادوں اور مضمون نگاروں میں ہونے لگا۔تعمیر پسند حلقے میں پروفیسر عبدالمغنی اور ڈاکٹر ابن فرید کے بعد ڈاکٹر سید عبدالباری کا شمار چند اہم اور ممتاز ناقد وادیب کی حیثیت سے ہونے لگا۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے واقعی جو تنقیدی کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ انہیں ادب میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز کرنے کے لئے کافی ہیں۔

آداب شناخت

آداب شناخت ڈاکٹر سید عبدالباری کا پانچواں تنقیدی مجموعہ ہے، جو ۲۰۰۸ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ جب یہ مجموعہ منظر عام پر آیا، اس وقت ادب میں کافی تبدیلیاں رونما ہو چکیں تھیں۔ بے شمار تنقیدی نظریات منظر عام پر آ چکے تھے اور ادب کو جانچنے اور پرکھنے کا نیا نیا طریقہ کار اپنایا جانے لگا تھا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اکیسویں صدی میں ادب کی کیا جہت ہوگی اس پر گفتگو کی اور اپنی وسیع النظری اور وسیع القلبی کا ثبوت مہیا کیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد ان کی تنقیدی ذہانت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ انہوں نے بیسویں صدی میں اردو زبان وادب کی صورت کا جائزہ لینے کے بعد اکیسویں صدی میں ادب کے تقاضوں اور آثار وامکانات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ موجودہ عہد میں علم وخبر کی ترسیل واشاعت کی جونئی برق رفتار ٹیکنالوجی وجود میں آئی اس نے نہ صرف دنیا کا منظر نامہ بدل کر رکھ دیا ہے بلکہ اس کے زیر اثر ادب میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں ہیں۔ شوسل میڈیا اور ای میل کے ذریعے نہ صرف سیاسی وسماجی سرگیوں میں ہلچل پیدا ہوئی ہے بلکہ اس کے ذریعے اردو زبان وادب کے فروغ کے امکانات بھی روشن ہوئے ہیں۔

موجودہ عہد کی برقی ترقی کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری کا خیال ہے کہ جس طرح آج چند لمحوں میں ہمارے پیغامات کی ترسیل دنیا کے کسی گوشے میں ہو جاتی ہے اسی طرح اکیسویں صدی میں ہمارا ادب بھی کسی موضوع کو مختصر سے مختصر پیرائے میں کہنے کا محتاج نہیں ہوگا۔ اب دنیا کافی تبدیل ہو چکی ہے، اس لئے اس صدی کا ادیب تیز رفتاری کے ساتھ ادبی دنیا میں محو سفر ہوگا اور جس فن کار کا علم سطحی، معلومات طفلانہ ہوگی، جو کسی نظریے اور دلچسپی سے محروم ہوگا، اس کو دنیا نظر انداز کر دے گی۔ یہ صدی عمیق مطالعے اور مشاہدے کی صدی ہوگی اور ادیب یا شاعر کا مطالعہ بین العلومی سطح پر ہوگا۔ وہ صرف کسی ایک علم تک محدود ہو کر نہیں رہے گا بلکہ وہ دنیا بھر کے علوم کو بآسانی حاصل کر کے اپنے فن وفکر کو وسعت عطا کرے گا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری اکیسویں صدی میں ادب میں ہونے والی تبدیلیوں اور اس کے امکانات کی پیشین گوئی کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

’’جدید صدی میں شاید روح اور جسم کی دوئی برقرار نہ رہے۔ اسی طرح فارم اور

مواد کے درمیان گہرا ربط اور باہمی توازن کی ضرورت محسوس کی جائے گی۔کسی نے کیا اچھی بات کہی کہ آنے والے دور میں الفاظ ولغات وہئیت کے مختلف تجربوں کے ساتھ ادیب کو سماج کے ساتھ جینا پڑے گا۔وہ صرف کتابوں سے اطلاعات لے گا تو کامیاب نہ ہو سکے گا۔اسے تاریخ ساز نظریات اور اقدار کی دریافت نو کرنی ہوگی۔وہ محض احتجاج، ردعمل اور ایکشن تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اس دشت ظلمات سے نکل کر تعمیر،تخلیق ،ہم آہنگی اور وحدت فکر وعمل کی روشن شاہراہ پر قدم بڑھانا ہوگا۔شاعری پیغمبری کا جزو بنانے اور ادیب کو زندگی کی رہنمائی کے منصب پر فائز کرنے کا شاید جدید صدی میں زیادہ امکان ہوگا۔آفاق گیر نظریہ اور آفاق گیر فن کی ایک نئی صبح طلوع ہوگی اور ادب وشاعری کو کھیل تماشا بنانے والے مداریوں کا دور رخصت ہو جائے گا۔''۴۲

''اکیسویں صدی میں ادب کی جہت'' کا مطالعہ کرتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس صدی میں بھی ادب کو اسلامی ادب کے نظریات کی کسوٹی پیش کرنے کے خواہش مند ہیں اور لکھتے ہیں گزشتہ صدی میں فرد اور معاشرہ کا سارا نظام درہم برہم ہو چکا تھا ان منتشر حالات کا دکھ سبھی کو تھا۔وہ لکھتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں انسانوں کو متحد کرنے کے لئے سب سے بڑی طاقت توحید اور عقیدہ ہوگی ،اس کے بغیر معاشرے میں مساوات اور انسانیت کا احترام ممکن نہیں ہوسکتا۔انہیں یہ امید ہے کہ آنے والی صدی میں اسلامی ادب کے نظریات کی بنا پر انسانیت کو خوب فروغ حاصل ہوگا۔ان کا یہ نقطۂ نظر ان کے اس پورے مضمون میں کارفرما نظر آتا ہے جس کی جھلک مذکورہ بالا اقتباس میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

مرزا غالبؔ کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دور اندیش شاعر تھے۔یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری کا جب ہم آج کے عہد میں بھی مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا وہ اس صدی کے انسانوں سے جڑے ہوئے مسائل کو اپنی غزلوں میں پیش کر رہے ہیں۔ غالب کی یہی دور اندیشی اور کلام کی تازگی نے ان کے دیوان کو الہامی کتاب قرار دیا۔اس میں کوئی شک وشبہہ کی گنجائش بھی نہیں ہے کہ غالب کے دیوان کا جتنی بار بھی مطالعہ کیا جائے ،اس میں ایک نئی بات نکل کر سامنے آتی ہے اور ہر دور کے مسائل اور موضوع پر اشعار مل جاتے ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے ایک مضمون میں غالب کی اسی دور اندیشی کو موضوع گفتگو بنایا ہے اور غالب کی شاعری میں نئے دور کے عرفان کے امکانات کو واضح کیا ہے۔غالب کا عہد تہذیبی واخلاقی اور سیاسی زوال کا دور تھا۔ملک میں فساد برپا تھے۔غدر کی تباہیوں

اور بربادیوں سے ملک کی صورت حال ابتر سے ابتر ہو گئی تھی۔ غالب کو اپنے عہد کی زبوں حالی اور ذہنی وجذباتی انحطاط کا شدت سے احساس تھا، جس کی جھلک ان کی شاعری میں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

غالب کی اپنے عہد کے سیاسی وسماجی حالات پر گہری نظر تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ آنے والا عہد اس سے بھی زیادہ خوف ناک ہوگا۔ اس خونریز انقلاب کی آہٹ وہ اپنے اشعار کے ذریعے دیتے رہے۔ ہمیں ان حالات سے لڑنے اور قدم کو مضبوطی کے ساتھ جمائے رکھنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ غالب کے دیوان میں ایسے متعدد اشعار ہیں جو ہمیں آنے والے مشکل حالات سے نبرد آزما ہونے کی ہدایت دیتے ہیں اور بڑے سے بڑے پہاڑ کو توڑ کر آگے کا راستہ دکھاتے ہیں۔ غرض وہ آنے والے عہد کے تقاضوں کو سمجھ رہے تھے اور مستقبل میں ہندوستان کن کن مصائب سے گزرنے والا ہے، ان کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی شاعری میں آنے والے حالات ومسائل کی جو پیشین گوئیاں کی تھیں ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس مضمون میں ان کی نشاندہی غالب کے اشعار کے ذریعے کی ہے اور غالب کے ذہن کی تیزی اور ان کی شاعری میں جدت کے نقوش کو واضح کیا ہے۔ وہ غالب کی دوراندیشی اور سیاسی بصیرت کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''غالب یہ محسوس کر رہے تھے کہ آنے والے دور میں ان کے معاشرہ کو حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے مضبوط اخلاقی بنیادوں کی ضرورت ہے۔ حوادث کی تیز آندھی کے سامنے ڈٹنے کے لئے ایمان ویقین حرارت اور پختگی درکار تھی اور یہ ان مستحکم اقدار کے بغیر ممکن نہ تھی جو غالبؔ کی فکری وراثت کا ایک گرانقدر حصہ تھیں۔ آنے والے دور میں جن آزمائشوں سے غلام ہندوستان کو گزرنا پڑ سکتا تھا اسے غالب کی بصیرت محسوس کر رہی تھی۔ چنانچہ ان کے کلام میں جا بجا اخلاقی تعلیمات کے چراغ روشن ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان چراغوں کو روشن رکھنے کے لئے غالبؔ اپنا خون جگر بھی نچوڑنے پر آمادہ ہیں''۔۴۳

ڈاکٹر عبدالباری نے اردو ادب میں تحفظ حقوق انسانی کے موضوع پر ایک طویل محمون قلم بند کیا ہے، جس

میں انہوں نے اسلامی اور مغربی تہذیب کا موازنہ پیش کیا ہے اور دونوں تہذیبوں کے نظریات اور تصورات پر گفتگو کرتے ہوئے اسلامی تہذیب کو انسانی حقوق اور تحفظ کی اصل اساس قرار دیا ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ آج تک اسی بنیاد پر ادب تخلیق ہوتا رہا ہے۔انہوں نے مغربی تہذیب کی پیدا کردہ مادیت کو انسانی حقوق کے تحفظ میں سب سے بڑا روڑہ قرار دیا ہے۔جو تمام انسانی قدروں کو مادی مفادات کا غلام بنا دیتی ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان دونوں تہذیبوں کے آپسی تصادم پر گفتگو کرنے کے بعد اردو شاعری کا جائزہ،حقوق انسانی کے تحفظ کے حوالے سے اسلامی تہذیب کے آئینہ میں پیش کیا ہے اور ان اشعار کی نشاندہی کی ہے جن میں ظلم وستم کے خلاف بے باکی اور جرأت مندی کے ساتھ آواز اٹھائی گئی ہو،انسان کی عظمت کے گیت گائے ہوں اور جس میں حقوق انسانی کے لئے آواز بلند کی گئی ہو۔اس ضمن میں انہوں نے صوفیا کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ولی دکنی سے لے کر تمام عہد کے شعرا کے کلام کو پیش کیا ہے۔اس ضمن میں انہوں نے ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے علمبرداروں کے اشعار بھی درج کئے ہیں اور آخر میں لکھا ہے:

> ''بیسویں صدی میں کے آخری دور میں انسان کے وجود اور اس کی ذات کو بے حد اہمیت حاصل ہوگئی۔جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت نے آدمی کے احساسات اور دکھ درد کو مرکزی اہمیت دی۔اردو ادب میں فکر وتحقیق کا محور اسلامی اقدار حیات اور قرآن کے تصور انسان وکائنات کو بنانے والوں نے خاص طور پر ظلم وشقاوت کے شعلوں میں جھلستے انسانوں کو موضوع سخن بنایا۔اردو کے عوامی مشاعروں میں بھی ایسے ہی اشعار پر شعرا کو داد وتحسین حاصل ہوتی ہے جس میں درد انسان کی ترجمانی اور غم کائنات کی حرارت موجود ہوتی ہے۔اس کا مفصل جائزہ لیجئے تو ہمیں اپنی شاعری اور انسان کے گہرے قرب کا احساس ہوتا ہے۔۴۴

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس مجموعے میں مجروح وسلطانپوری کی شخصیت اور ان کے فکر وفن کا جائزہ ان کے آخری ایام کے خطوط کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ان خطوط سے ان کے ادبی نظریات وعقائد کی وضاحت ہوتی ہے۔کچھ لوگ ان کے تغزل اور اسلوب بیان کے جو تیکھے پن سے اندازہ لگا لیتے ہیں کہ یہ مارکسیت اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پیدا ہوا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس مضمون میں ان کے خطوط کی روشنی میں یہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مجروح کی شاعری ترقی پسند تحریک اور اس کے نظریات کی مرہون منت نہ تھی بلکہ انہوں نے فکر وعقیدہ کی روشنی میں اپنی شاعری کو پروان چڑھایا ہے،جو ان کو وراثت میں ملی تھی۔ڈاکٹر سید

عبدالباری نے ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی شاعری میں ایسے اشعار کی نشان دہی کی ہے جس سے مشرقی روایات و اقدار کی ترجمانی ہوتی ہے اور ان کی روشنی میں وہ انہیں ایک اسلامی شاعر قرار دیتے ہیں۔ مجروح کے نظریات پر ان کے خطوط کی روشنی میں گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

''مجروح کی سیاسی رمزیت طبقاتی کشمکش کے اشتراکی فارمولہ کے مرہون منت نہ تھی بلکہ وہ خود جس فکر وعقیدہ کے وارث تھے اس نے سماج میں ہر طرح کی تقسیم کے خلاف خواہ وہ رنگ ونسل، زبان وکلچر، علاقائی وجغرافیائی حدود وثغور کے سبب ہو، خواہ وہ غربت اور سرمایہ پرستی کے سبب وجود میں آئی ہو، پوری قوت کے ساتھ آواز بلند کی، جس کی بدولت انصاف وعدل، مساوات واخوت، انسانی وحدت اور ہر طرح کے امتیازات کے بالمقابل اخلاق اور انسان دوستی وتقویٰ کو سربلندی حاصل ہوئی۔ مجروح اس عقیدہ وفکر سے سرشار تھے۔''۴۵

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے اس مضمون میں مجروح سلطان پوری کی شاعری کے ایک نئے گوشے کو بھی اجاگر کیا ہے اور وہ ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری ہے۔ مجروح نے اپنے آخری ایام میں عبدالباری صاحب کو یہ مجموعہ ارسال کیا تھا۔ مجروح کا یہ مجموعہ ''تماشائی'' کے عنوان سے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسی ٹیوٹ ممبئی سے شائع ہوا ہے، جس کو ڈاکٹر آدم شیخ نے مرتب کیا ہے۔ مجروح نے یہ طنزیہ ومزاحیہ اشعار روز نامہ انقلاب کے لئے لکھے تھے، جو اس میں پابندی سے روزانہ شائع ہوتے تھے۔ اس مجموعے میں انہوں نے اپنا تخلص مجروح کے بجائے ''تماشائی'' رکھا ہے۔ اس کتابچہ کی بقول مجروح کوئی ادبی اہمیت نہیں ہے مگر احباب کی تفریح کا پورا سامان اس میں مہیا ہے۔ اس مجموعے میں شامل سبھی نظمیں اور قطعات ان کی ادبی اور تخلیقی زندگی کے ایک اور پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔ غرض ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس طویل مضمون میں مجروح کی فکر وفن کے حوالے سے ان کے امتیازات کا جائزہ ایک منفرد اور حیرت انگیز سیاق وسباق میں پیش کیا ہے جس سے مجروح کی شاعری کا ایک اور رخ ہمارے سامنے آتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے ''ادبیاتِ شبلی کی نئی صدی میں معنویت'' مضمون میں شبلی نعمانی کی ادبی، تاریخی اور ملی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے اور انہیں بیسویں صدی کا سب سے باشعور نقاد، سوانح نگار، تاریخ ساز، انشاپرداز، قادرالکلام شاعر اور نہ جانے جانے کون کون سے القاب وآداب سے نوازا ہے۔ یہ بات صحیح بھی ہے

کہ اس صدی میں شبلی سے باشعور اور ذہین نقاد شاید ہی کوئی اور رہا ہوگا، جس نے اپنے علم وفن کے ذریعے خود اعتمادی، صاف گوئی اور بلند ہمتی سے مغربی تہذیب کے اصول ونظریات کی مخالفت کی اور مشرقی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے ادب میں متوازن راہ ہموار کی اور اردو ادب کو غیر معمولی نقاد کی حیثیت سے فکر انگیز موڑ سے ہم کنار کیا۔شبلی کی کاوشوں اور ان کی ادبی خدمات کی روشنی میں ان کی معنویت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری نے لکھا ہے:

''گذرتی صدی کے دور آخر اور نئی صدی کے زمانہ اول میں مشرقی تہذیب وا قدار اور اردو زبان کے ثقافتی خدوخال کی شناخت کی اگر آپ کو جستجو ہے اور آپ کسی فرد واحد کے حوالے سے اسے سمجھنا اور پہچاننا چاہتے ہیں تو آیئے اس دور کے سب سے زیادہ باخبر، سب سے زیادہ ذہین،، سب سے زیادہ برق رفتار، ادراک، ذکی الحس اور سیماب پا صاحب قلم وصاحب نظر شبلی سے ملئے۔ یہ وہ سرچشمہ ہے جس سے علم وفکر کے متعدد سوتے پھوٹتے ہیں، یہ وہ انجمن ہے جس سے تحقیق وتنقید کے کتنے چراغ روشن ہیں، یہ وہ شمع ہے جو ربع صدی تک علم وادب کے بے شمار پروانوں کی وارفتگی شوق کا سبب رہی ہے۔'' ۴۶

غرض اس مضمون میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے شبلی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس مجموعے میں بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔جس میں انہوں نے آزادی کے بعد تقسیم ملک سے لے کر بابری مسجد کی شہادت تک کے سبھی سیاسی ومعاشرتی اسباب ومحرکات کی تفصیل پیش کرتے ہوئے اردو شاعری پر ان واقعات سے پڑنے والے اثرات کو واضح کیا ہے۔آزادی کے بعد اردو شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے ترقی پسند اور جدید شاعری کا بھی جائزہ پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس عہد میں فنکار خواہ وہ کسی بھی نظریے کا حامل رہا ہو، سب نے نئے معاشرے اور نئے انسان کے خط وخال مرتب کرنے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ نیز مثبت رجحانات اور قدروں کی بازیافت کا میلان سب کے یہاں نظر آتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس مضمون میں تعمیر پسند شعرا کو اس عہد کے سبھی شعرا پر فوقیت دی ہے اور ان کے اشعار پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری میں پیغمبرانہ صفت کو واضح کیا ہے۔بیسویں صدی کی اردو شاعری کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''آزادی کے بعد کے اردو کے شعری ادب پر ہم نگاہ ڈالیں تو اس میں عجب رنگا

رنگی ہے۔آزاد ہندوستان کا شاعر ہمیں خضر راہ بھی محسوس ہوتا ہے اور بھٹکا ہوا راہی بھی۔وہ زندگی کے تیز بہتے ہوئے دھارے میں خود کو بے دست و پا بھی محسوس کرتا ہے اور اس دھارے کو ایک رخ پر موڑنے کی کوشش میں بھی نظر آتا ہے۔اس عہد کے شعری ادب نے اگرچہ ذہنی انتشار میں بھی مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے ساتھ ایسے قلمکاروں کی بھی کمی نہیں جو ادیب کے اس بنیادی منصب اور ذمہ داری پر پورے اترتے نظر آتے ہیں کہ اسے ہمارے جذبات کو مہذب، ذہن کو شائستہ اور شخصیت کو کریم النفس بنانا چاہئے اور ہمیں دل کی کشادگی ،نظر کی وسعت ،تخیل کی جودت اور احساس کی شدت تو کرنی چاہئے۔اسے ہمیں کھلی ہوئی،، سلجھی ہوئی، نرم دل اور دردمند شخصیت کا حامل بنانا چاہئے۔اسے ہمیں جذباتی، توازن، دانشمندی، متانت اور شخصیت کا رچاؤ عطا کرنا چاہئے۔اردو شاعری میں اس صدی کی چھٹی اور اور ساتویں دہائی میں جو مردم بیزاری،خود بیزاری، بے یقینی اور بے اطمینانی کج روی، کج خلقی، بدوضعی اور قاعدے قانون توڑنے پر فخر کی کیفیت تھی وہ ختم ہو رہی ہے۔'' ۴۷

غرض بیسویں صدی کے آخر میں اردو شعرا کے مزاج اور ان کی شاعری میں کافی توازن وتناسب دیکھنے کو ملتا ہے۔وہ اپنے معاشرے اور آس پاس کے حالات سے گہری واقفیت رکھتا ہے اور اس کے درد وغم کو اپنی شاعری کا حصہ بھی بناتا ہے۔اس صدی کی شاعری میں انسانی قدروں کی پامالی کے خلاف شعرا نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے جرأت مندی کا ثبوت مہیا کیا ہے۔بیسویں صدی کی شاعری اور خاص طور سے تعمیری نظریات کے حامل شعرا کے کلام کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنے والے عہد میں اردو شاعری زیادہ سے زیادہ بامقصد اور انقلاب آفریں، ذہنی بالیدگی اور تہذیب النفس کا وسیلہ بن کر سامنے آئے گی۔

عرفان صدیقی ہمارے عہد کے ایک ایسے شاعر ہیں، جن کے یہاں جدید لب و لہجے کے ساتھ کلاسکیت اور ہماری تہذیبی اقدار کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔خصوصاً اس جدید عہد میں جب اردو شاعری کا پورا منظر نامہ تبدیل ہو چکا ہے، اس عہد میں بھی انہوں نے کلاسیکی رموز وعلائم کو اپنی شاعری میں اس طرح برتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے گویا اس عہد کی ترجمانی کے لئے ان کا یہ مخصوص لب ولہجہ مناسب ترین وسیلۂ اظہار ہو۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے عرفان صدیقی کی شخصیت، حیات وخدمات اور ان کی شاعری کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے ان کی شاعری میں فنی، فکری اور موضوعاتی خوبیوں کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''عرفان صدیقی بیسویں صدی کے آخری عشروں میں اردو غزل کے ان بیدار مغز فنکاروں میں تھے جنھوں نے غزل کو لطیفہ گوئی ،فقرہ بازی ، لایعنی لفاظی اور لچر پن سے محفوظ رکھا۔نظریہ کی توانائی سے شاعر کو محروم کرنے والوں کو بے اثر بنا دیا۔ان کے کلام سے ہماری موجودہ نسلوں کو لاسمتی وفکری خلا سے نجات ملی۔صحت مند وحیات بخش اقدار کی قدر ومنزلت بحال ہوئی۔ان جیسے ذہین وطباع فنکاروں نے غزل کی فنی لوازم کے ساتھ ایسی حکیمانہ باتیں کیں کہ ہمارے کلاسیکی فنکاروں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔''۴۸

غرض عرفان صدیقی ہمارے عہد کے ایک عظیم فنکار ہیں ،جن کی بلندی اور عظمت کا راز یہ تھا کہ انہوں نے کبھی بھی اپنی جڑوں سے علیحدگی نہیں اختیار کی۔ان کے کلام میں ولی، میر، غالب ،نظیر،مومن اور اقبال سبھی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم زندگی کی تمام حرارتوں کے ساتھ ماضی کی ادبی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔مگر ایسا نہیں ہے کہ ان کی شاعری عصری آگہی سے محروم ہوگئی ہے۔عرفان صدیقی کی شاعری میں ان کے عہد کی تمام سیاسی ومعاشرتی سچائیوں کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے،مگر ان جدید مسائل کو پیش کرنے میں بھی ان کا جو اسلوب ہے وہ کلاسیکی شاعری کے اسلوب سے زیادہ ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی اقبال شناسی اور ان کی شاعری پر ڈاکٹر سید عبدالباری نے ایک مضمون اس مجموعے میں قلم بند کیا ہے جس میں انہوں نے اقبال شناسی کے لئے ان کے کئے گئے کارناموں سے قارئین کو روبرو کرایا ہے اور ان کی شاعری کا جائزہ پیش کرتے ہوئے انہیں ایک تعمیر پسند شاعر قرار دیا ہے۔آزاد کے بعد انہوں نے سہیل احمد زیدی کی شخصیت اور ان کے فن کا جائزہ پیش کیا ہے۔سہیل احمد زیدی تعمیر پسند نظریات کے شاعر ہیں اور ان کا شمار فاروق بانسپاری، ابوالمجاہد زاہد، انور اعظمی، کوثر اعظمی، نعیم صدیقی اور حفیظ میرٹھی کی طرح صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے سہیل احمد زیدی کی شاعری کا جائزہ تعمیر پسند نظریات کے حوالے سے پیش کیا ہے اور ان کی شاعری کو یاس یگانہ چنگیزی اور شاد عارفی سے زیادہ معیاری قرار دیتے ہیں۔رشید احمد کوثری بھی تعمیر پسند نظریات کے شاعر ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ ان کے مجموعۂ کلام ''جدید و جاوداں کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے انہیں اردو غزل کی آبرو قرار دیا ہے۔وہ ''جدید جاوداں'' کی فنی خصوصیات کو واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''جدید جاوداں'' میں ہماری ملاقات الفاظ کے ایسے جادوگر سے ہوتی ہے جو ان

کی مدد سے عجب عجب کرشمے دکھاتا ہے۔الفاظ کی تراش خراش،ترتیب وتوازن وآہنگ کا اس قدر رسچا شعور اور ہنر مندانہ ادراک شاید ہمارے کلاسیکی ماہرین فن کے بعد اس عہد میں صرف رشید کوثر فاروقی کے یہاں یادگار کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔ان کے خزانے میں ہر رنگ ہر روپ کے الفاظ موجود ہیں بلکہ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں جن کے ذریعہ وہ عجب عجب شعبدوں اور کمالات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔''۴۹

ڈاکٹر سید عبدالباری کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے تعمیر پسند نظریات کے ترجمان اور ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے سخت مخالف ہونے کے باجود بعض ترقی پسند شعرا کے کلام کا جائزہ پیش کرتے ہوئے نہایت عالمانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، جس سے ان کی وسیع القلبی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے ترقی پسند تحریک کے اہم ستون کیفی اعظمی کی سیاسی ،انقلابی ،وقتی ،صحافتی ،نعرہ بازی اور گھن گرج والی شاعری کا جائز لیتے ہوئے کیفی کو ایک توانا اظہار کا شاعر قرار دیا ہے۔مگر اس جائزے میں بھی ان کا تعمیری نقطۂ نظر کارفرما رہا ہے، اس کی وضاحت ان کی اس بات سے ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں، کاش ایک صحت مند فلسفہ حیات اور تعمیری افکار کی دولت کیفی کو مل جاتی تو ان کی شاعری بلندیوں کو چھو لیتی۔کیفی کی شاعری پر اسی حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''کیفی اس میں شک نہیں کہ اردو کا غیر معمولی قوتِ اظہار وابلاغ کا حامل شاعر ہے جو آنے والی نسلوں کو خواہ کوئی حیات افروز پیام نہ دے سکا ہو اور خواہ جس نے اپنے فکری عدم توازن سے آنے والی نسلوں کے ذہنی انتشار میں اضافہ کیا ہو لیکن اس کی ۶۰ سالہ تخلیقی زندگی میں پرخلوص فنی کاوشوں کے ایسے نمونے ضرور موجود ہیں جن کی وجہ سے اسے یادرکھا جائے گا۔''۵۰

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سید عبدالباری جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں، ان کا تعمیری نظریہ ہر جگہ کارفرما ہوتا ہے اور وہ اسی نقطۂ نظر سے اردو ادب کے سبھی فنکاروں کا جائزہ پیش کرتے ہیں، خواہ اس کا تعلق ادب کے کسی بھی نظریہ سے رہا ہو۔اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنا نظریہ ہر فنکار پر تھوپنا چاہتے ہیں جو ان کو ایک شدت پسند ناقد کی صف میں لاکھڑا کرسکتا ہے۔مگر ان کی تنقید میں اس قدر توازن وتناسب رہتا ہے کہ ہم ان کی باتوں کے قائل ہونے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے تعمیری ادب کے اہم ستون مولانا طیب عثمانی کی شخصیت کے ساتھ ان کے نظریات وافکار کی روشنی میں ان کی عملی ونظریاتی تنقید کا جائزہ پیش کیا ہے،جس سے طیب عثمانی کی فکری بالیدگی اوران کے فن کی پختگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔طیب عثمانی کی تنقید نگاری سے نہ صرف مشرقی ادب اوراسلامی ادبیات پران کی گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ عالمی ادب پر بھی ان کے عمیق مطالعے اوراس پر ان کی پکڑ کا اندازہ ہوتا ہے۔غرض وہ بھی ڈاکٹر سید عبدالباری کے ہم خیال ہیں اوروہ بھی ترقی پسنداور جدید ذہن کے ابہام و تشکیک سے آلود ذہن، مادیت اور وجودیت سے آلودہ ادب پرایک حساس نقاد کی مانند اپنے کرب واحساس کا اظہار کرتے ہیں۔طیب عثمانی نے اسلامی ادبیات سے متعلق مختصر کارنامے انجام دیئے ہیں،مگران کے مثبت طرز انداز،ذہنی صلاحیتوں اوراسلامی ادب سے گہری وابستگی کے سبب ادب میں انہیں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔

ابوالمجاہدزاہد کا شمارتعمیر پسند شعرا کی صف میں اول مقام پر ہوتا ہے۔جنہوں نے اپنے مخصوص فکروفن کے ذریعے نام نہاد ترقی پسندوں کے بالقابل ادب کوزندگی سے صحیح معنوں میں قریب کیااوراسلامی نظریہ اوراس کی مقصدیت کے وقار کواپنی شاعری کے ذریعے بلند کیا۔بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انہوں نے حقیقی ترقی پسندی کا پرچم بلند کیا۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے ابوالمجاہدزاہد کے فکروفن کا جائزہ تعمیر پسند نظریات کے آئینے میں پیش کیا ہےاورانہیں اس عہد کا اقبال کے بعد سب سے زیادہ باشعور شاعر قرار دیا ہے۔ابوالمجاہدزاہد کی سچی ترقی پسندی کا اندازہ ان کی نظم ''مس انڈیا'' سے لگایا جا سکتا ہے،جس میں انہوں نے بے حیائی اور فحاشی کی جم کر مخالفت کی اورنظم کے آخر میں مس انڈیا کا اصل خطاب ان عورتوں کو دیتے ہیں جو کھیت میں دن بھر کڑی مشقت کرتی ہیں۔ابوالمجاہدزاہد کی نظر میں یہی غیرت مندخواتین اصل میں مس انڈیا کی اصل حقدار ہیں۔یہی مثبت فکر ان کی شاعری کا محورومرکز ہے جس میں حقیقی ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ روایت واقدار کی پاسداری بھی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری ان کی شاعری پراظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس نے (ابوالمجاہدزاہد) نظریہ کے نام پرادّعایت،فکری انارکی اور تضاد کی سوغات اپنے عہد کے کونہیں عطا کی بلکہ اپنی شاعری کے آئینے میں ایسی مربوط فکر کی جھلک دکھائی جوانسانی فطرت سے ہم آہنگ تھی۔ابوالمجاہدزاہد نے پروپیگنڈا کے جوش سے لبریز اورفن کے تقاضوں سے بے خبر مگر ترقی وراست اندازی کے نام ادب کورمزیت،ایمائیت

اور اشاریت کے حسن سے محروم کرنے والے فنکاروں نے بالمقابل شعر و ادب کا رشتہ جذبہ و احساس کی دنیا سے بحال کرایا اور وہ جذبہ و احساس جو ایک پختہ یقین و عقیدہ سے وجود میں آتا اور جسے علامہ اقبال نے فنکار کے لئے خون جگر سے موسوم کیا ہے۔۵۱

میر انیس کا نام آتے ہی اردو شاعری میں مرثیہ نگاری کا تصور ہمارے ذہن میں فوراً ا بھرنے لگتا ہے۔میر انیس نے مرثیہ نگاری کے فن کو بام عروج پر پہنچا دیا اور اسے اپنے عہد اور ماحول کی زندگی کا سچا ترجمان بنا دیا۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے میر انیس کی مرثیہ نگاری کا جائزہ ان کے عہد کے تناظر میں پیش کیا ہے۔اس وقت لکھنؤ کا جو ثقافتی و معاشرتی پس منظر تھا اس عہد میں میر انیس کی مرثیہ نگاری کے امتیازات کو انھوں نے واضح کیا ہے اور ان کی مرثیہ نگاری میں لکھنوی تہذیب کے جو عناصر رونما ہوئے ہیں، اس کی نشادہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’میر انیس کی اسے کمزوری کہئے یا ہنر مندی یا اپنے ماحول سے غیر معمولی وفاداری کی کسی بھی موقع پر لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرہ کو آنکھوں سے اوجھل نہیں نہیں ہونے دیتے ہیں خواہ اس سے ان کے بلند مرتبہ کردار پر کتنا ہی حرف آئے۔‘‘۵۲

میر انیس کو ان کے ماحول کے تناظر میں پیش کرتے ہوئے انھوں نے مرثیوں کے بعض بند پیش کر کے ان کے مراثی میں لکھنوی تہذیب و ثقافت کے نقوش کو واضح کیا ہے۔حالانکہ مرثیہ میں جن واقعات کو بیان کیا جاتا ہے اور اس میں جس ماحول کی ترجمانی ہوتی ہے وہ عربی تہذیب اور معاشرہ ہے، مگر مرثیہ نگار جس ماحول یا معاشرہ کا پروردہ ہوتا ہے اس کا عکس اس کے فن میں آنا ناگزیر ہے۔یہی وجہ ہے کہ میر انیس کے لاکھ دامن بچانے کے بعد بھی ان کے مرثیوں میں نہ صرف لکھنوی بلکہ پورے ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کی بہترین عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔

علقمہ شبلی اردو ادب کی دنیا میں بھلے ہی نیا نام ہو، مگر اس نے اپنے فن اور قادرالکلامی کے ذریعے تمام ناقدوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرانے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔علقمہ شبلی کی شاعری کا خاص وصف ان کی فنکارانہ عظمت اور احساسات و مشاہدات اور مثبت فکر ہے، جس کے سبب ان کی شاعری میں توازن اور

صداقت کے اوصاف نمایاں ہوئے ہیں۔ وہ اپنے حالات اور گرد و پیش کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر آزاد معریٰ اور نثری نظم کے پیرائے میں معاشرے کے احساس و جذبے کی تصویر کشی کی ہے۔ ان کی نظموں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ اختصار سے کام لیتے ہوئے تمام موضوعات کو چند سطروں میں پیش کر دیتے ہیں، جس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کوزے میں دریا سمو دیا ہو۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے علقمہ شبلی کے فن اور فکر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور ان کی نظم نگاری کے ذریعے انہیں ادب میں اعلیٰ مقام دلانے کی کوشش کی ہے۔ علقمہ شبلی کے فکر و فن کی تمام خصوصیت کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری نے لکھا ہے کہ ان کی شاعری کو دیگر زبانوں کی شاعری کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری سے متعلق وہ مزید لکھتے ہیں:

''کلکتہ کے اس پختہ مشق، صاحب فکر و نظر حساس اور آداب سخنوری سے واقف شاعر نے اپنے تخلیقی کارناموں سے ہندوستان کی دیگر زبانوں کی ادبیات کے بالمقابل اپنی زبان و ادب کو سر بلند، وقیع اور حیات بخش بنا کر ہمیں اپنا سر فخر سے اونچا کرنے کا موقع عنایت کیا ہے۔ اس نے اکبر، حالی، شبلی، اور اقبال کی روایات سخن اور اقدار کے ورثہ کی محافظت ہی نہیں کی ہے بلکہ اسے عہد کے ہوشربا مسائل اور ہر لمحہ منقلب احوال کے درمیان زیادہ معنی خیز و فکر انگیز بنا دیا ہے۔''۵۳

علقمہ شبلی کی کائنات فکر و فن کا تفصیل سے جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر سید عبدالباری نے حفیظ میرٹھی کی شاعری کو ایک بار پھر نئے زاویہ سے اپنی عملی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ واضح ہو اس سے پہلے بھی انہوں نے ان کے فکر و فن کا جائزہ عصر شعور کے پس منظر میں پیش کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے یہ مضمون ان کے انتقال کے بعد تعزیت کے طور پر لکھا، جس میں انہوں نے ان کی شخصیت کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کی ہے۔ اس کے بعد ان کی شاعری کا فنی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور ادب میں ان کے مقام و مرتبے کا تعین کیا ہے اور لکھا ہے کہ حفیظ ایک پیامی شاعر تھے جنہوں نے شاعری کو پیغمبری کی بلندیوں سے ہم کنار کیا وہ مزید لکھتے ہیں:

''حفیظ کو بیسویں صدی کے نصف ثانی میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے ایک ایسے ادبی کارواں کی رہنمائی کی جس نے اردو ادب کی کایا پلٹ دی اور اسے لایعنیت کی دھند سے نجات دلا کر ایک بلند و برگزیدہ مقصدیت کی شاہراہ پر گامزن کیا۔ پوری نصف

صدی تک ایک ہی ادا، ایک ہی انداز، ایک ہی ڈھنگ سے عوام کے اس سچے نمائندے خلق خدا کے محبوب اور عام انسانوں جیسی سادہ زندگی گزارنے والے عظیم فن کار نے جس کے فکر ونظر میں پیمبرانہ وسعت نظر موجود تھی، اب دنیا سے کوچ کر گیا۔ یقیناً دنیائے ادب اس عظیم محسن کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔'' ۵۴

ڈاکٹر سید عبدالباری نے سلطان پور کے ایک ایسے شاعر کو دریافت کر کے ہمارے سامنے پیش کیا ہے، جو ادبی دنیا میں گمنام تھا، مگر اس کی شاعری میں ایک ایسا اسلوب، آہنگ اور انداز بیان ہے جو ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کشش رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے اشہر سلطان پوری کو پہلی بار ادب میں اپنے اس مضمون کے ذریعے متعارف کرایا اور ان کی شخصیت کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ انہیں گنجینۂ شعر وسخن کا گوہر شب چراغ قرار دیا۔ اشہر سلطان پوری کا نظریہ ہے کہ ایسا انسان جو دنیا میں اپنی شناخت نہ قائم کر سکے حقیقت میں وہ انسان کہلانے کا حقدار نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان کے اس تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے اشہر سلطان پوری کا موازنہ میر سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں میرؔ کے بعد اتنی بلند انا رکھنے والا شاعر مشکل سے ہی ملے گا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری اشہر سلطان پوری کے اشعار پر اپنی تنقیدی بصیرت سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت اشہر نے مکمل غزلیں بہت کم کہیں۔ زیادہ تر متفرق اشعار پہ اکتفا کرتے رہے مگر یہ متفرق اشعار بھی ایک جہان معنی اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور پوری پوری غزل بلکہ دیوان پر بھاری ہیں۔ حضرت اشہر کو غزل کے رموز وعلائم پر پوری قدرت حاصل ہے۔ وہ کلاسیکی لب ولہجہ کے کامیاب ترجمان ہیں۔ وہ غزل کے ناز وانداز کے مزاج شناس ہیں۔ وہ اس تاج محل میں کسی رد وبدل کے قائل نہیں۔ ان کے اشعار پڑھئے تو محسوس ہوتا ہے کہ غزل کے وسیع وعریض چمنستان کا ایک دریچہ کھل گیا ہے۔'' ۵۵

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری نے اشہر سلطان پوری کا تعارف پیش کر کے اردو ادب کی تاریخ میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے اشہر سلطان پوری کے فن وفکر کا جائزہ لیتے ہوئے جن اشعار کو پیش کیا ہے اس سے واقعی ان کی قدر ومنزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ ان پر مزید تحقیق وتنقید کی ضرورت ہے تاکہ اردو ادب مجروح سلطان پوری کے بعد اس سرزمین کے ایک اور کج کلاہ فنکار سے متعارف ہو سکے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس مجموعے میں ایک مضمون اپنی خودنوشت کوطور پر لکھا ہے، جس میں انہوں نے لکھنؤ سے نکلنے والے رسالہ ''گلبن'' کے مدیر ظفر ہاشمی کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔اس مقالے کا عنوان ''ظفر ہاشمی یادوں کے دریچوں سے'' ہے۔ظفر ہاشمی ڈاکٹر سید عبدالباری کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔مصنف نے ان کے ساتھ بچپن میں خوب کھیلا کودا ہے اور انہیں کے زیر سایہ ان کے مطالعے کا ذوق بھی پروان چڑھا۔غرض ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس مضمون میں اپنے بچپن کی سنہری یادوں کوتازہ کیا ہے اورظفر ہاشمی کے ساتھ بتائے گئے لمحوں کوقلم بند کیا ہے، اس مضمون سے مصنف کی زندگی کے بہت سے گوشے ظاہر ہوئے جن سے راقم الحروف نے حوالے کےطور پر باب اول میں ان کے سوانحی کوائف بیان کرتے ہوئے استفادہ کیا ہے۔

اس مجموعے کے آخر میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے ابنِ فرید کی شخصیت کوان کے خطوط کے آئینے میں پیش کیا ہے اور ادارۂ ادب اسلامی ہند کے دور تشکیل اور دور پختگی کا جائزہ ان کے خطوط کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ان خطوط کو پڑھنے کے بعد اسلامی ادب کی تحریک اوراس کے اصول وضوابط سے بخوبی واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔اسلامی تحریک کو پروان چڑھانے اوراس کی جدوجہد میں ابن فریداورڈاکٹر سید عبدالباری کی کوششوں اور کاوشوں کا اندازہ بھی ان خطوط کے ذریعے لگایا جا سکتا ہے۔غرض یہ خطوط تحریک اسلامی ادب کے ابتدائی مراحل سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آداب شناخت کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سید عبدالباری نے صرف اسی مجموعے میں نہیں بلکہ اپنے سبھی مجموعۂ مقالات میں ہر بار نئے نئے فنکاروں سے اردوادب کومتعارف کرایا ہے اوران کی یہ شخصیت شناسی، عصری آگہی اوران کی باریک تنقیدی نظراور تلاش وجستجو کے عمل کو ظاہر کرتی ہے۔ان کی یہ چیز انہیں اپنے عہد کے قلمکاروں اورنقادوں سے منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

نئی خوشبو نئے خواب

''نئی خوشبو نئے خواب'' ڈاکٹر سید عبدالباری کا چھٹا مجموعہ مقالات ہے، جو دسمبر ۲۰۱۰ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔اس میں بھی مذکورہ تمام مجموعے کی طرح ادب کے کچھ بنیادی مسائل اور اس کی ساخت وشناخت پر نظریاتی بحث ملتی ہے۔اس کے علاوہ کچھ اہم ادیبوں اور شاعروں کے فکروفن پر گفتگو کی گئی ہے۔''نئی خوشبو نئے خواب'' میں کچھ مضامین ان ادیبوں اور شاعروں پر بھی ہیں جن سے انہیں خاص انسیت تھی اور انہیں قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا خاص موقع ملا تھا۔اس مجموعے میں پہلا مضمون ''ادب بحثیت ذہن ساز'' کے عنوان سے ہے، جس میں انہوں نے ادب کی افادیت اور مقصدیت کو اہمیت دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب کا مقصد صرف سرور وانبساط حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے انسان کی ذہن سازی بھی کی جاسکتی ہے۔وہ انسان کے ذہن وکردار کی تعمیر ادیب کا پہلا فرض قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ اس کے بغیر کوئی ادیب تخلیق وتحریر کا مرحلہ طے نہیں کرسکتا ہے۔غرض ڈاکٹر سید عبدالباری ادب سے اخلاقی ومعاشرتی اصلاح کا کام لینا چاہتے ہیں نیز ادب کو صالح اور مثبت قدروں کا ترجمان بنانے کے خواہش مند ہیں اور ادب میں لطف وانبساط کے ساتھ انسانوں کی ذہن سازی کے قائل ہیں۔اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں؛

> ''اچھے ادب کی پہچان یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے ہم ایک بہتر انسان بن سکیں ۔مگر اس کے لئے ہمارے اقدار کے شعور کو بالیدہ ہونا چاہئے۔ہم قطعی طور پر یہ طے کرچکے ہوں کہ ہمارے لئے کیا بہتر ہے اور ہمیں کیا پسند کرنا چاہئے۔ادب سے صحت مند تاثر اخذ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں اس کا شعور ہو کہ بذات خود کیا ہیں اور ہمیں کیا ہونا چاہئے۔ادب یہ خود آگاہی بھی پیدا کرتا ہے مگر اس کے لئے اقدار وعقائد کے چراغ ہمیں اپنی شخصیت کی محراب میں روشن کرنے پڑتے ہیں۔''۵۶

جب تک کوئی ادیب انسانی شخصیت کی روح میں اتر کر ادب تخلیق نہیں کرتا ہے، وہ اثر انداز نہیں ہوسکتا ہے اور ذہن سازی میں مددگار بھی نہیں بن سکتا ہے۔اردو ادب کے تمام سرمائے کو اٹھا کر اگر بغور مطالعہ کیا

جائے تو اندازہ ہوتا ہے، ادب کے اسی حصے میں آفاقیت آئی ہے، جس میں حسن کلام اور تاثیر کلام کے ساتھ اخلاقی اقدار، تہذیب، عقائد اور نظریات کی سچی ترجمانی ملتی ہو۔ڈاکٹر سید عبدالباری اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے ترقی پسند ادب کے بارے میں رقمطراز ہیں؛

''بیسوی صدی کے وسط میں ترقی پسند اگر چہ ادب برائے لطف وانبساط کے بجائے ادب برائے زندگی کے قائل تھے لیکن وہ اپنے نظریاتی تشنج کے سبب اپنے قاری کو ذہنی انحطاط کا شکار بناتے رہے۔انہوں نے ماضی کے تہذیبی واخلاقی سرمایہ کا احترام ختم کرنے اور مخاطب کو سیکولر بنانے کی کوشش کی۔اگر چہ وہ ماضی کی اقدار کے گن گاتے رہے لیکن اعتبار واعتماد کو مجروح بھی کرتے رہے۔ان کی تخلیقات کا وہی حصہ آج قابل قدر سمجھا جاتا ہے جس میں انسان کے لئے خیر وفلاح کا ذریعہ بننے کی تلقین ملتی ہے۔انہوں نے تاریخ کا ایسا تجزیہ کیا کہ ماضی تمام کا تمام جاگیرداری وسرمایہ داری میں غرق اور مذہب بھی اس کا پروردہ بن کررہ گیا۔ادب برائے زندگی کے اعلان کے باوجود وہ زندگی کا بڑے سطحی انداز سے مطالعہ کرتے رہے۔انہوں نے کبھی اپنے اندر جھانک کر نہیں دیکھا۔'' ۵۷

ڈاکٹر سید عبدالباری تخلیقی عمل میں اخلاقی اقدار کو لازمی تصور کرتے ہیں اور مذہب وعقائد کے بغیر کسی فن پارے کی آفاقیت کو کسی بھی صورت میں قبول کرنے کو تیار نظر نہیں آتے ہیں۔یہی سبب ہے موجودہ عہد میں وہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے سخت مخالف نظر آتے ہیں۔جنہوں نے ادب کو محض الفاظ کی طلسم بندی اور تفنن طبع کا سامان سمجھ رکھا ہے اور ترکیب، استعارہ، علامت اور پیکر تراشی کو ادب کی کل کائنات تصور کرتے ہیں۔ ان کا معاشرتی اور اخلاقی صداقتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، جس کے سبب عوام کا ایک بڑا طبقہ ادب سے کنارہ کش ہوتا جارہا ہے۔اس کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں ہے کہ وہ بیٹھ کر ان طلسم بندیوں کو دن بھر سلجھاتا رہے۔غرض جدیدیوں نے ادب، مذہب اور اخلاقی اقدار کو ادب میں نظر انداز کر کے صرف فنکارانہ صلاحیت اور ہنرمندی کو اہمیت دی۔ان کو فنکار کے فکر ونظر سے کوئی سروکار نہیں ہے۔جبکہ ڈاکٹر سید عبدالباری اقدار حیات کی اعلیٰ ومثبت قدروں کو ادب وفن کی بنیاد قرار دے کر تہذیب جدید کے مادی افکار ونظریات پر محاسبہ قائم کرتے ہیں اور ادب میں مذہب، عقائد اور ہماری صدیوں سے چلی آرہی تہذیبی واخلاقی اقدار کو ادب کے لئے ناگزیر قرار دیتے ہیں وہ اسلامی نقطۂ نظر سے ادب کی تعبیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تخلیقی عمل کی اخلاقیات یہ ہے کہ انسان لفظ کا رشتہ اپنی ذات سے اور اپنے ماحول سے استوار کرے۔اپنی آنکھوں کو اپنی ذات اور غیر ذات دونوں کے مشاہدہ کے لئے کھلا رکھے اور پھر جب صفحۂ قرطاس پر وہ اپنا قلم رکھے تو یہ سوچ کر کہ وہ اپنے ماحول سماج اور ابنائے نوع کے سامنے جوابدہ ہے بلکہ خود جس وجود نے اس کی تخلیق کی ہے اور اسے تخلیقی قوت سے نوازا ہے اس کے سامنے بھی اپنے ایک ایک لفظ ایک ایک جملہ اور ایک ایک سطر کے لئے جواب دہ ہونا پڑے گا۔شاید تخلیقی عمل کی یہی اخلاقیات ایک قلمکار کو ایک آفاقی ،حیات بخش جاوداں اور زماں ومکاں کی حدود سے آگے جانے والا ادب تخلیق کرنے کی توفیق عطا کرسکتی ہے۔''۵۸

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سید عبدالباری ادب میں تخلیقی عمل کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کے بغیر ادب کو سطحی تصور کرتے ہیں۔ان کے مطابق جو ادیب یا فنکار معاشرہ اور تہذیب سے کٹ کر صرف الفاظ کی طلسم بندی اور فنکاری پر اپنا سارا زور صرف کرتے ہیں وہ حالی اور اقبال جیسی ایک بھی تخلیق پیش کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔اس طرح کی تخلیقات جس کا اخلاقی اقدار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ایک دائرے میں سمٹ کر رہ جاتی ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری کا یہ مضمون ''تخلیقیت اور اخلاقی اقدار'' ایک مینی فیسٹو کی اہمیت کا حامل ہے جس میں انہوں نے تخلیقی عمل کے لئے اخلاقی اقدار کو مرکزیت دی ہے۔اس لحاظ سے یہ مضمون کافی اہم ہے اور ہمیں دعوت غور وفکر بھی دیتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے زیادہ تر مضامین میں مغربی استعماریت اور اس کی سرمایہ پرستی کو موضوع بنا یا ہے اور اس سے ہونے والے نقصانات کی خوب مذمت کی ہے۔انہوں نے مغربی بربریت اور ہمارے ذہن و دل پر اس کے تسلط کی کھل کر مخالفت کی اور اس کے زیر اثر ادب میں جو تبدیلی رونما ہوئی، اس کو خاص طور سے موضوع بحث بنایا ہے۔مغربی استعماریت کی جن شعرا نے اپنے کلام میں کھل کر مخالفت کی ان میں علامہ اقبال کا نام سرفہرست ہے۔اقبال نے استعماریت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے اور سرمایہ پرستی سے روندے ہوئے برصغیر کے انسانوں کو سربلندی اور خود اعتمادی کا پیغام اپنی شاعری میں عام کیا اور ان کے اندر جوش وولولہ پیدا کیا ،جس سے ان کی تقدیریں بدل سکیں۔ اقبال کو مغرب کی مادہ پرستی کا توڑ درویشی اور فقر وعناد میں نظر آتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اقبال کی فکر ونظر میں مغربی استعماریت اور سرمایہ پرستی کے عذاب کو موضوع بحث بنایا ہے اور ان کی شاعری میں اسی نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے۔اقبال اپنی شاعری کے ذریعے اہل مشرق کو بیدار

کرنے کے ساتھ ساتھ اسے متحرک کرنے اور مغربی استعمار سے ٹکر لینے کے لئے بار بار پیغام دیتے ہیں اور مغربی مادیت اور سرمایہ پرستی کی خرابیوں اور نقصانات کو واضح کرتے ہیں اور اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں اقبال کے علاوہ اور کسی شاعر کے یہاں مغربی عفریت سے نجات دلانے کا اتنا شدید احساس نہیں دیکھنے کو ملتا ہے جس نے ہر حال میں انسانوں کو مسلسل بیدار کرنے اور انہیں پستی سے نکلنے کا پیغام بڑی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ دیا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری استعماریت کے خلاف کی گئی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اقبال کی فکر و نظر سے متعلق لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال اردو ہی نہیں عالمی ادب کے واحد شاعر ہیں جنہوں نے ایشیا کی اقوام بلکہ مغربی استعمار کے قدموں سے دبی کچلی دنیا کے انسانوں کے دلوں میں امید و آرزو کا چراغ روشن کیا اور مغرب جس منزل تک پہنچ کر دنیا پر حکومت کر رہا ہے اس سے بہت آگے ان کی منزل مقصود قرار دی۔ وہ مغرب کی گدائی سے اہلِ مشرق کو نجات دلانے کے لئے بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اس عہد میں جب کہ مغربی سامراج کا جبر و قہر پوری دنیا پر مسلط تھا اقبال کا حیات آفریں پیغام مشرق کے لئے ایک حیات تازہ کا جھونکا محسوس ہوا۔ انہوں نے بغیر کسی گومگو اور ابہام و کنایہ کے اللہ کی کتاب میں، رسول اکرم کی حیات طیبہ اور اسلامی تاریخ کے روشن ابواب کو سرچشمہ قوت و شوکت اور محورِ سر بلندی و افتخار قرار دیا۔ انہوں نے مغرب کی مرعوبیت کے طلسم سے نجات دلانے کے لئے خودی و خود اعتمادی کی صدا بلند کی۔ انہوں نے مرد مومن کو محور کائنات قرار دیا جو سرمایہ داری کے عذاب سے دنیا کو نجات دلا سکتا ہے۔''۵۹

اقبال کی طرح علامہ شبلی نعمانی کا مزاج بھی پوری طرح سے مشرقی تہذیب میں ڈھلا ہوا تھا، وہ بھی کسی طرح سے مغربی استعماریت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ سرسید سے متاثر ہونے کے باجود ان کے تصوارت کے مخالف بھی تھے۔ دراصل سرسید نے عقلیت پر زور دیا اور مذاہب و عقائد پر کچھ ایسی تعبیریں پیش کیں جس سے شبلی کو سخت اعتراض تھا۔ اس کے باوجود وہ سرسید کے تعلیمی مشن کو تاعمر فروغ دیتے رہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے عہد سرسید میں شبلی نعمانی کی انفرادیت اور ان کے امتیازات کو واضح کرتے ہوئے ان کی جملہ ملی و ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے، جس میں انہوں نے شبلی کی نثر نگاری کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی تاریخ نویسی کے امتیازات کو واضح کیا۔ ان کی تنقید نگاری اور ادب سے متعلق ان کے

خیال وافکار پر مختصراً گفتگو کرتے ہوئے اسی آئینے میں ان کی شاعری کے اوصاف کو ظاہر کیا۔غرض اس مقالے میں انہوں نے شبلی نعمانی کی شخصیت اوران کی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔

علامہ شبلی کو سرسید کے جن مذہبی افکار وخیال پر اعتراض تھا ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے سرسید کی مغرب پرستی اوراس معاملے میں ان سے سرزد ہونے والی غلطیوں کو موضوع بحث بنایا ہے،جس میں انہوں سرسید کی عقل پرستی اوراس میزان پر مذہب کو جس انداز میں تولا ہے،اس کی تفصیل سے وضاحت کرتے ہوئے،سرسید کی اندھی مغرب پرستی کی خوب مذمت کی ہے۔مگر انہوں نے ملت کے مسلمانوں اوران کی تہذیب اوران کے کھوئے ہوئے وقار کی بازیابی کے لئے جو کارنامے انجام دیئے ہیں اس کی حمایت بھی کی ہے اور لکھتے ہیں کہ سرسید نے صرف ایک ہی غلطی کی،انہوں نے عام بیداری کے لئے مغربی تہذیب کو اپنا نمونہ بنایا کاش وہ اسلامی معاشرہ اور اسلام کی عظیم شخصیات کو مرکز نگاہ بناتے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی شخصیت اردو ادب میں ایک قد آور صحافی ،ممتاز فلسفی،ماہر نفسیات،انشاپرداز،مفسر قرآن اور ایک پر مغز نقاد کی حیثیت سے ہوتی ہے۔انہوں نے تعمیری ادب کے نظریات کی تبلیغ کرتے ہوئے اپنی تحریروں میں توازن وتناسب تاعمر قائم رکھا۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی تنقید نگاری کا جائزہ اکبرالہ آبادی کی شاعری کے حوالے سے پیش کیا ہے۔مولانا نے اکبرالہ آبادی کی شاعری کا جائزہ اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے،انہوں نے اکبر کو فکری تناظر اور مشرق کی آفاق گیر تہذیبی روایت کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔مولانا عبدالماجد اکبرالہ آبادی کو بیسویں صدی میں اقبال کے ہم رتبہ فنکار ومفکر تصور کرتے ہیں اوراس بات کی دلیل میں انہوں نے پچاس ٹھوس ثبوت مہیا کئے ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اکبرالہ آبادی پر مولانا نے جو عملی تنقید کا نمونہ پیش کیا ہے،اسی تناظر میں ان کی تنقید کا جائزہ لیا ہے اوران کے تنقیدی شعور اوراس کی خصوصیات کو واضح کرتے ہوئے،ان کی تنقید میں تہذیبی واخلاقی اقدار کی جو جھلک دیکھنے کو ملتی ہے اس کی وضاحت کی ہے۔ان کی تنقیدی نگاری سے متاثر ہو کر وہ لکھتے ہیں:

> ’’مولانا ماجد کے قلم سے جذبات واحساسات کا ایک سیل رواں جاری ہے اور
> اپنے عبرتناک زوال پر نہایت موثر و دردانگیز اسلوب میں اکبر کے حوالے سے ہم سے

مخاطب ہیں۔ پھر بیسوی صدی کے نصف اول کے اہم واقعات غلامی و مرعوبیت کو لکھتے ہیں اور اکبر کے اس موضوع پر حکیمانہ اشعار کا برمحل حوالہ دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ بیسویں صدی میں ایک ایسا بھی نقاد ہمارے درمیان موجود تھا جو مشرق کی تابدار روایات کی اس دل و جاں سے پاسبانی کا فریضہ ادا کر رہا تھا۔''۶۰

میرؔ اور فانیؔ اردو ادب کے دو ایسے شاعر ہیں، جن کو قنوطیت اور یاسیت کا امام کہا جاتا ہے۔ دونوں کی شاعری درد و غم کے ہجوم میں ڈوبی ہوئی ہے اور دونوں نے تصوف کی راہ اختیار کی۔ دونوں کی شاعری کو قنوطیت و افسردگی کا لاثانی مرقع اور زندگی کے اتھاہ درد و غم کا انوکھا عکاس قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ دونوں کے مزاج میں کافی مناسبت دیکھنے کو ملتی، مگر ایک چیز ہے جو دونوں کو ایک دوسرے ممتاز کرتی ہے۔ میر کے غم میں آفاقیت پائی جاتی ہے اور ان کے غم میں غم روزگار کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے، جبکہ فانی کا غم میر کی بنسبت ایک محدود دائرے تک سمٹ کر غم ذات کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے میر و فانی کی شاعری میں جو مناسبت پائی جاتی ہے اس کو موضوع بنا کر تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور دونوں کی شاعری میں پائے جانے والے امتیازات کو واضح کیا ہے اور آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فانی کا تغزل میر سے بلند ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''میر و فانی دونوں اردو غزل کے عظیم فنکار ہیں۔ دونوں بغاوت کے ایک تمکنت احساس، دونوں ضبط سنجیدگی اور دونوں اعلیٰ درجے کے تخلیقی جوہر کے حامل ہیں لیکن اسے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے کہ فانیؔ کا تغزل میرؔ سے زیادہ نکھرا ہوا ہے اس لئے کہ فانی اس وقت پیدا ہوئے جب لکھنؤ کے دبستان شاعری نے اردو زبان کی لطافت و نفاست کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا تھا۔ اس معاملہ میں وہ میر و غالب سے آگے نکل گئے ہیں''۶۱

آل احمد سرور کا شمار اردو کے ممتاز ناقدوں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے بہت کم وقتوں میں اپنی تنقید نگاری کے ذریعے اردو ادب میں ایک خاص مقام و مرتبہ حاصل کیا۔ اردو تنقید کی تاریخ میں آل احمد سرور ایسے ناقد ہیں، جنہوں نے تنقید کو تخلیق کا ہم پلہ قرار دیا اور اسے انشائیہ کی بلندیوں سے ہم کنار کیا۔ آل احمد سرور کی تنقید نگاری ایک متوازن فکری و تنقیدی شاہراہ پر گامزن ہے۔ انہوں نے اپنی تنقید میں سلامِ ذوق اور سلیم الطبعی کو ہمیشہ

برقرار رکھا۔آل احمد سرور کی تنقید کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ سائنسی نقطۂ نظر رکھتے ہیں، اس کے باوجود بھی ان کی تنقید میں تخلیقیت اور ادبیت کے عنصر بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ وہ تنقید نگاری میں ہمیشہ معروضی انداز نظر کی حمایت کرتے ہیں اور خود عملی طور پر اس کا ثبوت بھی دیا ہے۔ ان کی تنقید نگاری کا ایک امتیاز یہ بھی ہے، وہ کہیں بھی جذباتی یا ذاتی تاثرات یا اظہار ذات کو اپنی تحریروں میں نمایاں نہیں ہونے دیتے بلکہ غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے دیانتداری کے ساتھ لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کو ان سے خاص رغبت تھی اور لکھنؤ میں تعلیم کے دوران ان سے شرف تلمذ اور قربت بھی حاصل رہی ہے۔ وہ آل احمد سرور کی شخصیت اور ان کی تنقیدی بصیرت سے کافی متاثر تھے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس مجموعے میں ان کی تنقید نگاری پر ایک مفصل مضمون تحریر کیا ہے، جس میں ان کی نظریاتی اور عملی تنقید کے امتیازات کو واضح کیا ہے۔ خاص طور سے اقبال کے فکر و فن کے تناظر میں انہوں نے آفاق گیر نظریات اور عصری مسائل کا جو جائزہ لیا ہے، اس کو موضوع سخن بنایا ہے اور اسی روشنی میں آل احمد سرور کی تنقیدی بصیرت کو واضح کیا ہے اور لکھتے ہیں اس مقام پر پہنچ کر ان کی تنقید دانشوری کی بلندیوں تک رسائی حاصل کر لیتی ہے، اس ضمن میں وہ مزید لکھتے ہیں:

> ’’اقبالیات پر سرور صاحب کی تحریریں ان کی دانشوری اور تنقید نگاری کا روشن باب ہیں۔ یہ اردو کی خوش قسمتی ہے کہ اسے جہاں بیسویں صدی میں مشرق و مغرب کے علوم و فنون و افکار سے پوری طرح باخبر شاعر اقبال میسر ہو۔ اجس نے اردو شاعری کو عالمی ادبیات میں ایک پر وقار مقام عطا کیا اور مشرق و مغرب کی دانشوری جس کے کلام کے آگے ماند پڑ گئی۔ دوسری طرف اردو تنقید کو آل احمد سرور جیسا باخبر اور صاحب نظر نقاد میسر ہوا جو ایک طرف مشرق کا مزاج شناس دوسری طرف مغرب کا رمز شناس ہے اور جس نے اردو تنقید کو ٹی ایس ایلیٹ اور آئی اے رچرڈ جیسے مغربی ناقدین کی رفعتوں تک لے جانے کی کامیاب کوشش کی۔ چنانچہ سرور صاحب اقبال پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا بین العلومی مطالعہ اور آفاق گیر طرز فکر و نظر استدلال (Global Attiude) ابھر کر سامنے آتا ہے اور اردو تنقید کو وزن و وقار عطا کرتا ہے۔‘‘ ۶۲

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری کے اس مضمون سے آل احمد سرور کے نقد و نظر کے امتیازات اور بالخصوص اقبال کے حوالے سے ان کی دانشوری کی معنویت اور تنقیدی رفعت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بیسویں صدی کا عہد بڑا ہنگامہ خیز تھا، اس عہد کے چوتھی اور پانچویں دہائی میں اردو شاعری میں بھی کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم نگاری کو کافی اہمیت و انفرادیت حاصل ہوئی۔ اس کے بالمقابل غزل سے لوگ دامن کش ہو رہے تھے۔ اس صورت حال میں غزل کو دوبارہ مستحکم کرنا اور اس کی عصری قدر و قیمت کو ثابت کرنا ایک دشوار ترین مرحلہ تھا۔ اس عہد میں مجروح ،فیض اور جذبی نے غزل کو بہت حد تک سنبھالنے کی کوشش کی مگر یہ سبھی شعرا غزل کو نظم کی طرح زندگی کے تمام تجربات کا ترجمان نہ بنا سکے۔ اسی عہد میں شاد عارفی ایک ایسا شاعر ادب کی دنیا میں وارد ہوتا ہے، جس نے غزل کے دامن کو لاتعدا موضوعات سے بھر دیا اور اس نے نظم کے بالمقابل اپنی شاعری میں زندگی کے تمام مسائل کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا۔ شاد عارفی نے اس عہد میں ترقی پسند تحریک کے بالمقابل غزل میں ایک منفرد راہ اختیار کی اور اپنے فکر وفن اور اپنی انفرادیت کا نقش اپنے ماحول پر بیٹھا دیا۔ اردو غزل میں اس حوالے سے ان کی ایک الگ شناخت قائم ہوئی۔ شاد عارفی کے کلام میں کوئی فکری فلسفہ دیکھنے کو نہیں ملتا بلکہ انہوں نے سیدھے سادے انداز میں اپنے ماحول کی تصویر کشی کی ہے، مگر اس میں ایسی دلکشی، رعنائی اور موسیقی پائی جاتی ہے کہ ان کے ساز سخن سے جو سر بلند ہوتے ہیں، اس سے دل خراش آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری شاد عارفی سے کافی متاثر تھے بلکہ رام پور میں ان کی خدمت میں متواتر حاضر ہوتے اور ان سے اپنے کلام پر اصلاح بھی لیتے رہے۔ انہوں نے شاد عارفی کے جہانِ فکر وفن پر نہایت سنجیدگی سے غور وخوض کیا اور اس عہد میں جب کہ غزل ایک نازک موڑ سے گزر رہی تھی اس میں ان کی شاعری کے امتیازات کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت شاد ایک بلند پایہ قادر الکلام اور فطری شاعر ہیں۔ ان کا ایک مخصوص لہجہ ہے منفرد انداز ہے بقول آل احمد سرور انہوں نے عوامی بول چال کی زبان کو شعر کی زبان بنا دیا اور بے ساختگی، بے تکلفی کو اپنا شیوہ بنا دیا۔ تصنع و تکلف سے انہیں بے حد نفرت ہے ۔کھری کھری سنانے اور دل لگتی بات کہنے کے وہ عادی ہیں۔ حضرت شاد کا فن اپنے نقطۂ عروج پر ہوتا ہے جب وہ داغ دہلوی کے لہجے میں نغمہ طراز ہوتے ہیں۔ ان کی تشبیہات اور محاروں کی دلکشی بھی ان کی فنی انفرادیت کو دوبالا کرتی ہے۔

حضرت شاد نے بے شک اردو شاعری کو ایک نازک مرحلہ میں ایک توانا طرز اظہار اور ایک متوازن وصحت مند فکر عطا کی۔ ان کے اثرات ہماری نئی نسل کے طرز بیاں اور موضوعات کے انتخاب پر پڑے اور ہمیں جدید شعرا کی نسل میں بہت سے فنکاروں پر شاد کے فکر وفن کی چھاپ محسوس ہوتی ہے۔ بلا شبہ عہد ساز شعرا کی صف میں ان کا یہ وصف خاص انہیں معزز مقام عطا کرتا ہے۔'' ۶۳

ڈاکٹر سید عبدالباری نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی شخصیت اور فن کا جائزہ ۱۸۵۷ء کے تناظر میں پیش کیا ہے، جس میں انہوں نے پہلی جنگ آزادی میں بہادر شاہ ظفر کی جدوجہد، ان کی رہنمائی اور پھر جلاوطنی تک کے سبھی واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ غرض یہ ایک تاریخی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے بہادر شاہ ظفر کی شخصیت کے اوصاف کو مرکز فکر بنا کر ان کی شاعری اور فکر وفن کے خدوخال کو واضح کیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنے زوال پذیر عہد کی بھرپور ترجمانی کی ہے، اپنے وقت کی محرومیوں، دہلی کی بربادی اور مغلیہ سلطنت کی تباہی کا حال انہوں نے اپنی شاعری میں اس طرح پیش کیا ہے جسے پڑھ کر انسان کا دل پسیج جاتا ہے۔ ان کی شاعری ایک تڑپتے ہوئے دل کی فریاد ہے۔ جسے پڑھ کر انسان دردوغم میں ڈوبنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ غرض بہادر شاہ کی شاعری کو اپنے عہد کا مرثیہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، جس میں اس وقت کی تباہی و بربادی کا ذکر ایسے انداز میں ملتا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں سے آنسو خود بخود رواں ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بہادر شاہ کے کلام میں اس دنیا کی تلخ حقیقتوں اور حیات ناپائیداری کی بے اعتباریوں کا جگہ جگہ ذکر ہے۔ انہوں نے ایک تہذیب، ایک مملکت اور ایک نظام کے عبرت ناک زوال کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے اور وقت کے ناقابل تنسیخ فیصلوں کے آگے سرتسلیم خم کیا ہے اور اپنے عہد کے زوال وانتشار سے سبق لینے نیز روحانی قدروں اور ابدی صداقتوں پر لوگوں کے یقین کو پختہ تر کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کو وقت کی گردش اور اس کے سیماب باقدموں کو شدت سے محسوس کر رہے تھے مگر تحمل واستقلال کی روشنی بھی ان کی پیشانی پر بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ بڑے دردناک لہجے میں ۱۸۵۷ء کی بربادیوں کا ذکر اپنے کلام میں کرتے ہیں ایسے دردناک لہجہ میں جس سے پہاڑوں کا کلیجہ شق ہو جائے۔''۶۴

مظفر حنفی اپنے لب ولہجے اور اسلوب ومزاج کی وجہ سے جدید شعرا کی صف میں شمار کئے جاتے ہیں، مگر انہوں نے جدید شاعری کی بے اعتدالیوں سے خود کو محفوظ رکھا نیز وہ کائنات کی عظیم سچائیوں اور حقیقتوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ اس لئے انہوں نے جدیدیوں کی طرح بطور فیشن نظریہ ومذہب سے بے نیازی و بیزاری اختیار نہیں کی، مذہب کی بے پناہ نوازشوں سے کبھی بے خبر نہیں ہوئے، انہوں نے اپنی تہذیب اور اقدار کا ہمیشہ خیال رکھا۔ یہی سبب ہے ان کی شاعری ہمیں صدیوں کے انسانی تجربات کی عکاس معلوم ہوتی ہے۔ غرض

مظفر حنفی کے فکر وخیال کی جڑیں اپنی تہذیب وتاریخ کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہیں۔وہ اپنے آس پاس کے حالات سے باخبر اور مغرب کی اندھی تقلید کے بجائے مشرقی شعور کا بہترین احساس رکھتے ہیں۔یہی سبب ہے وہ اپنی شاعری میں ایک توانا تہذیب واقدار کے ورثہ کے حامل افراد کی شکست وخوردگی کی نفسیات پر بے حد مضطرب نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری میں حق گوئی اور فن دونوں آپس میں مل کر لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور حرف حق ان کی شاعری کا خاص وصف بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری مظفر حنفی کی شاعری اور ان کے فکر وفن کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی انفرادیت کو واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''وہ دور جدید کے انسان ہیں لیکن اپنی تہذیبی جڑوں سے کبھی الگ نہیں ہوتے ۔انہوں نے زندگی کو نہایت سلیقہ کے ساتھ برتا اور اس عہد کے فکر وعمل کے بیچ دھارے میں اپنی کشتی کو ڈالنے کی اور عبور کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے ذوق ومزاج کا پرتو بن کر شاعری نے عزت ووقار حاصل کیا۔وہ اگر چہ غیر آراستہ وبے تکلف انداز تکلم کے قائل ہیں لیکن زبان کی نفاستوں سے بے خبر نہیں ۔انکسار اور بے نیازی دونوں کی دھوپ چھاؤں ان کے یہاں موجود ہے۔انہیں کے الفاظ میں انہیں اپنی تخلیقی آزادی بے حد عزیز ہے اور اس آزادی کو محفوظ رکھنے کے لئے وہ کسی مکتبۂ فکر سے وابستگی کا اعلان نہیں کرتے ۔لیکن وہ جانتے ہیں کہ آزادی مطلق کبھی کبھی ایسے منہ زور گھوڑے کا روپ اختیار کر لیتی ہے جو اپنے راکب کو خود روند ڈالتا ہے اس لئے اقدار وعقائد کی توانائی اور سلامتی فکر کی لگام کی ضرورت ہوتی ہے۔چنانچہ مظفر حنفی اپنے عہد کے بہت منتشر طبع فن کاروں کی طرح زندگی کے مثبت تصورات سے وحشت زدہ نہیں ہوتے اور اپنی عدم وابستگی کے باوجود انہوں نے اپنے تہذیبی تصوارت سے اعلیٰ درجہ کی باخبری اور جذباتی وابستگی کا مظاہرہ کیا اور ہمارے حیات بخش عقائد ونفسیات کی روشنی ان کے کلام میں چھن چھن کر باہر آتی ہے۔ان کے کلام میں ایک دردمند انسان دوست وجود کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔''٦٥

غرض مظفر حنفی نے جدید شاعر ہوتے ہوئے بھی اپنے ماضی سے اپنا رشتہ ہمیشہ استوار رکھا۔یہی خصوصیت انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے اور انہیں اس عہد کے شعرا میں ایک خاص اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان کے سبب صف اول کے شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے مجموعۂ مقالات ''آداب شناخت''میں کیفی اعظمی کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہیں توانا اظہار کا شاعر قرار دے چکے ہیں۔اس مجموعے میں بھی انہوں نے کیفی اعظمی کی شاعری کا جائزہ ان کے تصور انقلاب کی روشنی میں پیش کیا

ہے،اس مضمون میں انہوں نے کیفی کی شاعری کی مقصدیت اوراس سے رونما ہونے والے انقلاب کوموضوع بنایا ہے۔کیفی نے اپنی شاعری کے ذریعے زندگی بھرعوام کو بیدار کرنے کی کوششیں کیں اور ملک کی آزادی اور اس کی جدوجہد کے لئے کیفی نے اپنی شاعری کے ذریعے جوانقلاب برپا کیا،اس سے وہ عوام کے دل کی دھڑکن اوران کے سچے ترجمان بن گئے۔غرض کیفی انقلابی شاعری کے ذریعے عمر بھرعوام کواتحاد،امن وآشتی اورانسان دوستی کا پیغام دیتے رہے۔انقلاب سے متعلق مختلف موضوعات پر کیفی نے جوش وجذبے سے لبریز معتدد نظمیں تخلیق کی ہیں، جوان کے فکروفن کی بہترین ترجمان ہیں اوران کی یہ نظمیں ان کے فن کی معراج بھی ہیں۔ڈاکٹر سیدعبدالباری اپنے مخصوص نظریہ ادب سے کیفی کی شاعری کا جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کیفی کے فکروفن کی شناخت اوران کا امتیاز ان کی اتھاہ انسان دوستی ہے جس کا سرچشمہ خوداسلام کی تعلیمات ہیں اور جسے انہوں نے اشتراکیت کے مرکزی خیالات کے تناظر میں دیکھنے کی زیادہ کوشش کی۔یہ دردانسانیت انہیں عام انسانوں کے دکھ درد میں تڑپا تا ہے۔'' ٦٦

حفیظ بنارسی ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے عہد میں بھی اپنی غزلوں میں کلاسیکی آہنگ اور روایتی رنگ کو برقرار رکھا۔اپنے منفرد انداز بیان،اسلوب اور فکروفن کے ذریعے لوگوں تک مثبت پیغام پہنچانا ان کی شاعری کا ایک اہم مشن تھا۔ان کا تغزل اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ ان کی شاعری میں جلوہ گر ہے،مگر جو چیز قارئین کو خاص طور سے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، وہ ان کی صحت مندرجائیت ہے۔انہوں نے عوام کو بے یقینی کے دلدل سے نکلنے کا پیغام دیا اوراس کے پرخطر انجام سے لوگوں کو آگاہ کیا۔حفیظ کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے انہوں نے قدیم اساتذہ کے رنگ تغزل کواپنی شاعری میں پوری طرح سے برتا ہے اوراسی پیرائے میں نظریۂ حیات سے زیادہ مضمون کو پرلطف اورعوام کے ذوق کے مطابق ان کی دل بستگی کا سامان مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ڈاکٹر سیدعبدالباری حفیظ بنارسی کی شاعری کا جائزہ ان کے فکروفن کے حوالے سے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حفیظ کے پاس اپنے عہد کے لئے پیغام ہے۔مایوسی وافسردگی کی تاریکی سے باہرآنے اور ماحول کو بلنداقدار کے نور سے منور کرنے کا وہ نرالا ولولہ رکھتے ہیں۔وہ اپنے عہد کے ان شاعروں سے مختلف ہیں جن کوزلف وگیسو کی مدحت سرائی سے فرصت نہیں یا

جو الفاظ کے اندر معنی کی نئی دنیاؤں کی تلاش میں اس قدر محو رہتے ہیں کہ ان کی بات سمجھنا ان کے ماحول کے لئے دشوار ہو جاتا ہے۔حفیظ صاحب نظر بننے کا پیغام دیتے ہیں۔ہمیں ولولہ سربلندی اور حوصلہ نبرد آزمائی عطا کرتے ہیں۔''٦٧

ڈاکٹر سید عبد الباری نے تعمیر پسند فکر کا جائزہ اردو شاعری کے آئینے میں پیش کیا ہے، جس میں انہوں نے تحریک ادب اسلامی کی ۵۵ سالہ تاریخ کے تناظر میں اس کی شعری خدمات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے اس تحریک کے افکار و نظریات کی ترجمانی کرنے والے سبھی شعرا کے اشعار پیش کر کے ان کے مخصوص فکر و فن کی نشان دہی کی ہے۔یہ مضمون بھی ان کے پچھلے مجموعے میں شامل ہے جس پر گزشتہ صفحات پر گفتگو ہو چکی ہے۔اردو شاعری میں صیاد کا تصور ڈاکٹر سید عبد الباری کا ایک تحقیقی مضمون ہے، جس میں انہوں نے اردو شاعری میں صیاد کی علامت کو مختلف شعرا کے کلام سے واضح کیا ہے اور آخر میں لکھتے ہیں:

''صیاد کی علامت اردو شاعری کی نہایت معنی خیز، نہایت پر لطف، بلیغ علامت ہے جو اردو شعرا کے سیاسی شعور، معاشرتی بصیرت اور گرد و پیش کے حالات سے باخبری کو عیاں کرتی ہے اور حالات کی ناسازگاری کے باوجود اپنی بات کہہ گزرنے کی صلاحیت اور سلیقہ کی غماز ہے۔''٦٨

ساحل سلطان پوری جدید عہد کے ایک ایسے شاعر ہیں، جنہوں نے مظفر حنفی کی طرح اپنے جدید لب و لہجے کے باوجود جدیدیت اور اس کے فلسفے کو من وعن قبول نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنی تہذیبی و اخلاقی اقدار کی پوری پاسداری اپنی شاعری میں کی ہے۔ یہی سبب ہے ان کی شاعری میں اقدار کا بھرپور شعور دیکھنے کو ملتا ہے۔وہ موجودہ عہد کے شعرا کی طرح اپنے ماضی سے متنفر نہیں ہیں بلکہ ان کی شاعری کی جڑیں اسی میں پیوست ہیں۔ساحل جدید لب و لہجے کے شاعر ہوتے ہوئے بھی اپنی شاعری میں کلاسیکی روایت کو پورے اہتمام کے ساتھ برتتے ہیں۔وہ اپنی اس تہذیبی وراثت سے کافی مطمئن نظر آتے ہیں اور اسے اپنے لئے باعث فخر و افتخار بھی سمجھتے ہیں۔ساحل کی شاعری میں ان کی انا، خود اعتمادی اور انسان کی بلندیوں کے احساس کی عکاسی ہمیں نہایت دلکشی و ادبی لطافتوں کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے، جن کے مطالعے سے قارئین فرحت و انبساط حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے مسائل اور ان سے دوچار ہونے کی تلقین بھی حاصل کرتا ہے۔ڈاکٹر سید عبد الباری نے ساحل سلطان پوری کی شاعری اور ان کے فکر و فن کا جائزہ ان کے مجموعے کلام ''تیری خوشبو

تیرے خواب'' کے آئینے میں اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے اور ساحلؔ کو اس عہد کا نئی خوشبو نئے خواب کا شاعر تسلیم کیا ہے۔ وہ ساحل سلطان پوری کی کی شاعری کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''ساحل ایک ایسے لہجے میں ہم سے ہم کلام ہوتے ہیں جس میں ادعائیت نہیں انکسار ہے۔ انہیں اس وسیع وعریض کائنات میں انسان کی اصل حیثیت کا پورا احساس ہے چنانچہ ان کا انداز گفتگو نہایت مہذب اور شائستہ ہے۔ ان کے یہاں وہ شوریدگی اور ہنگامہ آرائی اور ہم چوما دیگر نیست کی کیفیت نہیں جو بالعموم خفیف العقل انسانوں کے یہاں ملتی ہے۔''۶۹

ڈاکٹر سید عبدالباری نے ساحل سلطان پوری کی شاعری کا جائزہ پیش کرتے ہوئے، انہیں اس جدید عہد میں نئے لہجے، نئے آہنگ، نئے موضوعات، نئے مسائل اور تازگی سے معمور نئی ہواؤں کا استقبال کرنے والا شاعر ثابت کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے جس شاعر یا ادیب پر قلم اٹھایا ہے اس کو وہ اپنے مخصوص نظریہ ادب سے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس مجموعۂ مقالات میں بھی انہوں نے جدید شعرا کے کلام پر تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ان کی شاعری میں صرف اسی پہلو کو موضوع بحث بنایا ہے، جس سے اعلیٰ تہذیبی واخلاقی اقدار اور مذہبی عقائد کی ترجمانی ہوتی ہے۔ انہوں نے اسی کسوٹی پر سبھی فنکاروں کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی عملی تنقید میں یہ نقطۂ نظر ہر جگہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ''نئی خوشبو نئے خواب'' ڈاکٹر سید عبدالباری کے آخری دور کا مجموعہ ہے، مگر اس میں کچھ مضامین ایسے ہیں جو ان کے پہلے مجموعے میں شائع ہو چکے ہیں مگر اس میں بھی وہ ذرا سی تبدیلی کے ساتھ شامل ہے۔ اس لئے ان مقالات کو نظر انداز کیا گیا جس پر گزشتہ صفحات پر ان کی عملی تنقید کے حوالے سے گفتگو ہو چکی تھی۔ یہ مجموعہ اس اعتبار سے بھی قابل تعریف ہے کہ اس میں عبدالباری نے جدید شعرا پر بھی قلم اٹھایا ہے اور ان کے فکر وفن کا جائزہ اپنے تنقیدی نظریات کے آئینے میں پیش کیا ہے اور ان کی عظمت و اہمیت سے اردو دنیا کو آگاہ کیا ہے۔

تراوشِ خیال

تراوشِ خیال ڈاکٹر سید عبدالباری کا ساتوں اور آخری مجموعہ مقالات ہے، جوان کی وفات سے کچھ ہی قبل ۲۰۱۳ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوکر منظرِ عام پر آیا۔ اس میں انہوں نے گزشتہ اور کچھ موجودہ عہد کے فن کاروں اور شاعروں کے فکروفن اور ان کی شخصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مجموعے میں فنکاروں کے کلام کا جائزہ لیتے وقت ان کی کوشش رہی ہے کہ ان کے ادبی نظریات کو پیش نظر رکھ کر ان کے فکر و نظر پر پڑنے والے نمایاں اثرات کو موضوع گفتگو بنا کر ان کی عصری معنویت کا جائزہ پیش کیا جائے۔ اس مجموعہ مقالات میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے صرف عملی تنقید کے نمونے پیش کئے ہیں۔

اس مجموعہ میں شامل پہلا مضمون بعنوان ''اودھ کی ثقافت، فلسفہ اور ادب۔ ماضی قریب تک'' ہے، جو تحقیقی نوعیت کا ہے۔ اس میں انہوں نے اودھ کی ثقافت اور فلسفہ کا جائزہ شری رام چندر جی کے عہد سے لے کر ماضی قریب تک کا پیش کیا ہے انہوں نے شری رام چندر اور اس کے بعد مسلمانوں کی آمد سے جو تہذیب وثقافت اودھ میں نمودار ہوئی اور اس ہم آہنگی کا جو عکس ادب میں ابھر کر سامنے آیا اس کی نشان دہی کی ہے۔ اس کے علاوہ ہندومت کی جو کتابیں اردو زبان میں ترجمہ ہوئی ہیں اس کی تفصیل بیان کی ہے اور بھگتی کال اور وحدت الوجود کے فلسفے کے آئینے میں اودھ کے ادب کا جائزہ پیش کیا ہے۔ غرض ڈاکٹر سید عبدالباری نے ہندو اور اسلامی کلچر اور فلسفے کے آپسی میل جول سے جو ادب وجود میں آرہا تھا اس کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے اور اس عہد کے ادب میں مشترکہ تہذیب، ثقافت اور فلسفہ کے عکس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اودھ میں عہد وسطیٰ میں رام چندر جی کی اخلاقی تعلیمات جنہیں تلسی داس جی نے تفصیل سے رامائن میں پیش کیا ہے اور اودھ میں مقبول عام بھگتی تحریک اور اودھ کے گوشے گوشے میں موجود دریشوں، صوفیوں اور علما کی اخلاقی تعلیمات اور مواعظ پر اس خطہ کی تہذیبی بنیاد استوار تھی۔ چنانچہ اودھ میں اس عہد میں فروغ پذیر ادب میں بھی مذاہب کی بنیادی تعلیمات موضوع سخن بنیں۔ عشق الٰہی کی حقیقت تزکیہ نفس کے معرفت کے طریقے، حقیقت اولیٰ کی معرفت وغیرہ دہلی سے اودھ تک اہل فکر ونظر کا موضوع گفتگو تھا۔ چنانچہ اس عہد کی شاعری میں اس کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔'' ۷۰

اسلامی فکر کی نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبدالباری نے علامہ اقبال کے افکار وخیال پر روشنی ڈالی ہے اور اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں میں جو فکری انقلاب پیدا کیا ،اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کی کوششوں اور کاوشوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ خواب غفلت میں سوئے ہوئے انسانوں کے اندر فکر وخیال اور عملی انقلاب کے بے شمار چشمے پھوٹ پڑے۔علامہ اقبال صرف ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ان کی شناخت ایک مفکر، فلسفی اور ماہر سیاسیات کی حیثیت سے بھی ہوتی ہے۔اقبال اپنے عہد کے سیاسی ومعاشرتی اور تہذیبی امور پر گہری نظر رکھتے ہیں یہی سبب ہے ان کا شمار دانشوروں میں کیا جاتا ہے۔اقبال کی نظر میں جمہوریت کا ایک الگ مطلب تھا اور وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جمہوریت کو تشکیل دینا چاہتے تھے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اقبال کے تصور جمہوریت پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور ان کی نظر میں جمہوریت کا جو تصور تھا اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اقبال ایک جمہوری معاشرہ میں مساواتی قدروں کے قائل ہیں وہ مغربی طرز کی بے لگام جمہوریت سے متنفر ہیں۔اقبال نے جس روحانی جمہوریت کا تصور پیش کیا ہے وہ اپنی تنظیم کے لئے الہامی ضابطۂ حیات کا محتاج ہے۔اپنے چھٹے لیکچر میں وہ مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ روحانی جمہوریت کی نشو ونما کریں جو اسلام کی اصلی غرض و غایت ہے۔توحید کا جوہر مساوات، سلمیت اور آزادی سے وابستہ ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلامی تصور حیات کا تقاضا ہے کہ باشرف افراد کی ایسی جمہوری برادری وجود میں آئے جسے ہدایت الٰہی کا ہر دم شعور ہو۔چنانچہ اقبال مغرب کی سیکولر بے خدا جمہوریت کے بجائے ایک اسلامی وروحانی جمہوریت کا تصور پیش کرتے ہیں۔''۱ے

ڈاکٹر سید عبدالباری نے غالب اور ان کے لکھنؤ کے ہم عصر شعرا کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری کے امتیازات کو نمایاں کیا ہے۔انہوں نے غالب کے عہد کے تہذیبی اور معاشرتی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں کے درمیان جو صورت حال اور کشمکش تھی اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب کی شاعری کا موازنہ ناسخ ،آتش اور ان کے شاگردوں کے کلام سے کیا ہے۔ بالخصوص ناسخ کو انہوں نے خاص موضوع بنایا ہے اور دونوں کے حالات اور ان کی شخصیت کے آئینے میں ان کی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے ۔غالب اپنے معاصر شعرا میں ناسخ سے خاص رسم و راہ رکھتے تھے اور ان کے کلام کو قدر و منزلت کی نگاہ سے

دیکھتے تھے، مگر دونوں کے مزاج اور شاعری میں زمین اور آسمان کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ غالب آسان سلیس اور رواں اسلوب میں اپنے فکروفن کے جوہر بکھیر رہے تھے۔ اسی عہد میں ناسخ مشکل پسندی کے شیدائی تھے اور انہیں اپنی مشکل پسندی اور مشکل گوئی پر ناز تھا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری ناسخ اور ان کے ہم عصر لکھنوی شعرا کا موازنہ کرتے ہوئے اس عہد میں غالب کی شاعری اور ان کے فکروفن کی انفرادیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''غالب کے پیچ در پیچ استعاروں اور ہمہ جہت ابہام نے ان کے کلام میں معنوی وسعتوں کو ایک بحر ناپیدا کنار میں تبدیل کر دیا جس کی کوئی مثال ان لکھنوی ہم عصروں کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ سادگی واصلیت کا دامن نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ فاروقی کے الفاظ میں ان کی پوری شاعری لکھنوی کی پوری شاعری کی نفی کرتی ہے۔ کبھی وہ روایتی اور خیالی مضامین کے قریب نہیں جاتے اور اپنے وقار اسلوب پر قائم رہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ غالب کے مزاج میں علویت مزاج خودداری، وقار رکھ رکھاؤ اور عظمت انسان کے پہلو موجود ہیں جو انہیں اپنے ہم عصروں سے منفرد و ممتاز بناتے ہیں۔ آخر اسی عہد میں انشاء، مصحفی، ناسخ اور دیگر شعرا تھے جنہوں نے شاعری کے دفتر کے دفتر تخلیق کئے لیکن غالب کی سطح تک نہ پہنچ سکے۔''۲۷

یہ بات بالکل درست ہے کہ غالب اور اقبال کے بعد جو محبوبیت اور مقبولیت فیض کے حصے میں آئی وہ آج تک برصغیر کے کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ بیسوی صدی کے نصف آخر میں شاعری اور فکروفن میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ شاعری کی پسند اور ناپسند کے پیمانے بھی بدلے۔ ترقی پسند تحریک کا زوال ہوا، اس کے ردعمل میں جدیدیت کی تحریک وجود میں آئی، اس کے بعد مابعد جدیدیت کا رجحان ہمارے فکروفن پر غالب ہوا، مگر اتنی تبدیلیوں کے باوجود فیض کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ فیض کی مقبولیت اور انفرادیت کا یہ راز ان کی شاعری میں پنہاں ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں عوام کے دلوں کی دھڑکنوں اور اپنے عہد کی سیاسی وسماجی کشمکش کو اپنا خاص موضوع بنایا اور اس کو اپنے رومانی مزاج کے مطابق ترقی پسند تحریک کے دیگر شعرا کے برعکس دلکش اسلوب میں اس طرح پیش کیا، جس سے ان کی شاعری میں پروپگنڈہ یا نعرہ بازی کے بجائے ایک عجیب وغریب طرح کا حسن پیدا ہو گیا۔ انہوں نے جو بات کہی علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کا سہارا لے کر کہی، جس سے ان کی شاعری میں علامتوں کا ایک منفرد نظام دکھائی دیتا ہے۔ ان کی ترکیبیں نہایت دلکش ہیں، فارسی الفاظ وتراکیب کو انہوں نے اپنی شاعری میں

نگینوں کی طرح جڑ دیا ہے، جس سے ان کی شاعری میں اور بھی دلکشی و رعنائی پائی جاتی ہے۔فیض جب اپنے مخصوص لب و لہجے، منفرد اسلوب اور صوتی آہنگ وحسن میں عوام کے دل کی ترجمانی کرتے ہیں تو قارئین کا ذہن ودل ایک طرح کی تازگی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے فیض کی شاعری اور ان کے فکروفن کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے جملہ اوصاف کو واضح کیا ہے۔مگر یہاں بھی ان کا اسلامی نظریہ کارفرما نظر آتا ہے،فیض کو سبھی جانتے ہیں وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو کر اپنے مخصوص انداز میں انقلاب کے نغمے بکھیر رہے تھے اور مارکس کے نظریات وافکار سے متاثر ہو کر اشتراکیت کی تبلیغ اپنی شاعری میں تاعمر کرتے رہے لیکن عبدالباری نے فیض کے یہاں بھی مذہبی عقائد واقدار اور مشرقی تہذیب کی جڑیں تلاش کر لیں وہ ان کی شاعری کے فکری وفنی بانکپن پر وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’فیض کو ہم بجا طور انقلاب کا مغنی کہہ سکتے ہیں۔انہوں نے تغزل اور شعریت کو انقلاب کا جز بنا دیا اور اختر شیرانی کی رومانیت اور اقبال کی فکری بلندی کو ملا کر ایک انوکھا طرز سخن ایجاد کیا۔فیض صرف شاعر نہیں۔انہوں نے دانش گاہوں میں لیکچرز دیئے،فوج میں ملازمت بھی کی،ٹریڈ یونین کے لیڈر بھی رہے۔اشتراکی فلسفہ ومعاشی مساوات کو دنیا کے مظلوم انسانوں کے درد کا مداوا بھی قرار دیتے رہے اور اس کی خاطر ۴ سال جیل بھی کاٹی مگر ان کا روس سے زیادہ خانہ کعبہ سے تعلق برقرار رہا اور اپنے عقائد اور اقدار سے انہوں نے گہرا ربط قائم رکھا۔چنانچہ امید و رجائیت کا توانا احساس ان کے ہر شعر میں موجود ہے۔بقول کلیم الدین احمد اہل زر کے مظالم پر وہ اشکبار ہوتے ہیں مگر اعلیٰ درجہ کی شائستگی برقرار رہتی ہے۔‘‘۳۷

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری سبھی فنکاروں اور ادیبوں کا جائزہ اسی نقطہ نظر سے لیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور جہاں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا وہاں سے بھی وہ مذہبی عقائد،تہذیبی وثقافتی اور اخلاقی اقدار اور مقصدیت کا پہلو تلاش کر لاتے ہیں۔یہی ان کی تنقید کی اصل شناخت بھی ہے کہ انہوں نے اپنے نظریات کی پاسداری کرتے ہوئے اسی کسوٹی پر ادب کے سبھی دبستانوں،رجحانوں اور نظریات وافکار کو پرکھنے کی حتیٰ الامکان کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے مولانا آزاد اور علامہ شبلی کے سیاسی افکار وخیالات اور ان کی ملی خدمات پر تفصیل

سے گفتگو کی ہے اور ان شخصیتوں کے سیاسی و ملی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے موجودہ عہد میں ان معنویت و افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ دونوں مقالے شبلی اور مولانا آزاد کے سیاسی و سماجی ہمدردی اور مذہبی عقائد و اقدار کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھے گئے ہیں، جس میں مصنف کی ان شخصیتوں کے تئیں عقیدت مندی اور محبت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ مضامین ادبی روش سے ہٹ کر تاریخی نوعیت کے حیثیت رکھتے ہیں۔ شبلی اور آزاد نے قوم و ملک کو بیدار کرنے نیز ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے اور مغرب سے مرعوبیت سے نجات حاصل کرنے کے لئے جو ملی خدمات انجام دیں ہیں، ڈاکٹر سید نے انہیں اہم موضوعات پر ان دونوں شخصیتوں کی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔

میر تقی میر کی شاعری ایک ایسے عہد کی ترجمان ہے، جو دہلی کی بربادی اور تباہی کا دور تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کی تمام سیاسی و معاشرتی زوال، اقتصادی حالات و انتشار کی ترجمانی اس انداز میں ہے کہ ان کے کلام میں ایک طرح کا سوز و گداز اور درد و غم پیدا ہو گیا ہے۔ میر کی پوری زندگی درد و الم میں گزری، جس کے سبب وہ قنوطیت کے شکار ہو گئے، مگر اس یاسیت کے عالم میں بھی انہوں نے اپنی تہذیب و اخلاقی اقدار کا دامن نہیں چھوڑا اور اسے اپنی شاعری کا ایک اہم جزو بنا لیا۔ میر کی پرورش اور تربیت صوفیانہ انداز میں خانقاہوں میں ہوئی تھی، اس لئے تصوف ان کے مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔ اس لئے وہ ان مصائب اور ناسازگار حالات میں بھی جو ان کے دل پر گزری اس کا خندہ پیشانی سے سامنا کرتے رہے اور جبر و قہر کے اتنے صدمات سہنے کے باوجود انسان کی عظمت اور اپنی تہذیب و اقدار کے نغمے بکھیرتے رہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے میر کی شاعری پر ان کے درد و غم کی جھلک کا جائزہ لیتے ہوئے میر کی عظمت کے اعتراف میں لکھا ہے:

> ''یہ اردو کا نرالا اور انوکھا شاعر ہے جو عین عالم اضطراب و انحطاط میں انسان کی عظمت کا نغمہ خواں ہے۔ جو درد سہتا ہے اور درد کا اظہار بھی کرتا ہے مگر درد سے شکست تسلیم نہیں کرتا۔ انسان دوستی کی عظیم قدروں اور صوفیا کی انسانی دردمندی کی قدروں سے جس کا سینہ لبریز ہے۔ جو عین طوفان و انقلاب کے عین سامنے کھڑا ہوا ہے اور اپنی کج کلاہی میں کسی طرح کمی نہیں آنے دیتا۔''۴۷

ڈاکٹر سید عبدالباری نے حسرت موہانی کی شخصیت اور ان کی سیاسی و ملی خدمات کا جائزہ ان کے دینی

افکار کی روشنی میں پیش کیا ہے۔مولانا کی تعلیم وتربیت مذہبی انداز میں ہوئی تھی۔ان کا تعلق ایک دیندار گھرانے سے تھا۔ جہاں صبح اٹھ کر بچہ ہو یا بزرگ سب کو فجر کی نماز ادا کرنا لازمی تھا۔اس کے علاوہ مولانا کا تعلق بہت سے بزرگان دین اور خانقاہوں سے رہا ہے۔یہی سبب ہے ان کی شخصیت ایک صوفی منش انسان کی تھی۔انہوں نے اپنی تمام عمر نہایت سادگی، ایمانداری اور پرہیزگاری کے عالم میں بسر کی۔مولانا کی یہی سادگی، ایمانداری اور مذہبی اقدار کی جھلک زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔چنانچہ ان کی شاعری میں بھی ان کے دینی افکار وخیال کی کارفرمائی ہر جگہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری ان کی شاعری پر اس پہلو سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حسرت کی شاعری ہوسنا کی شاعری نہیں، معرفت وانکشاف حقائق کی شاعری محسوس ہوتی ہے۔اسی دینی مزاج کے باعث حسرتؔ نے غزل کو لکھنؤ کے بقول علی سردار جعفری انحطاطی مکتب سے آزاد کرایا اور اسے ترقی کی نئی سمت عطا کی اور غزل کو ابتذال سے عشق پاکبازی کی سطح سے واپس لائے۔بہ ظاہر وہ ایک محبوب مجازی سے مخاطب ہیں جو ان کی ذاتی زندگی میں سچا رفیق و دمساز ہے جس نے ان کی شخصیت کو وہ استحکام اور طمانیت عطا کی ہے کہ وہ پہاڑوں سے ٹکرانے اور آندھیوں کی کلائی مروڑ دینے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہیں لیکن بہت جلد محبوب حقیقی اس پردے سے جھانکتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس کے حسن کی جھلک وہ کائنات کے ذرے ذرے میں دیکھتے ہیں'' ۷۵

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا شمار اردو ادب کی تاریخ میں ایک دیدہ ور اور بیباک صحافی کی حیثیت سے ہوتا ہے۔انہوں نے ''صدق جدید'' اور ''سچ'' کے ذریعے اردو صحافت میں حق گوئی، بیباکی اور جرأتِ اظہار کی ایک روشن روایت قائم کی اور ساتھ ہی ساتھ اردو صحافت میں ادبی چاشنی وعلمی وقار پیدا کر کے اسے بحیثیت ایک فن خوب فروغ دیا۔اس کے علاوہ مولانا کے یہ رسائل علمی وفکری اعتبار سے اسلامی افکار ونظریات کی بھرپور ترجمانی کرتے تھے، چنانچہ اس عہد میں کہیں بھی اسلام کی شان میں کوئی گستاخی ہوتی مولانا کی رگ حمیت فوراً پھڑک اٹھتی تھی اور وہ اس کا منھ توڑ جواب اپنے اداریوں میں دیتے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے مولانا کی صحافت نگاری کا جائزہ ان کے رسالے ''صدق جدید'' کے اداریوں کے حوالوں سے لیا ہے۔مولانا نے اپنے اداریوں میں اس عہد کی مسلم مخالف ہواؤں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے اور اس کے جواب میں انہوں نے جو اسلوب اپنایا ہے، اس سے ان کی تحریروں میں طنز ومزاح کی نشتریت کا احساس ہوتا ہے۔مطلب انہوں نے ہر بات کا جواب بڑی شوخی اور بذلہ سنجی کے انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی تلخ حقیقت سے بھی روشناس ہوتا ہے اور اسے لگتا ہے مولانا جو کہہ رہے ہیں وہ بالکل بجا ہے۔ڈاکٹر

سید عبدالباری مولانا کے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب اور ان کی صحافت نگاری سے متعلق رقم طراز ہیں:

''مولانا عبدالماجد کے شوخ بے باک تیز و طرار مگر ہوش مند حکیمانہ قلم سے ان کے اخبار میں مسلسل شذرات کا ترشح ہوتا رہا اور اپنے عہد کے اہم مسائل پر اور اہم شخصیات پر وہ نہایت ظریفانہ اور طنزیہ لب و لہجے میں اظہار خیال کرتے رہے۔ان کی تحریریں انہیں اردو کے ایک ممتاز صحافی اور طنز نگار کا رتبہ عطا کرتی ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔۶۷

روش صدیقی بیسوی صدی کے تعمیر پسند نظریات کا ایک انوکھا شاعر ہے، جس نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم نگاری میں بھی ممتاز مقام حاصل کیا۔روش صدیقی نے علامہ اقبال کے نظریات و افکار کے تتبع میں اپنی شاعری کو بلندی عطا کی۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان کے فکر و فن کا جائزہ ان کی نظم'' کارواں'' کے حوالے سے لیا ہے۔یہ ایک طویل نظم ہے جس میں شاعر نے زندگی اور کائنات پر فلسفیانہ انداز سے غور کیا ہے اور اس میں ایک فلسفی اور شاعر کا مکالمہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس نظم کا تجزیہ پیش کر کے روش صدیقی کی نظم نگاری اور ان کے فکر و فن کا گہرائی سے تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے اور ان کی شاعری میں علامہ اقبال کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں اس کو واضح کیا ہے۔روش نے غزلوں میں بھی اپنے کمالات کے جوہر دکھائے ہیں،انہوں نے اپنے عہد کے رومان اور انقلاب کے بالمقابل غزل کو حکیمانہ اور صوفیانہ خیالات سے ہم آہنگ کر دیا اور تغزل کے سبھی فنی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے انسانی درد و غم اور اپنے عہد کے تمام مسائل کو اپنی شاعری کا اہم موضوع بنایا ہے۔ان کی غزلیں روایت اور ہماری تہذیب و اقدار کے سانچے میں پوری طرح ڈھلی ہوئی ہوتی ہیں اور تصوف ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے، جو انسان کو روحانی اور اخلاقی بلندیوں تک لے جانے میں کافی اہم رول ادا کرتا ہے۔یہی وجہ ہے روش کی غزلوں میں سرور و انبساط کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے، جس سے ان کی شاعری ایک طرح سے تزکیہ نفس کا کام کرتی ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری بیسویں صدی میں ان کی غزلوں کی معنویت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ روش اپنی فکر، اپنے لب و لہجے اور اپنی موسیقیت کے اعتبار سے بیسویں صدی کے منفرد غزل گو ہیں اور ہماری نئی نسل کو غزل کا حقیقی اسلوب اور مزاج جاننے کے لئے ان کے کلام سے رجوع کرنا چاہئے۔انہوں نے جوش، اختر، ساغر، حفیظ

وغیرہ کی طرح فکری سطحیت اور فلسفیانہ کھوکھلے پن کو اپنے کلام میں راہ نہ دی۔ان کی فکر و عقیدہ کا نظام نہایت مستحکم و مربوط تھا۔وہ جو کچھ کہتے خلوص و دردمندی اور یقین و اعتماد کے ساتھ کہتے۔''۷۷

نظیر اکبرآبادی اردو ادب کا ایک ایسا شاعر ہے، جس نے ہماری تہذیبی ،ثقافتی اور معاشرتی زندگی کی بھرپور عکاسی اپنی شاعری میں کی ہے۔نظیر کی شاعری میں اٹھارویں صدی اور اس وقت ملک میں جو افراتفری اور انتشار کا عالم تھا اس کی جیتی جاگتی تصویریں دیکھ سکتے ہیں، اگر ان کی شاعری کو اس عہد کے ثقافتی ،معاشرتی اور اخلاقی روایات کا ایک حسین مرقعہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔زندگی کا وہ کون سا پہلو ہے، جس کو نظیر نے اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا ہے۔وہ ملک کے میلے ٹھیلوں سے لے کر یہاں کے تیہواروں ہولی ،دیوالی ،عید ،جانوروں ،کیڑوں مکوڑوں ،کبوتر بازی ،پتنگ بازی ،یہاں کے موسموں کو بھی اپنی شاعری کا خاص جزو بنا کر پیش کرتے ہیں ۔غرض انہوں نے زندگی کے ہر رنگ کو بڑے قریب سے دیکھا اور اسے محسوس کیا اور اس سے خوب لطف اندوز ہوئے ہیں۔نظیر کے ان موضوعات سے اندازہ ہوتا ہے، وہ ہندوستان کی عوامی زندگی سے کس قدر قریب ہیں، زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس سے نظیر نہ واقف ہوں ،انہوں زندگی کے تمام رنگوں اور پہلوؤں کو اپنی شاعری میں ہیرے اور جواہرات کی طرح جڑ دیا ہے۔یہی سبب ہے ان کی شاعری ہماری ہندوستانی تہذیب کی جیتی جاگتی تاریخ کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے، ان کی شاعری میں پورا ہندوستان پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے نظیر کی اس ہمہ گیر شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کو اس سرزمین کے رنگ ورس کا سچا ترجمان قرار دیا ہے، نظیر اکبرآبادی کی انسان دوستی اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار شاعری کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ انفرادیت کو واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''نظیر ایک باکمال فن کار ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو ایک وسیع میدان میں لا کھڑا کیا اور غزل قصیدہ مثنوی کے دائرہ سے نکل کر نظم نگاری کی طرف ذہن کو موڑ دیا، دوسرے انہوں نے اپنے موضوعات کو عشق و عاشقی اور امرا کی تعریف و توصیف سے آگے بڑھ کر ہندوستان کی روشن روایات تک وسعت دی۔ان کی نظموں میں خواجہ معین الدین چشتی ،خواجہ نظام الدین ،گرونانک ،گوتم بدھ ،میرابائی اور تلسی داس کا پیام محبت گونجتا ہے اور حب الوطنی و انسان دوستی کے جذبے سے سرشار بنا تا ہے۔وہ اردو شاعری کے ایک

مجد داوراس سرزمیں کے رنگ رس اور حرارت ورعنائی کے سچے ترجمان ہیں‘‘ ۷۸

آنندنرائن ملا کی شناخت عام طور سے ایک شاعر کی حیثیت سے ہوتی ہے،مگر وہ شاعری کے علاوہ ایک ناقد کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ شعروادب کی اہمیت وافادیت اوراس کی غرض وغایت اورادیب کی شخصیت اورفکروعمل سے متعلق ایک متوازن اور جچا تلا نظریہ رکھتے ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے آنند نرائن ملا کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے نظریۂ شعروادب کوواضح کیا ہے۔ملا کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’وہ ہر فنکار کے لئے پہلے ایک شریف اور ذمہ دار انسان اور شہری بننا ضروری سمجھتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ کسی فنکار کا قد اس کے انسانی قد سے زیادہ اونچا نہیں ہوسکتا۔ان کے نزدیک انسان کا فن اوراس کی زندگی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ وہ شاعر کو فنکار سے زیادہ دانائے راز اور پیام بر بھی سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک کوئی شاعر یا افسانہ نگار نوع انسان سے بے پناہ محبت کئے بغیر عظیم نہیں ہوسکتا اور نہ وہ ادب عالیہ پیش کرسکتا ہے۔

ملاؔ ادب کی پائیداری اور محکم بنیادوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لئے فقط جذبات واحساسات کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ پختہ سماجی شعور اوراخلاقی بصیرت کو بھی لازمی گردانتے ہیں۔اظہارِ حسن ،اظہارِ ذات اور اظہار نفس سے زیادہ اظہار مقصد کو اہمیت دیتے ہیں۔‘‘ ۷۹

اس سے قبل ایک مضمون میں ڈاکٹر سید عبدالباری سہیل احمد زیدی کی غزلوں اوران کے فکروفن کا تنقیدی جائزہ پیش کرچکے ہیں۔اس مجموعے میں بھی انہوں نے سہیل احمد زیدی کی نظموں کا مجموعہ ’’صنوبروں کے شہر‘‘ کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اوران کی نظموں کی فنی خصوصیات کوواضح کیا ہے۔اس مجموعے میں شاعر کے ابتدائی زمانے کی نظمیں موجود ہیں،جس میں وہ دنیا کو بدلنے کے لئے نظموں کے ذریعے انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور زمانے کی بدعنوانی ،بدمذاقی کوختم کرنے کا جوش وولولہ اس نوجوان کی شاعری میں بے حد فنکاری اور فکری بلندیوں کے ساتھ ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے، جو قاری کو حیرت واستعجاب کے عالم میں ڈال دیتا ہے۔سہیل احمد زیدی جو زندگی بھر اپنی بیماری کے سبب اپنے حالات سے لڑتا رہا اس کے باوجود اس کی شاعری

میں امید کی کرن مدھم ہوتی نہیں دکھائی دیتی۔ رجائیت ان کی شاعری کا اہم عنصر ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری ان کے مجموعے ''صنوبروں کے شہر'' کی نظموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''سہیل کی نظموں کو پڑھئے تو محسوس ہوتا ہے کہ ایک تیز گام انسان اپنے سبک قدموں کے ساتھ زندگی کا مشکل سفر طے کر رہا ہے۔ ہزارہا صعوبتوں اور رکاوٹیں اسے افسردہ خاطر نہیں بناتیں بلکہ وہ رجائیت اور امید و ولولہ کی شمعوں کی لویں تیز ہی کرتا جاتا ہے۔اس کی ہر نظم کے آخر میں قاری کو ایک حیات بخش پیغام ملتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ زندگی بھر مشکلات سے اور دوسروں کے درد کو بانٹنے والا شخص کس طرح اس فراخ دلی سے زندگی کے ہنگاموں میں مسکراتا ہے۔'' ۸۰

اپنی طویل بیماری کے باوجود بھی یہ حوصلہ مند شاعر تعمیری ادب کے پلیٹ فارم سے قوم کے نوجوانوں کو مثبت پیغام دیتا رہا۔اس کے اندر بلا کا جوش اور ولولہ موجود تھا، جو ہر حال میں قوم کی سربلندی کے لئے اپنے قلم سے انقلاب برپا کر رہا تھا،مگر اس کی نظموں میں ترقی پسند شعرا کی طرح وہ بلند آہنگی اور جوش و جذبہ نہیں تھا، جس سے ان کی شاعری پروپیگنڈا یا نعرے بازی بن کر رہ جاتی۔ان کی نظموں کے مطالعے سے ایک طرح کی نرمی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے اور الفاظ کا استعمال ان کے یہاں اس سلیقے سے ہوتا کہ اس میں غنائی کیفیت اور موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے کلام میں ایک ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے، جس سے ان کے کلام میں روحانیت کا عنصر غالب ہو جاتا ہے۔ یہی خوبی ان کو اس عہد کے شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔

نازش پرتاپ گڑھی آزادی کے بعد اردو شاعری میں ابھرنے والا ایک ایسا نام ہے، جسے موجودہ عہد میں ناقدوں اور ادب شناسوں نے نظر انداز کیا ہے۔مگر خود نازش کے کلام پر ان کے عہد کے نقادوں نے خاص توجہ مرکوز کی ہے اور ان کی غزلوں اور نظموں کی بلند آہنگی اور ان کے تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ ان کے موضوعات کی داد دی ہے ۔ان کے کلام پر فراق گورکھپوری، غلام ربانی تاباں ، نیاز فتح پوری اور شمس الرحمٰن فاروقی سبھی نے اظہار خیال کیا ہے اور ان کے فکر وفن کو کافی سراہا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے بھی نازش کی فکری وفنی جہات پر قلم اٹھایا ہے اور ان کی نظموں اور غزلوں کے حوالے سے ادب میں ان کے مقام و مرتبے کا

تعین کیا ہے۔ نازش نے جس وقت شاعری شروع کی تھی وہ عہد اقبال کے انتقال کے بعد اور ترقی پسند تحریک کے عروج کا ہے، اس وقت انہوں نے بھی اس تحریک کے اثرات قبول کئے اور قوم پرستی کے جذبے سے سرشار ہو کر کافی پر جوش نظمیں تخلیق کیں جس سے ان کی شاعری میں قوم پرستی اور وطن سے محبت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں نظیر اکبر آبادی کی طرح اپنے عہد کے معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی سچی ترجمانی کی ہے اور یہاں کے کھیت کھلیان سے لے کر زندگی کے تمام مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ یہی سبب ہے بعض ناقدین انہیں ایک قومیت پرست شاعر قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے کبھی بھی کسی تحریک یا نظریے کے زیر اثر شاعری نہیں کی ہے۔ اس کے باوجود بھی ان کی شاعری میں ترقی پسندی اور جدیدیت کے اثرات صاف نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری کا لب ولہجہ اور اسلوب قدیم اور روایتی ہے مگر موضوعاتی اعتبار سے وہ بالکل جدید معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبد الباری ان کے فکر وفن پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نازش نے اپنے پیش رووں سے فکری وفنی روشنی حاصل کرتے ہوئے اور اپنے عہد کے ترقی پسند رجحانات کے مثبت پہلوؤں کو اختیار کرتے ہوئے اردو نظم اور غزل کی روشن روایات کو فروغ دیا اور بیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنا ایک منفرد مقام اردو شاعری کی دنیا میں بنایا۔ وہ سادہ زندگی گذارتے ہوئے اور عام انسانوں کے دکھ درد سے قریب رہ کر ہمارے معاشرے کا ایک حصہ بنے رہے۔ وہ ایک مفکر مصلح اور انقلاب آفریں انسان نہ ہوں لیکن وہ اپنی شاعری کے ذریعے اپنے عہد کو ماضی کی روشن روایات پر قائم رہنے کا دلکش پیرائے میں پیغام دے کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ چنانچہ ہم ان کو پیام بر شاعر قرار دینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔''۸۱

ڈاکٹر سید عبد الباری نے اپنے اس مجموعے میں ایک کم عمر مگر بلند آہنگ شاعر انور اعظمی کو اردو ادب سے متعارف کرایا ہے۔ انور اعظمی کا شمار تعمیری ادب کے معماروں میں ہوتا ہے۔ وہ اس تحریک میں روز اول سے ہی سرگرم عمل رہے۔ انہوں نے اس تحریک کی ابتدا میں اس کے نظریات کو فروغ دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا یہی وجہ ہے وہ اس تحریک کے صف اول کے شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انور اعظمی نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنے عہد کے نوجوانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور قوم وملت تک اپنا مثبت پیغام پہنچایا۔ غرض ان کی حیثیت ایک پیامی شاعر کی ہے۔ جب ان کی نظموں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں ہمیں اقبال کی صدائے بازگشت

صاف سنائی دیتی ہے۔اقبال کے علاوہ شبلی کا بھی عکس ان کی شاعری میں دیکھنے کو ملتا ہے۔وہ بھی شبلی کی طرح ماضی سے اپنا رشتہ استوار کئے ہوئے نظر آتے ہیں اور تاریخ کے شاندار واقعات کو دہرا کر وہ قوم وملت کی اصلاح کرتے ہیں۔انور اعظمی نے ترقی پسند شعرا فیض،ساحر اور مجاز کی طرح بلند مقام حاصل کیا مگر ان کے مدمقابل انہوں نے صالح و پاکیزہ فکر اور اپنی قوم وملت کے درد وغم کی نہایت دلکش انداز میں ترجمانی کی۔انور اعظمی نے صرف شاعری ہی نہیں کی بلکہ افسانے بھی تحریر کئے اور صحافت کی دنیا میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔مگر انہیں زندگی بہت کم ملی۔البتہ انہوں نے صرف ۳۵ سال کی عمر میں شعر وادب کی جو خدمت کی ہے وہ ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ اتنے کم وقفے میں وہ اتنی انقلابی اور فکر انگیز نظموں اور اس قدر پرسوز وطرب خیز غزلوں کا ذخیرہ کیسے فراہم کر گئے۔انور اعظمی کے دو مجموعۂ کلام بھی شائع ہوئے جس میں ایک نظموں اور ایک غزلوں کا مجموعہ ہے۔انور اعظمی کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر سید عبدالباری رقمطراز ہیں:

> ''ان کے تغزل کے کلاسیکی آہنگ کو دیکھ کر ان کے عہد کے ممتاز شاعر جگر کی بار بار یاد تازہ ہو جاتی ہے۔انور کی زبان نفاست و لطافت اور ان کے تغزل کا بانکپن ہمارا دل جیت لیتا ہے اور حیرت ہوتی ہے یہ نوجوان شاعر کیسے چند سالوں میں اس منزل تک پہنچ گیا۔وہ تعمیری رجحان رکھتے تھے اور اپنے عہد کے ترقی پسندوں سے بیزار تھے جو مذہبی عقائد و اقدار کا مذاق اڑاتے تھے۔انہوں نے اپنے دور کی نوجوان نسل کو اس فکری و تہذیبی انحراف سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ان کا کلام پابندی سے اس عہد میں یعنی گزشتہ صدی کی پانچویں، چھٹی دہائی میں ہندو پاک کے تعمیر پسند رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہا اور انہیں اس عہد کے اسلام پسند مصنفین وشعرا کی صف اول میں جگہ دی جانے لگی۔'' ۸۲

غرض انور اعظمی اس عہد کے ایک بہترین شاعر تھے،مگر اردو ادب میں ان کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہو سکی جس کے وہ حق دار تھے۔کم عمر میں اتنی معیاری شاعری مومن،سرور جہان آبادی اور مجاز کے بعد شاید ہی کسی اور شاعر نے کی ہو۔ان کی شاعری کی بلند آہنگی اور فکر وفن کی پختگی ہمیں انگریزی شاعر کیٹس کی یاد تازہ کر دیتی ہے ،جس نے کم عمر میں اعلیٰ تخلیقات پیش کر کے عالمی ادب میں ایک منفرد مقام و مرتبہ حاصل کیا۔کچھ لوگ مجاز کا موازنہ کیٹس سے کرتے ہیں مگر انور اعظمی کی افادیت بھی اس اعتبار سے کم نہیں ہے۔یہ الگ بات ہے انہوں نے ایک ایسے نظریے کے زیر اثر ادب تخلیق کیا جس کو ابھی تک ادب میں قبولیت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا ہے۔مگر نظریہ کیسا بھی ہو اگر اس میں ادبیت اور تمام فنی خوبیاں موجود ہیں تو اسے نظر انداز نہیں کیا جانا

چاہئے۔اگر اس میں خلوص اور جذبے کی سچائی شامل ہوتو اسے اہل علم وفن کوقبول کرنے میں کسی بھی طرح کا تامل نہیں برتنا چاہئے نیز اس سے کسی بھی طرح کے تعصب کا اظہار نہیں ہونا چاہئے۔

انور اعظمی کی طرح ابوالمجاہد زاہد کا شمار بھی تعمیری ادب کے صف اول شعرا میں ہوتا ہے۔اس سے قبل بھی ڈاکٹر سید عبدالباری ان کے فکر وفن کا تنقیدی جائزہ پیش کر چکے ہیں،مگر اس مجموعے میں ان کی شخصیت کے آئینے میں انہوں نے ان کے فن کا جائزہ پیش کیا ہے۔اس مضمون میں انہوں نے ان کی شخصیت کے ساتھ ان کے ساتھ گزارے ہوئے وقتوں کی یاد تازہ کی ہے اور ان کی نظموں،غزلوں اور نعتیہ شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ابوالمجاہد زاہد ابتدا میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شاعری کر رہے تھے،مگر جب انہوں نے دیکھا کہ مزدوروں اور غریبوں کے ساتھ مذہبی اقدار وعقائد پر حملے کئے جا رہے ہیں اور مشرقی تہذیب وروایات کو بھی ادب سے خارج کیا جا رہا ہے تو زاہد صاحب کو یہ بات ناگوار لگی اور وہ اس حلقہ سے بیزار ہو گئے اور تعمیر پسند نظریات کے زیر اثر شاعری کرنے لگے۔مگر ان کی شاعری کا موضوع وہی انقلاب تھا جو ترقی پسندیوں کا تصور تھا تاہم اس میں وہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ابوالمجاہد زاہد نے نظم اور غزل دونوں میں یکساں شہرت حاصل کی۔انہوں نے اپنی غزلوں میں کلاسکیت کو ہمیشہ برقرار رکھا اپنی تہذیبی اور اخلاقی روایات واقدار سے کبھی دامن کش نہیں ہوئے۔ڈاکٹر سید عبدالباری ان کی غزلوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''زاہد صاحب غزل کی نفاستوں اور لطافتوں کے رمز شناس ہیں۔جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے بے ہنگم دور میں بھی انہوں نے اردو غزل کا بانکپن قائم رکھا۔اس دلکش مگر دشوار و نازک مزاج صنف سخن کے تقاضوں سے اپنے عہد کے سخن وروں کو آگاہ کرتے رہے۔ان کی غزلیں،بلاغت،معنویت اور سادگی کا مرقع ہیں۔''۸۲

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری زاہد کی شخصیت سے کافی متاثر ہیں۔یہی سبب ہے کہ ان کے فکر وفن پر انہوں نے متعدد مقالے مختلف زاویے سے لکھے ہیں اسی طرح انہوں نے آخری دور کے مجموعۂ مقالات میں جتنے بھی مضامین تحریر کئے یا جس شخصیت پر قلم اٹھایا ہے وہ یا تو ان سے بے حد قریب تھے یا عبدالباری ان سے بہت متاثر تھے۔اس مجموعے کے آخر میں ایک اور شخصیت کا ذکر ہے جن سے وہ کافی مرعوب نظر آتے ہیں۔ان کا نام حیرت شملوی ہیں،جن سے ان کی ملاقات قیام رام پور کے دوران ہوئی۔وہ ان کی خدمت میں برابر حاضر

ہوتے رہے اور ان سے فکر وفن سے متعلق استفادہ کرتے رہے۔ حیرت شملوی ادارۂ ادب اسلامی ہند کے ابتدائی عہد کے شعرا میں ممتاز مقام پر تھے۔ حیرت شملوی تمام عمر بستر علالت پر ہی رہے اور ۱۴ سال تک اسی حالت میں ادب کی آبیاری کی۔ زندگی کے تمام مصائب اور غم جھیلنے کے بعد بھی ان کے اندر زندگی کو با مقصد بنانے اور اس سے کچھ ٹھوس نتائج اخذ کرنے کا جذبہ تاعمر قائم رہا۔ بستر پر لیٹے لیٹے ہی اپنے عہد کے تمام شعرا کی پذیرائی کرتے اور جو ان سے ملنے آتا اس سے بڑے خلوص اور خندہ پیشانی سے محو گفتگو ہوتے۔ مگر اپنی بیماری کا غم انہیں اندر ہی اندر تھا، جس کے اثرات ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ ان کو ایسی بیماری تھی جس سے شفایابی کی کوئی امید نہیں تھی، یہی سبب ہے ان کی شاعری میں حزن وملال کی دھند چھائی ہوئی ہے، جسے وہ زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور بلند نصب العین کی مدد سے قابو کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کوشش میں انہوں نے ایسے شعر تخلیق کئے ہیں، جن سے زندگی کے تمام مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ حیرت شملوی کا ایک مجموعہ کلام ''آئینہ حیرت'' شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے اسی مجموعے کی روشنی میں ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور ان کے فکر وفن کا جائزہ لیتے ہوئے ادب میں ان کی انفرادیت کو واضح کیا ہے۔ وہ ان کی شاعرانہ عظمت اور ان کے امتیازات پر تفصیل سے اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ان کا امتیاز ان کے کلام میں سہل ممتنع کی سفید چاندنی ہے جو از اول تا آخر چھٹکی ہوتی۔ آسان زبان، الفاظ سلیس وشیریں، لہجہ بے تکلفانہ اور تصنع سے پاک مضامین میں یک گونہ انفرادیت ایجاز واختصار کی طرف خصوصی میلان چنانچہ چھوٹی بحروں میں شعر کہنا انہیں محبوب، سیاست حاضرہ سے بیزاری پھر ایک گوشہ گیر ومعذور انسان زندگی کی ہماہمی و خروش کا کیوں کر ساتھ دے سکتا تھا زندگی بھر کشمکش حیات سے واسطہ رہا۔ دن رات مسلسل ایک بستر پر کس طرح گذارتے تھے۔ ان کے درد وکرب کی جھلک جگہ جگہ ان کے کلام میں نظر آتی ہے جسے پڑھئے تو دل پگھل جاتا ہے۔ ان کے بہت سے اشعار ضرب المثل بن جانے کے لائق ہیں۔ عمر بھر وہ داستان درد سناتے رہے اور غم دل کو غم دوراں سے ہم آہنگ کرتے رہے۔ غم پسندی کے باوجود ان کے کلام میں مایوسی و بیزاری کی جھلک نظر نہیں آتی۔ کبھی کبھی تفنن طبع کا بھی اظہار کرتے ہیں مگر شائستگی کی حدود میں۔''۸۴

حیرت شملوی کا کلام یقیناً ہمارے ادب میں گراں قدر اضافہ ہے جسے ڈاکٹر سید عبدالباری نے پہلی بار اہل ادب سے روشناس کرایا۔ انہوں نے شعر وادب کا ایک ایسا ذخیرہ چھوڑا ہے، جسے کسی بھی حال میں فراموش

نہیں کیا جانا چاہئے۔اسی طرح ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے تنقیدی مجموعوں میں بے شمار ایسے شعرااور ادیبوں کا تعارف ان کے فکر وفن کے حوالے سے پیش کیا ہے،جس سے ابھی تک اردو ادب کا ایک بڑا طبقہ ناواقف ہے۔ان ادیبوں اور شعرانے اپنے فکر وفن کے ذریعے ادب میں جوگراں بار اضافے کئے ہیں ان کی محنتوں اور کاوشوں کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے ہم سبھی اہل ادب کا یہ فرض ہے کہ ان کی تخلیقی کاوشوں اور کارناموں کو بھی اپنی تحقیق وتنقیدی کام کئے جائیں تاکہ اردو ادب میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہو سکے۔

اس مجموعے کے آخر میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے اردو شاعری میں انسانی تذلیل کے خلاف اٹھنے والی آواز کو موضوع بنایا ہے۔یہ ایک تحقیقی مضمون ہے جس میں انہوں نے اردو شاعری میں ایسے اشعار اور نظموں کی نشان دہی کی ہے،جن سے انسان کی عظمت اور مساوات کا پیغام ملتا ہے اور بغیر کسی تفریق رنگ ونسل اور مذہب کے انسان کی سربلندی کا احساس ہوتا ہے۔اس ضمن میں انہوں نے اردو کی ابتدائی شاعری سے لے کر تعمیر پسند ادیبوں تک کی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے اور ایسے اشعار نقل کئے ہیں جن سے انسانیت کو فروغ ملتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے انسانی مساوات اور اس کی عظمت میں بھگتی تحریک کا اہم رول بتایا ہے اور اسلامی تعلیمات کو بھی انہوں نے اس پس منظر میں واضح کرتے ہوئے انسان دوستی اور انسانی حقوق پر روشنی ڈالتے ہوئے بعض شعرا کے اشعار کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔اس صدی میں رنگ ونسل ذات پات کا طلسم بہت حد تک ٹوٹ چکا ہے۔لوگ ایک دوسرے کے مذہب کا احترام اور ان کی عزت کرنے لگے ہیں اور اب کے ادب میں بھی قومی یک جہتی کی یہ جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری ترقی پسند تحریک،تعمیر پسند،جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی شاعری کا جائزہ اس حوالے سے لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’ترقی پسند تحریک نے انسانی مساوات کو اپنا موضوع بنایا مگر یہ مساوات فقط معاشی مساوات تک محدود ہو کر رہ گئی۔جدیدیت نے ان مسائل کو شعر وادب کے موضوع سے خارج سمجھا۔مابعد جدیدیت کی دنیا الگ تھی۔وہ کسی نظریہ اور نظام اقدار کے قائل نہ تھے۔ہاں اسی عہد میں تعمیر پسند ادیبوں نے ضرور تفریق رنگ ونسل کو موضوع بنایا ہے۔بڑی اچھی نظمیں کہی گئیں۔ہمارے موجودہ عہد کے شعرانے بھی اسے عوام کی زندگی کا ایک ناسور سمجھ کر تفریق رنگ ونسل کو موضوع سخن بنایا ہے جس پر تفصیل سے گفتگو کی ضرورت ہے غرض اردو شاعری نے ہر دور میں انسان کی تذلیل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور انسانی مساوات اور عظمت آدم کا پیغام پیش کرتی رہی۔‘‘۸۵

''تراوش خیال'' ڈاکٹر سید عبدالباری کا آخری مجموعہ مقالات ہے، جس میں صرف ان کی عملی تنقید کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ زیادہ تر مضامین ایسے ہیں جو پہلے بھی کسی مجموعے میں شائع ہو چکے ہیں مگر اس میں اسی موضوع پر نئے انداز میں فکر انگیز گفتگو کی گئی ہے۔ غرض ڈاکٹر سید عبدالباری نے نظریاتی تنقید اور عملی تنقید کے جو نمونے چھوڑے ہیں، وہ ہمارے ادب میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس سے ادب کی ایک نئی جہت اور ایک نئی سمت کا پتہ ملتا ہے۔ بالخصوص تعمیر پسند نظریات کی بنا پر انہوں نے جو اصولی اور نظریاتی بحثیں کیں ہیں، وہ موجودہ عہد کے لئے ایک نئی منزل کا پتہ دیتی ہیں۔ اسلامی افکار و خیال کی روشنی میں ادب کی تخلیق کے لئے جو مشورے انہوں نے دیئے ہیں وہ یقیناً ایک ایسا نظریہ ہے جس کی نفی کرنا کسی بھی طرح جائز نہیں ہے۔ اسلامی افکار و خیالات کی روشنی میں تخلیق کیا جانے والا ادب بھی آفاقی اور حقیقت نگاری سے پر ہوتا ہے۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی شاہراہ پر ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنہوں نے فن تنقید کے وقار اور معیار کو اپنی تحریروں سے بلند کیا اور اس وقت اردو تنقید میں پھیلی ہوئی بے راہ روی پر اپنے قلم سے قدغن لگانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی تنقید کے لئے وقف کر دی تھی اور تنقید نگاری کو عیب جوئی اور نکتہ چینی کے دلدل سے نکال کر جانچ پرکھ اور تصحیح و اصلاح کے منصف پر فائز کیا۔ انہوں نے تنقیدی مسلک میں ہمیشہ جادۂ اعتدال کی روش اختیار کی اور انتہا پسندیوں سے اپنا دامن بچاتے رہے۔ نظریاتی تنقید کے ساتھ ساتھ عملی تنقید کا ایک بڑا اور گراں قدر سرمایہ بھی انہوں نے ہمارے درمیان چھوڑا ہے، جس سے ہمیں بہت سے شعرا اور ادیبوں کو ایک نئے زاویئے سے سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ غرض ان کی عملی تنقید بھی نظریاتی تنقید کی طرح کافی معنی خیز اور وزن دار ہے جو ان کے پورے تنقیدی سرمایہ کو وقعت و وقار عطا کرتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کے فکر انگیز تنقیدی مجموعوں میں بین العلومی آگہی کا ثبوت مہیا ہے، جس میں خاص کر عمرانی و نفسیاتی عناصر نمایاں ہیں۔ ان کی تنقید میں یہ چیز توازن کے ساتھ منطقی انداز میں بہت واضح طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے اس عمرانی مطالعے کا محور و مرکز تعمیری اور اخلاقی فکر ہے۔ صحت مند افکار اور اخلاقی اقدار کے تحت ادب و زندگی کا مطالعہ مصنف کی شناخت ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری دراصل ان ادیبوں میں سے نہیں ہیں جنہوں نے مغرب سے درآمد خیالات اور اردو تنقید کے چند نمونوں کی روشنی میں تنقید کی عمارت کھڑی کر دی ہو

بلکہ انہوں نے سائنس ،فلسفہ تاریخ اور عمرانیات کی روشنی میں ادب کا مطالعہ کیا ہے اور اسی زاویہ سے وہ اپنی نظریاتی و عملی تنقید کو جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔یہی سبب ہے۔ان کی تنقید میں وزن و وقار آج بھی قائم ہے۔ان کے یہاں ایک طرح کی حکیمانہ بصیرت ملتی ہے،جو تنقید کے لئے لازمی ہے اور ان کے یہاں وہ تنظیم ملتی ہے،جس سے ان کی تنقید نگاری کا انداز بالکل سائنٹفک معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کی تنقید نگاری کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ تو کلیم الدین احمد کی طرح فن پرست نظر آتے ہیں اور نہ ہی احتشام حسین کی طرح فکر کو اہمیت دیتے ہیں بلکہ وہ ان دونوں انتہاؤں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے اپنی تنقید نگاری میں جادۂ اعتدال کا ثبوت دیتے ہیں۔وہ اپنی تنقید نگاری میں مغربی تہذیب اور اس کے نظریات و افکار کی کھل کر مذمت کرتے ہیں اور مشرقی و اخلاقی روایت و اقدار کی روشنی میں ہی ادب کو پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کو ادب کا معیار سمجھ کر جا بجا اس کا حوالہ بھی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس معاملے میں وہ اپنے ہم عصر عبدالمغنی اور ابن فرید سے کسی حد تک مماثلت رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ تعمیری ادب میں ان دونوں نقادوں کے بعد تیسرا نام جسے اردو تنقید میں سب سے زیادہ معتبر سمجھا جاتا ہے وہ ڈاکٹر سید عبدالباری کا ہی ہے،جنہوں نے اپنے منفرد اسلوب و انداز اور مثبت فکر و نظر سے موجودہ عہد میں خاص طور سے تعمیری ادب کے نقاد کی حیثیت سے ایک معروف و مستند مقام حاصل کیا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کی تنقید نگاری الگ سے تحقیقی مقالے کی متقاضی ہے،جس میں صرف ان کی تنقید نگاری پر تفصیل سے گفتگو کی جائے،جس سے بحیثیت نقاد عبدالباری کی ادبی خدمات کا ایک نیا باب کھلنے کی امید ہے۔

☆☆☆☆

حواشی:

(۱) ڈاکٹر سید عبدالباری، ادب اور نظریاتی وابستگی، ادب اور وابستگی، ص۔۱۲۔۱۳

(۲) ڈاکٹر سید عبدالباری، ادب اور نظریاتی وابستگی، ادب اور وابستگی، ص۔۱۰۔۱۱

(۳) ڈاکٹر سید عبدالباری، نیا افسانہ: منظر و پس منظر، ادب اور وابستگی، ص۔۴۲

(۴) ڈاکٹر سید عبدالباری، نیا افسانہ: منظر و پس منظر، ادب اور وابستگی، ص۔۴۵

(۵) ڈاکٹر سید عبدالباری، نیا افسانہ: منظر و پس منظر، ادب اور وابستگی، ص۔۵۶

(۶) ڈاکٹر سید عبدالباری، جدیدیت اور اس کے مسائل، ادب اور وابستگی، ص۔۶۱

(۷) ڈاکٹر سید عبدالباری، جدیدیت اور اس کے مسائل، ادب اور وابستگی، ص۔۷۰

(۸) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو شاعری میں ہماری تہذیب کے نقوش، ادب اور وابستگی، ص۔۷۴

(۹) ڈاکٹر سید عبدالباری، فراق: مجموعہ اضداد، ادب اور وابستگی، ص۔۱۳۳

(۱۰) ڈاکٹر سید عبدالباری، فراق: مجموعہ اضداد، ادب اور وابستگی، ص۔۱۴۴

(۱۱) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو کے موجودہ ادیبوں کی ماحول سے لاتعلقی، نقدِ نو عیار، ص۔۱۴

(۱۲) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو افسانہ: امکانات اور وسعتیں، نقدِ نو عیار، ص۔۱۹

(۱۳) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو افسانہ: امکانات اور وسعتیں، نقدِ نو عیار، ص۔۲۱

(۱۴) ڈاکٹر سید عبدالباری، مولانا عبدالماجد دریا آبادی: بحیثیت صحافی، نقدِ نو عیار، ص۔۵۳

(۱۵) ڈاکٹر سید عبدالباری، مثنوئی سحر البیان نئے تنقیدی میزان پر، نقد نو عیار، ص۔۱۰۶

(۱۶) ڈاکٹر سید عبدالباری، نوابین اودھ کی ادبی سرپرستی، نقد نو عیار، ص۔۱۴۹

(۱۷) ڈاکٹر سید عبدالباری، نہج البلاغہ کے ادبی محاسن اور فن و ادب پر اس کے اثرات، افکارِ تازہ، ص۔۳۷

(۱۸) ڈاکٹر سید عبدالباری، ادب کی تخلیق و تنقید کا اسلامی منہاج، افکارِ تازہ، ص۔۵۰

(۱۹) ڈاکٹر سید عبدالباری، ادب کی صورتِ حال اشتراکیت کے زوال سے پہلے زوال کے بعد، افکارِ تازہ، ص۔۷۵

(۲۰) ڈاکٹر سید عبدالباری، مولانا فراہی اور شعریات مشرق، افکارِ تازہ، ص۔۹۴

(۲۱) ڈاکٹر سید عبدالباری، بیسوی صدی میں اسلامی نشاۃ ثانیہ اور اقبال، افکار تازہ، ص۔۱۰۵
(۲۲) ڈاکٹر سید عبدالباری، مجروح کا تغزل، افکار تازہ، ص۔۱۲۶
(۲۳) ڈاکٹر سید عبدالباری، معین احسن جذبی: اپنی فکر وفن کی دنیا میں، افکار تازہ، ص۔۱۶۲
(۲۴) ڈاکٹر سید عبدالباری، حفیظ میرٹھی کے کلام میں عصر نو کے انسان کی جھلک، افکار تازہ، ص۔۱۹۳
(۲۵) ڈاکٹر سید عبدالباری، داغ کی شاعری اور شخصیت، افکار تازہ، ص۔۲۰۸
(۲۶)۔ڈاکٹر سید عبدالباری، پروفیسر مشیر الحق بحیثیت افسانہ نگار، ص۔۲۳۲
(۲۷) ڈاکٹر سید عبدالباری، فاروق بانسپاری، افکار تازہ، ص۔۲۵۵
(۲۸) ڈاکٹر سید عبدالباری، جگر کے کلام میں عصری شعور، افکار تازہ، ص۔۲۷۳
(۲۹) ڈاکٹر سید عبدالباری، جگر کے کلام میں عصری شعور، افکار تازہ، ص۔۲۸۲
(۳۰) ڈاکٹر سید عبدالباری، ادب میں اظہارِ خیال کی آزادی، کاوش نظر، ص۔۱۷
(۳۱) ڈاکٹر سید عبدالباری، ادب میں اظہار خیال کی آزادی، کاوش نظر، ص۔۲۰
(۳۲) ڈاکٹر سید عبدالباری ادب میں توازن وعدم توازن، کاوش فکر، ص۔۳۱
(۳۳) ڈاکٹر سید عبدالباری، تخلیق ادب: ایک انفرادی مشغلہ یا معاشرتی فریضہ، کاوش نظر، ص۔۴۷
(۳۴) ڈاکٹر سید عبدالباری، انسانیت کے ارتقاء میں اسلامی ادب کا حصہ، کاوش نظر، ص۔۵۵
(۳۵) ڈاکٹر سید عبدالباری، ماہر القادری کے کلام میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی جھلک، کاوش فکر، ص۔۱۴۳
(۳۶) ڈاکٹر سید عبدالباری، فراق اپنی شاعری کے آئینے میں، کاوشِ نظر، ص۔۱۹۵
(۳۷) ڈاکٹر سید عبدالباری، جگر مرادآبادی شخص اور شاعر، کاوش نظر، ص۔۲۰۵
(۳۸) ڈاکٹر سید عبدالباری، مومن شخص اور شاعر، کاوش فکر، ص۔۲۱۰
(۳۹) ڈاکٹر سید عبدالباری، پطرس بخاری کی مزاح نگاری، کاوش فکر، ص۔۲۱۷
(۴۰) ڈاکٹر سید عبدالباری، عزیز بگھروی کا شاعرانہ مقام حرمت فن کی روشنی میں، کاوش فکر، ص۔۲۲۷
(۴۱) ڈاکٹر سید عبدالباری، اجمل سلطان پوری کا تغزل، کاوش نظر، ص۔۲۲۹
(۴۲) ڈاکٹر سید عبدالباری، اکیسویں صدی میں ادب کی جہت، آداب شناخت، ص۔۱۵
(۴۳) ڈاکٹر سید عبدالباری، غالب اور نئے دور کا عرفان، آداب شناخت، ص۔۱۸
(۴۴) ڈاکٹر سید عبدالباری، تحفظ حقوق انسانی اور اردو ادب، آداب شناخت، ص۔۵۴
(۴۵) ڈاکٹر سید عبدالباری، مجروح سلطان پوری: شخصیت اور فکر وفن، آداب شناخت، ص۔۸۹

(۴۶) ڈاکٹر سید عبدالباری، ادبیات شبلی کی نئی صدی میں معنویت، آداب شناخت، ص۔۱۰۱
(۴۷) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو شاعری بیسویں صدی کے نصف آخر میں، آداب شناخت، ص۔۱۲۶
(۴۸) ڈاکٹر سید عبدالباری، عرفان صدیقی، آداب شناخت، ص۔۱۳۸
(۴۹) ڈاکٹر سید عبدالباری، رشید کوثر فاروقی: جدید وجاوداں کی روشنی میں، آداب شناخت، ص۔۱۶۴
(۵۰) ڈاکٹر سید عبدالباری، کیفی اعظمی، آداب شناخت، ص۔۱۸۳
(۵۱) ڈاکٹر سید عبدالباری، حضرت ابوالمجاہد زاہد کی داستان فکروفن، آداب شناخت، ص۔۲۰۱
(۵۲) ڈاکٹر سید عبدالباری، میرانیس اپنے ماحول کے تناظر میں، آداب شناخت، ص۔۲۱۴
(۵۳) ڈاکٹر سید عبدالباری، علامہ شبلی کی کائنات فکروفن، آداب شناخت، ص۔۲۲۴
(۵۴) ڈاکٹر سید عبدالباری، کیا سادہ لوح کیسے زمانے میں رہ گیا، آداب شناخت، ص۔۲۳۲
(۵۵) ڈاکٹر سید عبدالباری، اشہر سلطان پوری، آداب شناخت، ص۔۲۳۷
(۵۶) ڈاکٹر سید عبدالباری، ادب بحیثیت ذہن ساز، نئی خوشبو نئے خواب، ص۔۱۱
(۵۷) ڈاکٹر سید عبدالباری، ادب بحیثیت ذہن ساز، نئی خوشبو نئے خواب، ص۔۱۳
(۵۸) ڈاکٹر سید عبدالباری، تخلیقیت اور اخلاقی اقدار، نئی خوشبو نئے خواب، ص۔۲۱
(۵۹) ڈاکٹر سید عبدالباری، استعمار اور سرمایہ داری کا عذاب شاعر مشرق کی نگاہ میں، نئی خوشبو نئے خواب، ص۔۵۴۔۵۵
(۶۰) ڈاکٹر سید عبدالباری، مولانا عبدالماجد دریا آبادی بحیثیت نقاد، نئی خوشبو نئے خواب، ص۔۱۰۱
(۶۱) ڈاکٹر سید عبدالباری، میر وفانی: ایک تقابلی مطالعہ، نئی خوشبو نئے خواب، ص۔۱۰۸
(۶۲) ڈاکٹر سید عبدالباری، آل احمد سرور کا سفر: نقد ونظر سے دانشوری تک، نئی خوشبو نئے خواب، ص۔۱۲۸
(۶۳) ڈاکٹر سید عبدالباری، حضرت شاد عارفی کا جہان فکروفن، نئی خوشبو نئے خواب، ص۔۱۵۲
(۶۴) ڈاکٹر سید عبدالباری، بہادر شاہ ظفر: شاعر اور مجاہد آزادی، نئی خوشبو نئے خواب، ص۔۱۵۶
(۶۵) ڈاکٹر سید عبدالباری، مظفر حنفی: روشنی نوک قلم شاخ پلک پر دیکھی، نئی خوشبو نئے خواب، ص۔۱۷۹
(۶۶) ڈاکٹر سید عبدالباری، کیفی کی شاعری اور ان کا تصور انقلاب، نئی خوشبو نئے خواب، ص۔۱۸۷
(۶۷) ڈاکٹر سید عبدالباری، حفیظ بنارسی: دل کا افسانہ بعنوان نظر کہتے ہیں، نئی خوشبو نئے خواب، ص۔۱۹۷
(۶۸) ڈاکٹر سید عبدالباری، اردو شاعری میں صیاد کا تصور، نئی خوشبو نئے خواب، ص۔۲۵۶
(۶۹) ڈاکٹر سید عبدالباری، ساحل سلطان پوری، نئی خوشبو نئے خواب، ص۔۲۶۰

(۷۰)ڈاکٹر سید عبدالباری، اودھ کی ثقافت، فلسفہ اور ادب۔ ماضی قریب تک، تراوش خیال، ص۔۱۶

(۷۱)ڈاکٹر سید عبدالباری، اقبال اور جمہوریت، تراوش خیال، ص۔۱۶۲

(۷۲)ڈاکٹر سید عبدالباری، غالب اور ان کے لکھنوی ہم عصر، تراوش خیال، ص۔۵۰

(۷۳)ڈاکٹر سید عبدالباری، فیض احمد فیض کا فکری وفنی بانکپن، تراوش خیال، ص۔۵۸

(۷۴)ڈاکٹر سید عبدالباری، میر تقی میر دورِ انحطاط میں انسان کی عظمت کا نغمہ گر، تراوش خیال، ص۔۹۶

(۷۵)ڈاکٹر سید عبدالباری، مولانا حسرت موہانی کے دینی افکار، تراوش خیال، ص۔۱۰۶

(۷۶)ڈاکٹر سید عبدالباری، مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی صحافت میں طنز و مزاح کی نشتریت، تراوشِ خیال، ص۔۱۲۰

(۷۷)ڈاکٹر سید عبدالباری، بیسویں صدی کا ایک انوکھا فنکار، تراوش خیال، ص۔۱۵۰

(۷۸)ڈاکٹر سید عبدالباری، نظیرا کبرآبادی، تراوش خیال، ص۔۱۷۲

(۷۹)ڈاکٹر سید عبدالباری، آنند نرائن ملا کا نظریہ شعروادب، تراوش خیال، ص۔۱۷۵۔۱۷۶

(۸۰)ڈاکٹر سید عبدالباری، صنوبروں کے شہر کا شاعر: سہیل احمد زیدی، تراوش خیال، ص۔۱۸۳

(۸۱)ڈاکٹر سید عبدالباری، نازش پرتاپ گڑھی، تراوشِ خیال، ص۔۲۰۵

(۸۲)ڈاکٹر سید عبدالباری، انور اعظمی: اسلامی ادب تحریک کے ابتدائی دور کا بلند آہنگ شاعر، تراوشِ خیال، ص۔۲۱۹

(۸۳)ڈاکٹر سید عبدالباری، ابوالمجاہد زاہد، شخصیت اور فن، تراوش خیال، ص۔۲۳۵

(۸۴)ڈاکٹر سید عبدالباری، حیرت شملوی، تراوش خیال، ص۔۲۴۲۔۲۴۳

(۸۵)ڈاکٹر سید عبدالباری، انسان کی تذلیل کے خلاف اردو شاعری کی صدائے پر خروش، تراوش خیال، ص۔۲۵۲

باب چہارم

سید عبد الباری کی نثری تخلیقات کا تنقیدی جائزہ

باب چہارم (الف)

ڈاکٹر سید عبدالباری کے خاکوں کا فنی وتنقیدی مطالعہ

خاکہ نگاری کا شمار سوانحی ادب میں کیا جاتا ہے۔اس میں کسی ایک شخص کی ظاہری اور باطنی شخصیت کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔اس کی زندگی سے متعلق اہم واقعات یا کسی یادگار پہلو کو پیش کیا جاتا ہے۔خاکہ نگاری میں صرف شخصیت کے مثبت پہلو کو ہی نہیں پیش کیا جاتا بلکہ منفی واقعات کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔تاہم اس کی خوبیوں اور خامیوں کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے اس کی مکمل تصویر نظر آنے لگے۔موجودہ عہد میں اس کی مقبولیت وانفرادیت اور عوام کی بڑھتی ہوئی دلچسپی اور اس کی مشترکہ پزیرائی نے خاکے کو اردو ادب کی اہم اور مقبول ترین صنف بنا دیا ہے،یہی وجہ ہے کہ خاکہ نگاری کا شمار اب ہمارے ادب کی ترقی یافتہ اصناف میں ہو رہا ہے۔

خاکہ نگاری کا فن اردو ادب میں انگریزی ادب کے زیر اثر مستقل طور پر رائج ہوا۔یہ انگریزی لفظ sketch سے مستعار ہے،جس کے معنی حاشیہ کھینچنا،نقشہ بنانا یا لکیروں کے ذریعے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں۔اس کے لئے دوسرا لفظ جو انگریزی میں رائج ہے وہ pen- portrial ہے،جس کے معنی قلمی تصویر بنانے کے ہیں۔اس کے برخلاف چند آڑے ترچھے خطوط کے ذریعے کسی شخصیت کی تصویر بنائی جائے اور لفظوں کے ذریعے اس کے خدوخال نمایاں کئے جائیں تو اسے sketch کا نام دیا جاتا ہے۔ہندی ادب میں اسے ریکھا چتر کا نام دیا گیا ہے۔اس لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ خاکہ نگاری صرف اردو ادب میں ہی مقبول نہیں ہے بلکہ انگریزی اور ہندی میں بھی اس کو یکساں مقبولیت حاصل ہے۔خاکہ نگار جب لفظوں کا سہارا لے کر کسی شخصیت کی تصویر کشی کرتا ہے تو اس کی ظاہری و باطنی دونوں کیفیت قاری کے ذہن میں اجاگر ہو جاتی ہے۔اس طرح اگر دیکھا جائے تو ایک مصور کی بنائی ہوئی تصویر کے مقابلے میں ایک خاکہ نگار کی بنائی ہوئی تصویر زیادہ موثر ہوتی ہے اور وہ قاری کے ذہن و دل کے لئے فرحت بخش بھی ہوتی ہے۔سید حامد حسین خاکہ نگاری کی ماہیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اسکیچ دراصل فن تصویر کشی کی ایک اصطلاح ہے اور اس سے نقوش کی وہ ابتدائی ترتیب مراد لی جاتی ہے جن سے مصور تصویر کا بنیادی خاکہ بناتا ہے اور جس میں رنگوں کے فرق اور ہلکے گہرے رنگوں کی ترتیب اور جزئیات کے اضافے کے ذریعے وہ اپنی تصویر مکمل کرتا ہے۔
>
> خاکہ کا لفظ ایک ایسی تحریر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو سرسری نوعیت کی ہو اور اس میں معنی اور خیال کے نہ زیادہ نشیب و فراز اور نہ تہیں۔''(۱)

غرض خاکہ نگاری وہ نثری تحریر ہے، جس میں نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں اشاروں اور کنایوں کا سہارا لے کر کسی شخصیت کا سراپا، اس کے عادات واطوار، رہن سہن اور طور طریقے کو نہایت سادہ انداز میں روانی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ان تمام خصوصیات کو خاکہ نگار کسی شخصیت کی زندگی سے متعلق چند گوشوں کو ایسے اجاگر کرتا ہے کہ قاری کو اس کی جیتی جاگتی اور حقیقی تصویر آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے لگتی ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے خاکہ نگاری کا فن اشاروں اور کنایوں کا آرٹ ہے، جس میں خاکہ نگار کو بڑے احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے، اس لئے بعض ناقدین نے اسے غزل اور افسانہ کے فن سے مشابہ قرار دیا ہے۔ جس طرح غزل اور افسانہ نگاری میں ذرا بھی جھول اور بے احتیاطی کلام کے معیار کو گرا دیتی ہے اسی طرح خاکہ نگاری کی ذرا سی چوک اور بے توجہی خاکہ نگار کو ایک صحافی یا سوانح نگار بنا دیتی ہے۔ یہاں کم سے کم لفظوں میں زیادہ معنی خیز باتیں کہی ہوتیں ہیں، جس طرح ایک شاعر کم لفظوں میں شعر کے ذریعے دنیا جہان کی باتیں کر دیتا ہے اسی طرح خاکہ نگار کو بھی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو جن کا کینوس کافی وسیع ہوتا ہے، اس کے چند گوشوں کی عکاسی کم سے کم الفاظ میں کرنی ہوتی ہے۔ جس طرح افسانے کا پلاٹ آپس میں گٹھا ہوتا ہے اسی طرح خاکہ میں بھی ایک پلاٹ ہوتا ہے اس میں اگر ذرا بھی جھول ہوگا خاکہ بے مزہ ہو کر رہ جائے گا۔ غرض ذرا بھی بے احتیاطی خاکہ نگاری کے فن کو مجروح کر دیتی ہے یہی وجہ ہے ناقدین نے اسے مشکل صنف قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

> ''خاکہ نگاری کا فن بہت مشکل فن ہے۔ اسے اگر نثر میں غزل کا فن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جس طرح غزل میں طویل مطالب بیان کرنے پڑتے ہیں، ٹھیک اسی طرح خاکے میں مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالی جاتی ہے''۔۲

اسی بات کو دوسرے انداز میں ڈاکٹر اشرف رفیع اس طرح سے لکھتے ہوئے واضح کرتے ہیں:

> ''غزل گوئی کی طرح خاکہ نگاری بھی ایک مشکل فن ہے، غزل کہنے کی کوشش میں ذرا سی بے احتیاطی اچھے خاصے شاعر کو مرثیہ گو بنا دیتی ہے اور ذرا سی لغرش ایک خاکہ نگار کو صحافی یا سوانحی نگار کا لیبل لگا دیتی ہے''۔۳

غرض خاکہ نگار جس شخصیت کو موضوع بناتا ہے، اس کے نمایاں اوصاف کو کم سے کم الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس سے خاکے کی دلکشی اور اس کی معنویت میں کسی طرح کی کمی کا احساس نہ ہونے پائے۔ یہ کام ذرا دقت طلب اور ایک خاص سلیقے کا محتاج ہے کیوں کہ خاکہ نگار شخصیت کے بہت سے پہلوؤں، اس کی زندگی کی مختلف جہتوں اور کئی طرح کے واقعات و تاثرات سے اپنی ضرورت کے چند واقعات کا انتخاب کرتا ہے اور پھر اس کی کوشش ہوتی ہے، ان واقعات کو کم سے کم الفاظ میں بیان کر کے قاری کو آئینہ مہیا کرا دے، جس میں شخصیت کا پورا جیتا جاگتا عکس نظر آتا ہے۔ گویا خاکہ نگار کسی شخصیت کی زندگی کے واقعات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ شخصیت کے تمام خد و خال اپنی ساری خوبیوں، خامیوں اور رعنائیوں کے ساتھ اپنی حقیقی رنگ میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ خاکہ نگاری سے متعلق ناقدین ادب نے مختلف خیالات بیان کئے ہیں، مناسب ہوگا ان کی آرا سے بھی استفادہ کیا جائے۔ خاکہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''اچھے اسکیچ کی تعریف یہ ہے کہ بعض گوشوں کی نقاب کشائی ایسی ماہرانہ نفاست کے ساتھ کی جائے کہ اس شخصیت کا خاص تاثر پڑھنے والے کے ذہن میں خود بہ خود پیدا ہو۔ اچھا خاکہ وہی ہے جس میں کسی انسان کے کردار اور افکار دونوں کی جھلک ہو۔ خاکہ پڑھنے کے بعد اس کی صورت، اس کی سیرت، اس کا مزاج، اس کے ذہن کی افتاد، اس کا زاویہ فکر، اس کی خوبیاں اور خامیاں سب نظروں کے سامنے آجائے۔''۴

ایک بہترین خاکے کی کیا خصوصیات ہونی چاہئے رفیع الدین ہاشمی نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

> ''ادبی اصطلاح میں خاکہ وہ تحریر یا مضمون ہے جو کسی شخصیت کا بھرپور تاثر پیش کرے۔ اسے کسی شخص کی قلمی تصویر بھی کہہ سکتے ہیں۔ خاکہ (sketch) کو شخصی مرقعہ یا شخصیہ بھی کہتے ہیں اور خاکہ نگاری کو شخصیت نویسی کا بھی نام دیا جاتا ہے۔ ایک اچھے خاکے میں ہم کسی شخص کے بنیادی مزاج اس کی افتادِ طبع اور اندازِ فکر و عمل اور اس شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے روشناس ہوتے ہیں۔''۵

خاکہ کی تعریف اسرائیل احمد صدیقی نے اپنی کتاب یادگار مرزا فرحت اللہ بیگ میں بہترین انداز میں کی ہے:

''اچھے خاکہ کی تعریف یہ ہے کہ کسی شخصیت کے کچھ پہلو اہم یا منفرد پہلو ایسی ماہرانہ نفاست کے ساتھ بیان کئے جائیں کہ قاری پر اس شخصیت کا مخصوص تاثر پیدا ہو جائے اور اس کے افکار و خیالات کی مخصوص جھلکیاں بھی دیکھنے کو مل جائیں۔ نیز خاکہ پڑھنے کے بعد متعلقہ شخصیت کی صورت، سیرت، مزاج، ذہن اسی کی خوبیاں اور خامیاں سب نظروں کے سامنے آ جائیں۔ خاکوں میں غیر ضروری تفصیل کی گنجائش بھی نہیں ہوتی۔٦

خاکہ نگاری کی وضاحت کرتے ہوئے یحیٰی امجد رقم طراز ہیں:

''خاکہ ایک تخلیقی صنف ادب ہے جس میں زندہ شخصیت گوشت پوست کا بدن لئے علمیت کی بھاری بھرکم عباؤں کو دم بھر کے لئے اتار، روزمرہ کے لباس میں نظر آتی ہیں اور ہم انہیں ویسے ہی دیکھتے ہیں جیسا کہ وہ سچ مچ تھے۔ نہ کہ جیسا بننا چاہتے تھے یا جیسا ظاہر کرتے تھے۔''٧

اس طرح داکٹر صابرہ سعید نے اپنی کتاب ''اردو ادب میں خاکہ نگاری'' اور ڈاکٹر عائشہ طلعت نے ''اردو میں خاکہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ'' میں خاکہ نگاری سے متعلق نقادوں اور اس صنف کے ماہرین کی آرا پیش کیں ہیں جس کو مختصر انداز میں پیش کرنے کی جسارت کرتے ہوئے بحث کو مدلل بنانے کی سعی کی جائے گی:

''نثار احمد کے بموجب ''شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے''۔ آمنہ صدیقی لکھتی ہیں ''سوانح نگاری کی بہت سی صورتیں ہیں ان ہی میں سے ایک خاکہ ہے۔'' یہ دراصل مضمون نگاری کی ایک قسم ہے۔ جس میں کسی شخصیت کے نقوش کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ جن کے امتزاج سے کسی کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔'' محمد حسین لکھتے ہیں کہ ''نوکِ قلم کی تصویر کشی خاکہ نگاری ہے۔'' شمیم احمد کرہانی لکھتے ہیں کہ ''خاکہ نگاری ادب کی ایک صنف ہے، جس میں شخصیتوں کی تصویریں اس طرح براہِ راست کھینچی جاتیں ہیں کہ ان کے ظاہر و باطن دونوں قاری کے ذہن نشین ہوجاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پڑھنے والے نہ صرف قلمی چہرہ دیکھا ہے خود نوشت کو دیکھا بھالا سمجھا بوجھا ہو۔''٨

مختلف ماہرین کی آرا کو پیش نظر رکھتے ہوئے خاکہ نگاری کی مختصر تعریف یہی کی جاسکتی ہے کہ خاکہ نگاری کم سے کم لفظوں میں کسی شخصیت کی چلتی پھرتی تصویر کشی کا نام ہے، جس سے اس کا ظاہر و باطن ہمارے سامنے پیش ہو جائے اور پڑھنے والا اس شخصیت سے اچھی طرح متعارف ہو جائے۔ غرض خاکہ نگاری کسی شخصیت کی بھرپور نمائندگی اور اس کے اصلی رنگ کو دیکھنے کی کامیاب کوشش ہے، اس لئے اگر خاکہ نگاری کو کسی شخصیت کی دریافت بھی کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا۔ خاکہ نگاری سے ملتی جلتی اصناف سوانح عمری، انشائیہ اور خودنوشت ہیں بلکہ خاکہ نگاری سوانحی عمری اور خودنوشت کا ہی ایک حصہ ہے، جس کے ابتدائی نقوش ان اصناف میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مگر یہ صنف اپنے ایجاز و اختصار کی بنیاد پر جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ سوانح نگاری اور خودنوشت میں کسی شخصیت کی زندگی کے تمام پہلوؤں اور تمام واقعات حتیٰ کہ اس کے عہد کے سیاسی و سماجی پس منظر وغیرہ کو تفصیل سے لکھا جاتا ہے جبکہ خاکے میں اس کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ خاکے میں کسی شخصیت اور اس کی زندگی سے متعلق چند گوشوں اور منفرد پہلوؤں کو ہی فن کارانہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے، جس سے قاری محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ اس سے متعارف بھی ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سعیدہ صابرہ دونوں کا فرق واضح کرتی ہوئی لکھتیں ہیں:

''سوانح نگار کو اپنی موضوع کی شخصیت اور کارناموں کو واضح طور پر پیش کرنا پڑتا ہے۔ خاکہ ایسی کسی وضاحت یا تفصیل کا متحمل نہیں ہوتا ہے۔ سوانح نگار کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ہیرو کو ایک انسان کی حیثیت سے پیش کرے۔ اس کی شخصیت کے تمام پہلو پوری طرح واضح ہوں، تاکہ اس کا ہیرو ایک جیتا جاگتا انسان معلوم ہو، اور وہ اپنی انفرادیت کی تمام گہرائیوں اور داخلیت کی ساری وسعتوں کے ساتھ قاری کے ذہن پر نقش ہو جائے۔''۹

خاکہ نگاری کا فن جہاں سوانح عمری اور خودنوشت کے فن سے ملتا جلتا ہے وہیں مختصر افسانے اور انشائیہ میں بھی اس کی چند جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مگر افسانہ میں جس کردار کو پیش کیا جاتا ہے، اس کا حقیقت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اس کے کردار کو افسانہ نگار اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر یا کم تر پیش کر سکتا ہے، مگر خاکہ نگاری میں جس کردار کو پیش کیا جاتا ہے، اس میں کسی بھی طرح کی آمیزش ممکن نہیں ہے۔ خاکہ نگاری سوانح نگاری اور افسانہ نگاری تینوں فن آپس میں مشابہت رکھتے ہیں اس فرق کو سید حامد حسین واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خاکہ نگاری کی سرحدیں اس طرح ایک طرف سوانح نگاری سے ملتی ہیں تو

دوسری طرف افسانہ نگاری سے۔ چنانچہ ایک اچھا خاکہ، سوانح اور افسانے کے بین بین رہتا ہے۔ اس میں اگر سوانح کی مطلق قسم کی حقیقت پسندی اور سائنٹفک انداز کی ایک طرف کمی ہوتی ہے تو دوسری طرف اس میں افسانے کے تخیلی بیان کی۔ لیکن سوانح نگار کی خاکہ نگار کی توجہ ایک واضح شخصیت پر ہوتی ہے اور ایک افسانہ نگار کی توجہ کسی ایک مخصوص ذہنی کیفیت یا زندگی کے کسی ایک مخصوص پہلو کی مکمل تصویر ہوتا ہے۔ خاکہ کئی چھوٹی چھوٹی کیفیات سے مرتب زندگی کا رنگ اور کردار اور کردار کا پہلو دار نقش ہوتا ہے اس نوعیت سے اپنے اسلوب میں خاکہ بڑی حد تک انشائیے کے قریب ہوتا ہے۔ جس طرح انشائیہ مصنف کے ذہن کی ترنگ اور اس کے تخیل کے بے روک بہاؤ سے اپنا کیف و جمال حاصل کرتا ہے، اسی طرح خاکہ ایک خاص کردار میں مصنف کی شخصیت کی شخصی دلچسپی اور شخصی تاثرات کا بے تکلفانہ اظہار ہے۔ اسی مناسبت سے کبھی کبھی خاکے میں مزاح کے چھینٹے بھی مل سکتے ہیں۔ کبھی اس میں توصیف کا رنگ بھی مل سکتا ہے، کبھی تعجب کا احساس داخل ہو سکتا ہے اور کبھی رحم و ہمدردی کے جذبات کی آمیزش ہو سکتی ہے۔'' ۱۰

مذکورہ بالا تمام نقطۂ نظر کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے خاکہ نگاری کا تعلق سوانحی ادب سے ہے، جس کے ڈانڈے سوانح نگاری سے ملتے ہیں۔ لیکن دونوں کے متضاد پہلو ہیں سوانح طوالت کا متقاضی ہوتا ہے جبکہ خاکہ میں اختصار کے ساتھ شخصیت کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ ان تمام خصوصیات کا جائزہ لینے کے بعد اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ موجودہ عہد میں خاکہ نگاری کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے کیا اسباب و محرکات ہیں۔ دراصل موجودہ عہد میں جب انسان کی مصروفیت بڑھ گئی اور انٹرنیٹ اور سوشل نیٹورکنگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے سبب لوگوں کو وقت کی کمی کا احساس ہونے لگا، اس کے اثرات ہمارے ادب پر خاص طور سے رونما ہوئے، جس طرح طویل داستان گوئی کی جگہ ناولوں نے لے لی اس کے بعد جب انسان کی مصرفیت اور بڑھی پھر ہمیں احساس ہوا کہانی یا قصے کو مختصر کر کے لکھا جائے، جسے قاری ایک ہی نشست میں سر کر سکے، نتیجہ کے طور پر مختصر افسانے کا رواج عام ہوا۔ موجودہ عہد میں اس کا اثر نہ صرف افسانوی ادب پر نمایاں ہوا بلکہ غیر افسانوی ادب پر بھی رونماں ہوا۔ چناچہ ہمارے ادب میں جہاں طویل سوانح نگاری یا خودنوشت نگاری کا رواج عام تھا رفتہ رفتہ اس کی جگہ خاکوں نے لینا شروع کر دیا تاہم آج یہ صنف اپنے اختصار و ایجاز کی وجہ سے عوام و خواص میں کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔

خاکہ نگاری کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔ یہ انگریزی ادب کے اثر سے بیسوی صدی میں اردو ادب میں رائج ہوئی۔اس کے ابتدائی نقوش اردو شعرا کے تذکروں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔محمد حسین آزاد نے اپنے تذکرہ ''آبِ حیات'' کے ذریعے اس جانب اردو ادیبوں کو متوجہ کیا۔اس تذکرے میں آزاد نے متعدد شعرا کے خاکے کھینچنے کی کوشش کی ہے۔جس میں میر، غالب، ذوق، مومن اوراس عہد کے تمام شعرا کی ایسی عکاسی ملتی ہے کہ تمام باتیں حقیقی اور کردار کافی متحرک معلوم ہوتے ہیں۔آزاد نے اس عہد کے مشاعروں آپسی نوک جھونک ،سیرت ،ادبی معرکے، سیرت اور اخلاق کی تصویر کشی کچھ اس انداز میں کی ہے کہ سبھی شخصیات کی تصویریں آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔شیخ ابراہیم ذوق کا خاکہ جس انداز میں لکھا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے ہم انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب ان کے حسن کی تعریف بیان کرتے ہوئے چیچک کے داغوں کی تعریف کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے واقعی یہ کوئی عیب نہیں ہے۔آزاد کی ایک خصوصیت ان کی رواں دواں اور شگفتہ نثر بھی ہے،جس کے متعلق شبلی نے کہا تھا وہ گپ بھی ہانکتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔ان کا اسلوب بھی اس کی مقبولیت کا ایک اہم سبب ہے۔محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں جو مرقع پیش کیا ہے، اس کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے یحییٰ امجد رقم طراز ہیں:

> ''ان سے (آزاد) سے جہاں تک ہو سکا ہے شاعروں کی شکل وصورت، ان کی جسامت ،لباس، وضع قطع ،تراش خراش غرض کہ ہیئت کذائی کے ہر پہلو کو پیش کر دینے کی کوشش کی ہے۔اس ضمن میں ان کی توجہ چہرہ نویسی سے زیادہ لباس پر رہی ہے، جس شاعر کے لباس کے متعلق ان تک تفصیلی روایات پہنچ گئی ہیں، ان کو گویا تصویر کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔لباس کے تمام اجزا کا ذکر ہے اور بھرپور نہیں کہ یہ تفصیلی ذکر ٹھیئٹر کا رجسٹر بن جائے بلکہ پورا ادبی حسن لئے ہوئے اور دلچسپی کی دولت سے معمور شاعر کی شخصیت پیش کرتے وقت بھی آزاد نے فقروں کے ایجاز واختصار ،اسلوب کے حسن و جمال اور الفاظ کے برمحل استعمال سے ایک سماں باندھ دیا ہے۔تمام شاعر واقعی ہمیں پہلی بار چلتے پھرتے بولتے چالتے اور زندہ گوشت پوشت کے انسان نظر آتے ہیں۔''[11]

یہ الگ بات ہے ناقدینِ فن نے آب حیات کو مکمل خاکہ ماننے سے انکار کیا ہے، مگر اس کے ابتدائی نقوش اس میں واضح طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔آزاد کے بعد ۱۹۲۷ء میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' لکھ کر خاکہ نگاری کا مکمل آغاز کیا اور خاکہ نگاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔اس کے

بعد رشید احمد صدیقی نے ''گنج ہائے گراں مایہ'' ۱۹۷۵ء میں اور دوسرا خاکوں کا مجموعہ ''ہم نفسانِ رفتہ'' ۱۹۶۶ء میں لکھ کر خاکہ نگاری کے فن کو وسعت بخشی۔ پھر مولوی عبدالحق کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' ۱۹۳۷ء میں منظرِ عام پر آیا، جس کی وجہ سے ان کی شناخت ایک خاکہ نگاری کی حیثیت سے ہونے لگی اور اس فن میں انہیں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، اشرف صبوحی اور شوکت تھانوی نے خاکہ نگاری کی روایت کو بخوبی آگے بڑھایا۔

اردو خاکہ نگاری کے فن کو معراج عطا کرنے میں سعادت حسن منٹو کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ منٹو نے متعدد شخصیتوں کے خاکے قلم بند کئے، ان کے خاکوں کے مجوعے'' گنجے فرشتے''، ''لاوَڈ اسپیکر'' اور'' شخصیتیں'' بے حد مقبول ہیں۔ منٹو کے خاکوں نے ایک منفرد لب و لہجہ اختیار کیا اور افسانوی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی، اپنے اسلوب اور طرزِ بیان کے باعث منٹو نے خاکہ نگاری میں منفرد شناخت قائم کی۔ منٹو کی خاکہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے انور سدید نے لکھا ہے:

> ''انہوں نے'' گنجے فرشتے'' اور'' لاوَڈ اسپیکر'' کے خاکوں میں شخصیت کو صابن سے دھو کر اور اجلے کپڑے پہنا کر پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، انہوں نے برملا لکھا کہ وہ آغا حشر کی بھینگی آنکھ کو سیدھا نہیں کر سکے اور میرا جی کی ذلالت پر ان سے استری نہیں ہو سکی۔ باری علیگ، اختر شیرانی، اشوک کمار، اور نور جہاں کو منٹو نے جس طرح بے آرائش اور حقیقی انداز میں پیش کیا ہے اس سے منٹو کی بے رحم حقیقت نگاری کا ایک خصوصی زاویہ سامنے آتا ہے اور اسی سے خاکہ نگاری میں ان کی منفرد حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔'' ۱۲

سعادت حسن منٹو نے فن خاکہ نگاری کو مزید پروان چڑھایا اور اسے حقیقت نگاری سے روشناس کرایا، اس کے بعد عصمت چغتائی نے اسے جلا بخشی۔ مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین نے طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں خاکے لکھ کر انشائیہ نما خاکوں کو فروغ دیا۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے اس فن کو فروغ دیا ان میں شاہد احمد دہلوی، فکر تونسوی، محمد طفیل، ممتاز مفتی، ضمیر جعفری، مختار مسعود، مالک رام، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان سبھی شخصیات نے خاکہ نگاری کے فن کو جزوی یا کلی طور پر اپنایا اور اس کے ارتقائی نشو و نما میں قابلِ قدر اضافے کئے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کا شمار تعمیری ادب کے اسکالر میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اسی نقطۂ نظر سے ادب کو

پرکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔عبدالباری کی شناخت اردوادب میں ایک محقق، دیدہ ور نقاداور صحافی کی حیثیت سے ہوتی ہے،مگرانہوں نے خاکہ نگاری کےفن پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔انہوں نے نہ صرف اس فن کو مستقل طور پر اپنایا بلکہ اس صنف میں بھی وہ اپنے پیش رواور ہم عصر خاکہ نگاروں سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری اپنی زندگی کے آخری تیس چالیس برسوں میں متعدد خاکےقلم بند کئے ہیں جو سوانحی خاکے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے خاکوں کا مجموعہ ''انوکھے لوگ نرالی باتیں''۲۰۰۹ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔جس میں انہوں نے بیسوی صدی کی کچھ عظیم شخصیتوں کے خاکےاوران کے خیالات وافکاراور ذہنی ارتقا کی تصویر کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔عبدالباری صاحب نے جن شخصیتوں کا خاکہ لکھاہے اس میں سے زیادہ تر کا تعلق تعمیری ادب سے یا اسلامیات سے ہے۔اس کے علاوہ وہ شخصیتیں بھی ہیں جنہوں نے جنگ آزادی میں کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

> ''یہ مضامین شخصیات کے زینہ زینہ ارتقا سے زیادہ اس مجموعی کیفیت کو پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی شخصیت اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہوتی ہے۔میں نے پوری کوشش کی ہے کہ مبالغہ آرائی سے بچتے ہوئے بے کم وکاست شخصیتوں کے کارناموں اور امتیازات پر روشنی ڈالی جائے۔۱۳

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے ڈاکٹر سید عبدالباری نے شخصیتوں کو پیش کرتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لیا ہے اور یہ صحیح بات بھی ہے۔اپنے خاکوں میں انہوں نے جن شخصیات سے متعلق کوئی بھی واقعہ پیش کیا ہے، اس میں ان کے دقیق مطالعے کی کارفرمائی ہر جگہ نمایاں ہوتی ہے۔''انوکھے لوگ نرالی باتیں''میں کل خاکوں کی تعداد ۲۰ ہے،جس کی ضخامت ۲۸۰ صفحات پر منحصر ہے۔جس میں مختلف سیاسی و مذہبی شخصیات کے خاکےاوران کے کارناموں کو پیش کیا گیا ہے۔عبدالباری صاحب نے جن شخصیتوں کے خاکے پیش کئے ہیں ان میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی،سید ابوالاعلیٰ مودودی،مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں،ڈاکٹر سید حامد(وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)،مولا نا ابوالکلام آزاد،سید ابوالحسن علی ندوی،حسرت موہانی،علامہ آیت اللہ خمینی،ابوالمحاسن، مولانا سید محمد سجاد،مولانا صدرالدین اصلاحی،مولانا عبدالماجد دریا آبادی،ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی،قاضی مجاہدالاسلام قاسمی،قاضی محمد عدیل عباسی،مولانا انعام الرحمٰن خاں،حکیم خواجہ اقبال احمد ،مولانا سید حامد علی،مولانا سلمان ندوی،اورعبدالحفیظ کے نام شامل ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے خاکوں

میں ہندوستان کی ان عظیم شخصیتوں کو ''انوکھے لوگ نرالی باتیں'' میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ان خاکوں میں پیش کردہ شخصیتوں کے کارنامے یقیناً آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔اسلاف کے کارناموں سے نئی نسل کو آگاہ کرنا اور پرانی تہذیبی وثقافتی قدروں کو نئی نسل تک پہچانا ایک اہم فریضہ ہے، جس کو عبدالباری صاحب نے بخوبی انجام دیا ہے۔عبدالباری نے اسلاف کے کارناموں سے نئی نسل کو نا صرف واقف کرایا ہے بلکہ مختلف شعبوں کی مثالی شخصیتوں کے حالات پیش کر کے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے اپنا پسندیدہ آئیڈیل تلاش کرنے کی سہولیت بھی فراہم کر دی ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کے یہ خاکے نہ صرف شخصیتوں کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں بلکہ یہ نئی پرانی نسل کے درمیان جو خلا پیدا ہو رہا ہے اس کے مابین ایک کڑی ہے۔ان خاکوں میں شخصیت اور ان کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔اس لئے ان کی ایک سیاسی وسماجی افادیت بھی ہے۔زیادہ تر خاکے ایسی شخصیتوں کے ہیں جنہوں نے نامساعد حالات کا سامنا بڑی خندہ پیشانی سے کیا اور کسی ذاتی مفاد یا دنیاوی مفاد کے لئے اپنے اصولوں سے سمجھوتا نہیں کیا۔یہ وہ شخصیتیں ہیں جنہوں نے مسلسل جدوجہد کے ذریعے بلند مقامات حاصل کئے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی کے خاکے موجودہ عہد کے لئے قابلِ تقلید اور مثالی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اختصار خاکہ نگاری کی سب سے اہم خصوصیت ہے، بلکہ کم لفظوں میں زیادہ بات کرنے کا فن ہے ۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے خاکوں کی یہ اہم خصوصیت ہے انہوں نے ایجاز واختصار کا سہارا لیتے ہوئے شخصیت کے خدوخال اور اس کی زندگی کے انوکھے اور اہم واقعات کو فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے، جس سے شخصیت کی سیرت کی جھلکیاں اپنی دلکشی کے ساتھ نمایاں ہوگئیں ہیں۔عبدالباری نے اختصار کی خصوصیت ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے بھی خاکے لکھے ہیں جو کافی طویل ہیں مگر اس میں جو واقعات بیان کئے گئے، اس میں انہوں نے اختصار سے کام لیا ہے۔دراصل خاکہ نگار کی ایک کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ شخصیت کی زندگی سے متعلق کوئی اہم واقعہ چھوٹ نہ جائے، یہی سبب ہے اس کی طوالت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔دوسری خاص بات یہ ہے خاکہ نگار سے کسی شخصیت سے بے پناہ قربت بھی خاکہ کی طوالت کا سبب بنتی ہے یہی سبب ہے عبدالباری صاحب کے کئی خاکے کافی طویل ہو گئے ہیں مگر اس میں کسی بھی طرح کا جھول نظر نہیں آتا۔مثال کے طور پر مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا مودودی کے علاوہ اور دو چار خاکے کافی طویل ہیں مگر عبدالباری نے اس میں اپنی فنکارانہ

صلاحیت کا اظہار کرتے ہوئے کہیں بھی غیر ضروری واقعات اور بے جا طویل مباحث و مسائل کو بیان نہیں کیا ہے، جس سے ان خاکوں میں کہیں بھی قاری کو الجھن یا بوریت محسوس نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کی دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے اور وہ ایک نشست میں ان خاکوں کو با آسانی پڑھ سکتا ہے۔ دراصل ڈاکٹر عبدالباری نے اہم اور انوکھے واقعات کا انتخاب، اس کی ترتیب عمدہ انداز میں پیش کر کے اس کی دلکشی کو برقرار رکھا ہے۔ خاکہ کی طوالت سے متعلق ڈاکٹر صابرہ سعید لکھتی ہیں:

> ''ایک طویل خاکہ کسی شخصیت سے زیادہ قربت کے نتیجے میں وجود پذیر ہوسکتا ہے۔ شخصیت سے قربت خاکہ نگار کے قلم کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ پیش کردہ شخصیت کی کوئی گفتنی بات نظر انداز نہ کرے۔ کبھی اپنے ہمدردانہ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ یہ بھول جاتا ہے کہ ایک انسان کی زندگی میں جتنی باتیں اہمیت کی حامل ہوتی ہیں اس سے کہیں زیادہ تفصیلات غیر اہم اور معمولی بھی ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں خاکہ نگار ان نکات اور منفرد خصوصیات کے انتخاب میں خود کو معذور پاتا ہے۔ جس کے سبب ایک طویل خاکہ وجود میں آتا ہے۔ انتخاب اور ایجاز کے باوصف اگر خاکہ طویل ہو جاتا ہے، تو یہ عیب نہیں ہے۔'' ۱۴

ڈاکٹر صابرہ سعید کے اس اقتباس کے مطالعہ سے یہ بات صاف ہوگئی کہ خاکہ کی طوالت کوئی عیب نہیں ہے اور یہ بات سہی بھی ہے کہ ڈاکٹر عبدالباری نے جن شخصیات کے طویل خاکے لکھے ہیں انہیں ان سے بے حد عقیدت اور محبت تھی جس کا جیتا جاگتا ثبوت ان کی تمام تحریریں ہیں، جن میں ان شخصیات کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ان کا کوئی بھی مضمون ہو اس میں انہوں نے ان بزرگوں سے ضرور استفادہ کیا ہے۔ یہاں کہنے کا مقصد یہی ہے کہ عبدالباری نے اپنے متعدد خاکوں میں طوالت کو نظر انداز ضرور کیا ہے مگر اس میں کسی بھی طرح کی بد مزگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

خاکہ میں نگاری میں وحدتِ تاثر کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں خاکہ نگار کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے، وہ تمام واقعات کو آغاز سے آخر تک ایک لڑی یا زنجیر کی کڑی کی مانند آپس میں جوڑ کر رکھے، جس سے اس میں تسلسل برقرار رہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ خاکہ نگار تمہید، درمیانی حصے اور خاتمے کو اس خوبی کے ساتھ دوسرے واقعات سے جوڑ کر پیش کرے کہ ایک خاص طرح کا تاثر جو قاری کے ذہن میں مرتب ہوتا ہے وہ

شروع سے آخر تک قائم رہے۔عبدالباری صاحب کے تمام خاکوں میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود ہے، جس سے ان کے خاکوں کا قاری کے ذہن پر واحد تاثر مرتسم ہوتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے ان کے خاکوں میں یہ نقش کہیں دھندلا اور کہیں بہت گہرا معلوم ہوتا ہے، مگر زیادہ تر خاکوں جیسے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا صدرالدین اصلاحی کے خاکوں میں ان کے تاثر کا رنگ کافی کثیف معلوم ہوتا ہے، جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبدالباری نے کامیابی کے ساتھ قاری پر اپنا تاثر قائم کردیا ہے۔اس کی مثالیں ان کے تمام خاکوں میں جابجا دیکھنے کو ملتی ہیں۔مثال کے طور پر مولانا صدرالدین اصلاحی کے خاکے سے ان کا یہ تاثر دیکھئے:

> ''رام پور میں مولانا کا قیام دس پندرہ سال رہا جہاں عمر کی چالسویں اور پچاسویں منزلیں طے کیں۔ جب دیکھئے وہی ایک سیاہ شیروانی وہی ایک ٹوپی معمولی سفید لٹھے کا پاجامہ مگر شیروانی کی بوسیدگی کا اثر ذرہ برابر شخصیت پر نظر نہ آتا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے بانکپن اور جاہ وجلال میں اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔اس شیروانی کی اوپری سطح نے طویل رفاقت کے بعد جب ساتھ چھوڑنا چاہا تو مولانا نے اسے اس کی اجازت نہ دی اور اس کو ادھڑوا کر اندر کے رخ کو باہر لانے اور ان کی فکر کی طرح تر وتازہ بنے رہنے پر مجبور کردیا۔اگر چہ بائیں طرف کے کاج داہنی جانب آجاتے اور رفو ہو کر اس غریب نواز شیروانی کا خط تقدیر بن کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے۔محسوس ہوتا ہے کوئی فعفور و خاقان ادائے بے نیازی اور شان وتمکنت کے ساتھ محوِ خرام ہے۔''[۱۵]

مولانا صدرالدین اصلاحی کی شخصیت کے اس اقتباس کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کے ذہن میں ان کی شخصیت کے متعلق جو تاثر قائم ہوتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبدالباری نے قاری پر اپنا تاثر جمانے میں خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔ڈاکٹر عبدالباری نے خاکوں میں جن کرداروں کو پیش کیا ہے، وہ عمدہ اور مثالی کردار ہیں جن میں زندگی کی حرکت وحرارت موجود ہے، یہی وجہ ہے یہ کردار ذہن میں تاثر پیدا کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتے۔عبدالباری صاحب کے خاکوں کے کردار مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مودودی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریا آبادی، مولانا ابوالحسن ندوی وغیرہ ایسی شخصیتیں جو اپنی خوبیوں، خامیوں اور متضاد خصوصیات اور منفرد صفات اور مختلف رنگوں کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں۔''انوکھے لوگ نرالی باتیں''، میں جتنی بھی شخصیتوں کے کردار واوصاف، ان کی زندگی کی سیاسی وسماجی سرگرمیاں اور ان کے افکار و

خیالات کو پیش کیا گیا ہے،ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبدالباری صاحب انسانی نفسیات کے بہت بڑے نباض ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان سبھی شخصیات کے جذبات ،احساسات ،ان کی ذہنی کشمکش اور کیفیات کی عکاسی اس انداز میں کی ہے ،جس سے اس شخص کی زندگی کے رنگ وروپ ،وضع قطع ،عادات و اطوار کی ایسی موثر جھلک دکھائی دیتی ہے کہ وہ شخص اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ پڑھنے والے کی نگاہوں کے سامنے دکھائی دینے لگتا ہے۔اپنے اس مخصوص اندازِ بیان سے وہ قاری کے ذہن میں گہرا تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ان کی کردار نگاری کا اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

''امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ملت اسلامیہ ہند کی آرزؤں کے محور اور ایک روشن مستقبل کے پیامبر تھے۔وہ اس صدی کی ان عظیم شخصیتوں میں سے تھے جنہوں نے بر صغیر کے سیاسی مستقبل کی تشکیل میں حصہ لیا اور گزشتہ دو تین نسلوں کے ذہن و دماغ پر غیر معمولی اثرات مرتب کئے۔قدرت نے انہیں بے مثل دماغ اور لاثانی قوتِ فکر و عمل سے نوازہ تھا مگر یہ ملک وملت کی بدنصیبی تھی کہ ان کی ذہنی وفکری توانائیوں کو بروئے کار لانے میں ان کی معاون نہ بن سکی اور ان سے پوری طرح فیضیاب نہ ہوسکی۔۱۶

مولانا آزاد کے کردار کو عبدالباری صاحب نے جس سلیقے سے پیش کیا ہے،اسی طرح انہوں نے اپنے خاکوں میں سبھی کرداروں کی بھرپور عکاسی کی ہے، جس سے وہ بالکل فطری اور ارتقائی کردار معلوم ہوتے ہیں۔کردار نگاری کے ساتھ ساتھ انہوں نے ان سے متعلق تمام واقعات کو ترتیب دینے میں اپنی ذہانت اور بڑی مشقت وذکاوت کا ثبوت پیش کیا ہے۔انہوں نے شخصیت سے متعلق انہیں واقعات کو فوقیت کی دی ہے، جو کافی اہم اور منفرد ہیں،جن سے ابھی تک عوام روشناس نہیں ہوئی تھی،ان کے خاکوں میں کچھ ایسے واقعات بھی ہیں،جن سے واقعی ہم ابھی تک آشنا نہیں تھے اور مطالعے کے وقت شخصیت کی زندگی سے متعلق نئے گوشے وا ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔مثال کے طور پر حسرت موہانی کی شخصیت سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوتا ہے عبدالباری نے حسرت کی شخصیت سے متعلق نئے گوشوں کو کس انداز میں اجاگر کیا ہے:

''آزادی کے بعد جب ہندوستان میں مسلمانوں کا عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تو حسرت موہانی نے پارلیمنٹ میں اس کے خلاف آواز بلند کی اور سردار پٹیل جیسے آہنی انسان سے ٹکر لی اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ ولزلی اور کلایو کے جانشین معلوم ہوتے

ہیں‘‘۔۱۹۵۰ء میں دستور ہند تیار ہوگیا اور اسے نامنظور کرنے کی واحد صدا جو دستور ساز اسمبلی میں گونجی وہ حسرتؔ کی تھی۔ وہ آزادی کے بعد کچھ لوگوں کی اس تجویز کے سخت مخالف تھے کہ مسلمان سیاست سے کنارہ کش ہو کر اپنی عافیت کی فکر کریں اور بڑی قومی جماعتوں میں آنکھ بند کر کے شامل ہو جائیں۔‘‘ ۱۷

یہ وہ واقعہ جس سے اندازہ ہوتا ہے حسرت موہانی مولانا آزاد کے نظریوں کے مخالف تھے، یہ واقعہ قاری کو حیرت واستعجاب میں ڈال دیتا ہے اور ہم حسرت کی شخصیت کے ایک نئے گوشے سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔عبدالباری صاحب نے جتنی بھی شخصیتوں کے خاکے پیش کیے ہیں اس میں ان کی زیادہ تر کوشش یہی رہی ہے کہ شخصیتوں کے اسی گوشے کو اجاگر کیا جائے جو ابھی تک پنہاں ہیں اور انفرادیت سے پر ہیں۔اس مرحلے میں انہوں نے واقعات کے انتخابات اور ان کے ربط اور تسلسل و توازن کا بطورِ خاص خیال رکھا ہے۔ان کے خاکوں میں کہیں بھی بے ربطی کا احساس نہیں ہوتا اور ہر واقعے کی کڑی دوسرے واقعے سے ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔عبدالباری صاحب نے ان واقعات کو تسلسل اور روانی کے ساتھ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری کو یہ تمام چیزیں آنکھوں کے سامنے رونما ہوتی ہوئی دکھائی دینے لگتی ہیں اور یہ ایک بہترین خاکے کی شناخت بھی ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان خاکوں میں جن شخصیات کو مصورانہ انداز میں پیش کیا ہے، ان سے جڑے ہوئے تمام واقعات کی منظرکشی بھی بہترین الفاظ میں کی ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عبدالباری صاحب جس مقام یا واقعے کا بیان کر رہے ہیں ہم خود بھی وہیں موجود ہیں اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔انہوں نے منظرکشی کے اچھوتے انداز سے خاکوں میں روح پھونک دی ہے اور ان میں حد درجہ شگفتگی اور دلکشی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ابوالمحاسن مولانا سید محمد سجاد کے عہد کا پس منظر بیان کرتے ہوئے انہوں نے جو منظرکشی کی ہے اس کی چند جھلکیاں آپ بھی دیکھ سکتے ہیں:

’’بیسوی صدی کا ربع اول ہماری ملی و بین الاقوامی تاریخ کا عجیب دور تھا۔کیسی کیسی چنگاریاں ملت اسلام کی خاکستر میں خوابیدہ تھیں جو شعلہ جوالہ بن کر سامنے آرہیں تھیں۔کیسے کیسے ولولے سینوں میں آتش سوزاں بن کر دہک رہے تھے۔کیسی کیسی خوفناک آندھیاں اسلام کو مٹانے میں اور ملت اسلامیہ کا شیرازہ پراگندہ کرنے کے لئے سر پٹک

رہی تھیں کہ جن کی یورش نے بڑے بڑوں کے قدم اکھاڑ دیئے تھے۔پہلی جنگ عظیم کے بعد دول یورپ مسلم حکومتوں کی تکا بوٹی کرنے پر لگے ہوئے تھے۔مسلمانان عالم کی آنکھیں نمناک تھیں کہ وہ کلاہ لالہ رنگ جوتر کی کے غیرت مند جاں بازوں کے سروں پر تھی وقت کے تھپیڑوں نے اسے خاک میں ملا دیا۔مغرب کی مکارانہ چالوں کی وجہ سے عالم اسلام کو دم لینے کی مہلت نہ تھی۔جگہ جگہ افریقہ ہو یا ایشیا یورپ کے ہاتھوں اسلام کے خلاف محاذ جنگ کھلا ہوا تھا خواہ تہذیبی وفکری ہوخواہ عسکری ہر پہلو سے یلغار جاری تھی۔

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

برصغیر میں اب یہ منزل یہ آگئی تھی کہ جلیانوالہ باغ سے ملک کی سامراجی طاقتوں نے خونریزی کا ایک خوفناک سلسلہ شروع کردیا۔ہندوستان میں بسنے والے مختلف العقائد اور رنگا رنگ تہذیب کے حامل افراد میں اختلافات کو ہوا دینے کی پرزور کوششیں جاری تھیں۔مسلمان پورے عالم میں افسردہ خاطر اور مایوس تھا۔'' ۱۸

اس اقتباس کو پڑھتے وقت ہمارے ذہن میں اس عہد کی تصویر ابھرنے لگتی ہے۔عبدالباری صاحب نے اپنے بیش تر خاکوں میں منظرکشی کرتے وقت اشعار کا سہارا لیا ہے،جس سے ان کے خاکوں کی معنویت اور دلکشی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے سبھی خاکوں کو بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے، جو خاکہ نگاری میں ایک وصف کی حیثیت رکھتی ہے۔انہوں نے زبان و بیان کا سہارا لے کر شخصیت کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ان کے منفرد اندازِ بیان ، اسلوب اور لب ولہجے کے سبب سبھی کردار متحرک نظر آتے ہیں اور تمام واقعات جاندار معلوم پڑتے ہیں۔انہوں نے اپنے اندازِ بیان میں زور پیدا کرنے کے لئے موزوں الفاظ ،حسین تشبیہات واستعارات اور دوسری صنعتوں کا سہارا لے کر اپنی تحریر کو مزین کیا ہے،جس سے شخصیت کی دلکشی کے ساتھ ساتھ خاکے میں ادبی چاشنی بہ درجۂ اتم پائی جاتی ہے۔مولانا حسین احمد مدنی کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے زبان وبیان کا بہترین مظاہرہ کیا ہے لکھتے ہیں:

''کراچی کے مقدمہ کے بعد ڈھائی سال جیل میں گزار کر مولانا جب باہر آئے تو تپ کر کندن بن چکے تھے۔اب انہوں نے پوری خوداعتمادی کے ساتھ قوم کے سیاسی شعور

کو بیدار کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی اور برق رفتاری کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں جا کر عام ہندوستانیوں اور اپنی ملت کے افراد کو مخاطب کرنے اور جھنجوڑنے لگے۔۱۹

مولانا ابولکلام آزاد کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے زبان وبیان کا عمدہ استعمال ملاحظہ ہو:

''ذرا غور سے دیکھیں تو بظاہر یہ مربوط اور ہمالیاتی شخصیت ،متضاد عناصر سے مرکب نظر آتی ہے۔جس طرح مولانا نے''غبارِ خاطر'' میں ذکر فرمایا ہے کہ سگریٹ کے مسلسل کش اور چائے لطیف وخوشگوار جرعات کو ترکیب دے کر ایک نرالے قسم کا کاک ٹیل تیار کیا تھا اسی طرح فطرت نے عجب عجب متضاد رنگ کے پتھروں سے ان کی شخصیت کی دیو ہیکل عمارت تعمیر کی تھی۔ایک طرف قیامت کی داخلیت پسندی وخلوت گزینی دوسری طرف ایسی پر شور ومتحرک زندگی جس میں طوفانوں کی سی گھن گرج اور پہاڑی ندی جیسی شوریدگی،ایک طرف عوام کے بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب اور نجی محفلوں میں لوگوں سے تابڑ توڑ ملاقاتوں کا سلسلہ دوسری طرف بھیڑ بھاڑ سے بیزاری اور خموشی اور تنہائی کی جستجو۔ایک طرف گہرے قسم کا مذہبی مزاج اور اور مشرقی اندازِ نشست وبرخاست اور اسلام کی تعلیمات سے شیفتگی دوسری طرف دنیا کے جدید ترین افکار وخیالات کی قدر شناسی ،تازہ ترین رجحانات پر مضبوط گرفت اور اپنے عہد کے مقبول ومعروف فلسفیوں سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ اس قدر کہ ارونا آصف علی جیسی خواتین مولانا کو بے حد اپ ٹو ڈیٹ ،لبرل اور جدید ذہن ودماغ کا انسان تسلیم کرنے میں خوشی محسوس کرتی ہیں۔''۲۰

غرض کہ عبدالباری نے خاکہ نگاری کے تمام پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک ایسا اسلوب اختیار کیا ہے،جس سے پڑھنے والا خود بخود اس شخصیت کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ بہ آسانی اس سحر بیانی کی حراست میں اسیر ہو جاتا ہے۔گویا ڈاکٹر سید عبدالباری نے لفظوں کے ذریعے فنی تصویر کشی کی ہے۔انہوں نے خاکوں میں اختصار،حقیقی واقعات کی عمدہ ترتیب اور ان کے ربط وتوازن کا بطورِ خاص خیال رکھتے ہوئے دیانت داری سے دلکش انداز میں شخصیت کی مرقع کشی کی ہے اور اپنے خاکوں میں جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے ان سے متعلق وہی باتیں لکھیں ہیں جو ان کے اندر موجود تھیں۔کہیں بھی کسی طرح کی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا ہے اور نہ ہی کہیں کسی شخصیت سے متعلق اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا ہے۔عبدالباری نے شخصیت سے متعلق واقعہ نگاری کے بیان سے اپنے خاکوں کے دامن کو وسیع ضرور کیا ہے،مگر اس میں کسی بھی طرح کی بے ترتیبی نظر

نہیں آتی اور ان کی صداقت میں انہوں نے کسی بھی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو ایک بہترین خاکے کی پہچان ہوا کرتیں ہیں اس سلسلے میں یحیٰی امجد رقم طراز ہیں:

''خاکہ میں کسی شخصیت کو جیسی ہوتی ہے من وعن ویسا ہی پیش کر دیا جاتا ہے اسے اچھا یا برا یا کچھ اور ''ثابت'' کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کی زندگی سے مختلف واقعات کا علمی بصیرت سے انتخاب کر کے پوری فنی مہارت سے ان کی ترتیب قائم کی جاتی ہے اور یوں زندہ شخصیت سامنے آجاتی ہے۔''۲۱

غرض عبدالباری نے فنی آداب کا پاس رکھتے ہوئے شخصیت کو سچائی اور دیانتداری سے پیش کیا ہے۔ ''انوکھے لوگ نرالی باتیں'' میں متعدد خاکے ایسے بھی ہیں جس میں انہوں نے شخصیت کے مثبت پہلو کے ساتھ ساتھ منفی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ مگر اس میں بھی انہوں نے مہارت، ہنر مندی اور خوش اسلوبی کے جوہر دکھائے ہیں۔ جس سے پڑھنے والے کے ذہن و دل میں شخصیت سے متعلق نفرت کے بجائے ہمدردانہ رویہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر عبدالباری نے شخصیت کے اچھوتے اور اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے باطن کی تہوں کو اپنے خاکوں کے ذریعے ظاہر کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ جس میں انہیں پوری کامیابی حاصل ہے۔ ڈاکٹر صابرہ سعید خاکہ نگاری کے فن و ماہئیت پر روشنی دالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''خاکہ نگاری کا فن خاکہ نویس سے کئی چیزوں کا طالب ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کسی شخصیت کو الفاظ وزبان کے ذریعے حیاتِ نو بخشی جائے۔ دوسرے زیرِ مطالعہ شخصیت کو اس کے اصلی رنگ وروپ میں اس کے ماحول میں پیش کیا جائے۔ اس کی تحریر صرف حقیقت کی عکاسی کرے۔ وہ شخصیت کے صرف نمایاں اور مسلم خصوصیتوں کو زیرِ قلم لائے۔ ایسے پہلو ہی منتخب کرے جن سے شخصیت کی ذہنی افتاد، افکار، نظریات قاری کے سامنے عیاں ہو سکیں۔ اس کے علاوہ اپنے جذبات اور جوش کو اعتدال میں رکھ کر ہمدردی لیکن غیر جانب داری کے ساتھ تمام مواد کو اس طرح ترتیب دے کہ شخصیت کی سیرت کے مخصوص ومنفرد پہلو منور ہو سکیں۔ اس کے ساتھ وہ قاری میں بھی اس شخصیت کے لئے ویسے ہی ہمدردانہ جذبات پیدا کردے جو وہ خود رکھتا ہے۔ واقعات صحت کے ساتھ پیش کیے جائیں۔''۲۲

مذکورہ بالا تمام خصوصیات وفنی آداب کو ڈاکٹر عبدالباری نے اپنے خاکوں میں بخوبی ملحوظ رکھا ہے۔ڈاکٹر عبدالباری صاحب کا قوتِ مشاہدکافی وسیع وقوی تھا،اس لئے شخصیت کے تاریک و باریک دونوں گوشوں تک رسائی بہت آسانی سے حاصل کی ہے۔یہی سبب ہے انھوں نے اپنی ذہنی بصیرت و بصارت اور مصورانہ مہارت سے کام لے کر شخصیت کے انوکھے اور منفرد کارناموں اوران کے اہم پہلوؤں،خیالات وافکارکوصداقت کا جامہ پہنا کر دلکش اندازِ بیان اور خوبصورت اسلوب میں ڈھال کر اس طرح بیان کیا ہے کہ ماضی کی جیتی جاگتی اور متحرک شخصیتیں حال میں زندہ ہوگئی ہیں۔

''انوکھے لوگ نرالی باتیں'' میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے جن شخصیات کا خاکہ پیش کیا ہے،اس میں ان سے متعلق سیاسی وسماجی اور اسلامی محور ومرکز اور تعمیری نطقۂ نظر سے ان کی خدمات کے حوالے سے معلومات کی فراہمی کو زیادہ اہمیت دی ہے۔یہی سبب ہے ان خاکوں کے مطالعے سے ان میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔سبھی شخصیت کے سیاسی وسماجی،اسلامی فکر وخیال اوران کے کارناموں کوانہوں نے زیادہ فوقیت دی ہے اورانہی دو تین موضوعات کے محور ومرکز پر سبھی خاکے گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔شخصیت کے تعارف کے ساتھ ساتھ ان کے آباواجداد کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کا بھی ذکر ملتا ہے۔ان کے تعلیمی حالات اوراس دوران اس شخصیت کے جوعزیز واقارب دوست،احباب اوراساتذہ جن سے انہیں شرفِ تلمذ حاصل ہوا،ان سب ناموں سے بہ خوبی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔اس طرح شخصیت کے کارناموں اورانہیں ملنے والے اعزاز واکرام کا ذکر بھی ان خاکوں میں ملتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے خاکوں میں ان شخصیتوں پر زیادہ وقت صرف کیا ہے جنہوں نے امت مسلمہ کی خاطر ملک کی سیاسی وسماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اوران خاکوں کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سید عبدالباری کا ان شخصیات پر لکھنے کا مقصد قارئین کوان کے کارناموں سے متعارف کرانے کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں ہوتا، اس ضمن میں مولانا حسین احمد مدنی،حکیم محمد اجمل ،صدرالدین اصلاحی ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی،قاضی مجاہدالاسلام،مولانا مودودی اور قاری محمد طیب وغیرہ اسی نوعیت کے خاکے ہیں۔

عبدالباری کے اس مجموعے ''انوکھے لوگ نرالی باتیں'' کا انفرادی اور مجموعی جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے تمام خاکے ہیئت اور فن کی کسوٹی پر پورے اور کھرے اترتے ہیں۔ عموماً جب کوئی فن کار کوئی فن پارہ تخلیق کرتا ہے، اس میں اس کا یہ مقصد ہر جگہ مضمر ہوتا ہے کہ اس کے تخلیق کردہ فن پارے کی رسائی عام قاری تک ہو سکے۔ جسے وہ پڑھ کر دیکھ کر اور سمجھ کر اپنی بیش قیمتی آرا سے فن کار کو آگاہ کرے۔ چنانچہ ایک خاکہ نگار کی بھی یہی کوشش ہوتی ہے وہ شخصیت کے احوال کو قارئین سے متعارف کرائے اور اس کے ردِعمل کو قارئین سے خود کو آگاہ کرے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کی خاکہ نگاری کا عمومی جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے، انہوں جو خاکے لکھے ہیں وہ کسی مقصد، قاری کی تسکین، اصلاح اور رہنمائی کے لئے لکھے ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر فراحی، حکیم اجمل خان، داکٹر سید محمود، مولانا ابوالحسن ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا سلیمان ندوی وغیرہ ایسی ہی نابغۂ روزگار شخصیات ہیں جن کے حالات زندگی کا مطالعہ کر کے عام قاری اپنے لئے سبق حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ قارئین کے لئے ڈاکٹر سید عبدالباری کے یہ تمام خاکے مشعلِ راہ کی اہمیت کے حامل ہیں۔

داکٹر سید عبدالباری نے اپنے خاکوں میں شخصیات کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ عموماً اردو کے زیادہ تر خاکہ نگاروں نے ملک کی عظیم و مخصوص شخصیات کو ہی اپنے خاکوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان خاکوں میں ادیب شاعر، رہنما، نقاد، علماء، سیاست داں مقرر، فلسفی، اور دوست وغیرہ عام طور پر شامل ہیں۔ غرض زیادہ تر خاکہ نگاروں نے عظیم ہستیوں پر ہی قلم اٹھائے ہیں تاکہ ان کی سیرت و عادات واطوار عام انسانی زندگی میں مشاہدات اور تجربات میں اضافے کا باعث بن سکیں۔ کسی عام شخصیت پہ خاکے بہت کم لکھے گئے ہیں کیوں کہ خاکہ نگار کو ایسی شخصیت کی تلاش ہوتی ہے جو زندگی کے مختلف شعبوں میں منفرد مقام و مرتبہ رکھتے ہوں۔ لیکن اس کے برعکس مولوی عبدالحق نے ''دیو مالی'' اور ''نور خاں'' اور رشید احمد صدیقی نے ''کندن'' کا خاکہ لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ شخصیت کا انتخاب دنیوی شان و شوکت سے نہیں بلکہ انسانیت کے سبب قرار پاتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے خاکوں میں ان شخصیات کا انتخاب کیا ہے، جو ہندوستان میں کسی بھی شعبۂ ہائے حیات کے حوالے سے اول صف سے تعلق رکھنے والی شخصیت ہیں۔ ''انوکھے لوگ نرالی باتیں''، میں کوئی بھی شخصیت ایسی نہیں ہے جو غیر معروف ہو۔ عبدالباری نے جن پر بھی قلم اٹھایا ہے سب ایسی شخصیتیں ہیں جن کو انہوں نے اپنی زندگی میں بہت قریب سے دیکھا ہے، ان سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا ہے اور ان سب کے اثرات کسی نہ کسی حوالے سے ان پر مرتب ہوئے ہیں۔ انہوں نے ان شخصیات سے مل

کر اور گفتگو کے ذریعے (بلکہ بعض سے انہوں نے باقاعدہ انٹرویو بھی لئے ہیں) خاکے کا مواد حاصل کیا۔ان کے خاکوں میں ان شخصیات کے لئے ہوئے انٹرویو کے اقتباس بھی عبدالباری نے بڑی خوش اسلوبی سے جا بجا پیش کئے ہیں۔انہوں نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا ان سے متعلق بہت سا مواد پہلے سے تحریری شکل میں موجود تھا ،عبدالباری نے ان بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کر کے بخوبی ترتیب دے کر اپنے خاکوں میں اور بھی دلکشی اور حسن پیدا کیا ہے۔ان شخصیات کے خاکوں میں ڈاکٹر عبدالباری نے شخصیتوں سے متعلق سیاسی وسماجی حالات کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کیں ہیں اسی سبب ان کے خاکے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

ان تمام خصوصیت کے علاوہ عبدالباری کے خاکوں میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔یہ عمومی بات ہے کہ ہر اچھی تخلیق میں خوبیاں وخامیاں موجود ہوتیں ہیں اسی طرح ان کے خاکوں میں بھی بے شمار خوبیوں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں بھی موجود ہیں۔ان خاکوں کی ایک پہلی خامی تمام خاکوں کے موضوعات میں یکسانیت ہے۔دوسری خامی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے خاکوں میں شخصیت سے متعلق افکار وخیالات اور کارناموں پر زیادہ زور دیا ہے،اس سے کہیں نہ کہیں خاکہ نگاری کے اہم تقاضوں سے ان کا دامن چھوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔منظر نگاری اور سراپا نگاری خاکہ نگاری کے دو اہم اوصاف ہیں مگر عبدالباری صاحب نے اپنے خاکوں میں اسے نظر انداز کیا ہے اور ساری قوت شخصیت کی سیرت اور ان کے کارناموں کو بیان کرنے میں شرف کی ہے۔ان کے خاکوں میں یہ اوصاف بہ مشکل کہیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

من جملہ مذکورہ تمام باتوں کے سید عبدالباری کی خاکہ نگاری کی اپنی ایک اہمیت ومعنویت ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ان کی خاکہ نگاری ملک کی نابغۂ روزگار شخصیتوں کے بھرپور تعارف کے ساتھ اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔عبدالباری کے خاکوں کے ذریعے نہ صرف گزشتہ ہندوستان کی سیاسی وسماجی تاریخ مرتب ہوئی ہے بلکہ مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والی نامور ہستیاں بھی نئی نسل کے ساتھ اپنے کارناموں اور نمایاں کرداروں کے ذریعے اس مجموعے ''نرالے لوگ نرالی باتیں'' میں محفوظ ہو گئیں ہیں۔اس طرح دیکھا جائے تو ڈاکٹر سید عبدالباری کے یہ خاکے ہندوستان کی عظیم شخصیت کے تعارف میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ڈاکٹر سید عبدالباری بطور خاکہ نگار اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم مقام ومرتبے پر فائز نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

حواشی

(۱) سید حامد حسین، خاکہ نگاری کا فن از تنقید کی جمالیات مرتب عتیق اللہ، جلد۔۱۰، ص ۴۶۸

(۲) خلیق انجم، بحوالہ، اردو ادب میں خاکہ نگاری، ڈاکٹر صابرہ سعید ص۔۹

(۳) ڈاکٹر اشرف رفیع، بحوالہ، اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، ڈاکٹر عمر رضا ص۔۱۸۰

(۴) نثار احمد فاروقی، بحوالہ، ڈاکٹر عائشہ طلعت خلجی، اردوں میں خاکہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ ص۔۱۵

(۵) رفیع الدین ہاشمی، اصنابِ ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۔۲۱۷

(۶) ڈاکٹر اسرائیل صدیقی، یادگار مرزا فرحت اللہ بیگ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ ص۔۲۰۰

(۷) یحیٰی امجد، از، اردو نثر کا فنی ارتقاء، مرتب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص۔۔۳۷۳

(۸) ڈاکٹر صابرہ سعید، اردو ادب میں خاکہ نگاری ص۔۶۰۔۵۷

(۹) ڈاکٹر صابرہ سعید، اردو میں خاکہ نگاری ص۔۵۷

(۱۰) سید حامد حسین، خاکہ نگاری کا فن، از تنقید کی جمالیات، مرتب عتیق اللہ ص۔۴۶۸۔۴۶۹

(۱۱) یحیٰی امجد، اردو میں خاکہ نگاری، از اردو نثر کا فنی ارتقا فرمان فتح پوری ص۔۳۶۳۔۳۶۴

(۱۲) انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ ص۔۶۲۲

(۱۳) ڈاکٹر سید عبد الباری، مقدمہ، انوکھے لوگ نرالی باتیں ص۔۱۰

(۱۴) ڈاکٹر صابرہ سعید، اردو ادب میں خاکہ نگاری ص۔۴۲

(۱۵) ڈاکٹر سید عبد الباری، مولانا صدر الدین اصلاحی، انوکھے لوگ نرالی باتیں ص۔۱۸۷

(۱۶) ڈاکٹر سید عبد الباری، ابو الکلام آزاد، انوکھے لوگ نرالی باتیں ص ۱۰۶

(۱۷) ڈاکٹر سید عبد الباری، حسرت موہانی، انوکھے لوگ نرالی باتیں ص۔۱۴۷

(۱۸) ڈاکٹر سید عبد الباری، ابو المحاسن مولانا سید محمد سجاد، انوکھے لوگ نرالی باتیں ص۔۱۶۶

(۱۹) ڈاکٹر سید عبد الباری، مولانا حسین احمد مدنی، انوکھے لوگ نرالی باتیں ص۔۲۳

(۲۰) ڈاکٹر سید عبد الباری، ابو الکلام آزاد، انوکھے لوگ نرالی باتیں ص۔۱۰۷

(۲۱) یحیٰی امجد، اردو میں خاکہ نگاری، اردو نثر کا فنی ارتقاء، مرتب فرمان فتح پوری ص۔۳۶۵

(۲۲) ڈاکٹر صابرہ سعید، اردو ادب میں خاکہ نگاری ص۔۱۰

بابِ چہارم (ب)

ڈاکٹر سید عبدالباری کی سوانح نگاری

ڈاکٹر سید عبدالباری نے خاکہ نگاری کے علاوہ سوانح نگاری کے فن پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔خاکہ نگاری کی طرح سوانح نگاری کا فن بھی اردو ادب کی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے۔دونوں میں موضوعاتی اعتبار سے بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے۔اردو کی دیگر اصناف کی طرح یہ صنف بھی اردو ادب میں انگریزی ادب کے زیرِ اثر رائج ہوئی۔سوانح نگاری میں کسی شخص کی مکمل زندگی کا عکس ہوتا ہے۔اس میں انسان کی پیدائش،خاندان ،خان پان،رہن سہن تعلیم وتربیت اس کے شوق ومشاغل اور وفات تک کے تمام واقعات کے ساتھ اس کے عادات واطوار،ظاہر وباطن،اخلاق ومعاشرتی،نفسیاتی کیفیت،اس کی زندگی کے نشیب وفراز کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے،جبکہ خاکہ نگاری کا فن اس کا متحمل نہیں ہوسکتا ہے۔

غرض سوانح نگاری کا فن کسی شخصیت کی زندگی کی تاریخ کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کا نام ہے۔اس لئے سوانح نگاری کے فن کو ادب کے ساتھ ساتھ ایک تاریخی حیثیت بھی حاصل ہے۔ڈاکٹر عبدالقیوم سوانح نگاری کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سوانح،تاریخ کی ایک شاخ ہے لیکن بعض خصوصیات کی وجہ سے اس کا شمار ادب میں بھی کیا جاتا ہے۔اب سوانح محض انسان کی پیدائش،خاندان،تعلیم،مشاغل زندگی اور وفات کا بیان ہی نہیں بلکہ کسی فرد کے ظاہر وباطن،عادات واطوار،اخلاق و معاشرت،وراثت اور نفسیاتی کیفیت اور اس کی زندگی کے نشیب وفراز کی داستان بن گئی ہے۔اب سوانح نگاری کے لئے وہ تمام باتیں دلچسپی کا باعث بن گئی ہیں جس سے شخصیت کی تعمیر اور ایک مکمل تصویر کے بنانے میں مدد ملے۔''[۱]

غرض سوانح نگاری میں تاریخ کی مانند کسی شخصیت کے حالاتِ زندگی تفصیل کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں اور اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو قارئین کے سامنے ظاہر کردیا جاتا ہے۔اچھا سوانح نگار ایمان داری کے ساتھ تمام واقعات کو پیش کرتا ہے اور حقیقت نگاری سے چشم پوشی نہیں کرسکتا۔سوانح نگار کو ان تمام واقعات کو بیان کرنے میں ذرا احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔وہ جس واقعے کو بیان کرے اسے ادبی لطافت اور چاشنی کے ساتھ پیش کرے،جس سے اس میں دلکشی آخر دم تک قائم رہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر ممتاز فاخر لکھتی ہیں:

> ''سوانح نگار حقائق کا ذکر مورخ کی طرح نہیں بلکہ تخلیقی فن کار کی طرح دلکش پیرایۂ بیان میں کرتا ہے۔کسی شاعر،ادیب،مصور ونقاش کی طرح اس کے تخیل کو پرواز کی

کی آزادی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اسے صرف مواد کے سہارے اس طرح پیش کرے جس
میں شخصیت کے خط وخال اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ واضح ہو جائیں۔لیکن اس کے
ساتھ سچائی اور دیانتداری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔۲

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے،سوانح نگاری کا فن محض تاریخ نویسی نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سے واقعات کو کاٹ چھانٹ کر اس کو ادبی لطافت کے ساتھ پیش کرنے کا فن ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے بھی اس صنف پر طبع آزمائی کرتے ہوئے ان سب لوازمات کا بطورِ خاص خیال رکھا ہے۔انہوں نے مخدوم اشرف سمنانی کی مکمل سوانح عمری قلم بند کی ہے، جو ایک مذہبی سوانح عمری کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو پہلی بار ۱۹۶۶ء میں دانش بک ڈپو، ٹانڈہ سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔اس کے بعد اس کی مقبولیت میں کافی اضافہ ہوا اور اس کے متعدد ایڈیشن آج تک شائع ہوتے رہے ہیں۔اس تصنیف میں انہوں نے ''سلطان العارفین حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی'' کی حیات مبارکہ اور ان کی تعلیمات اور افکار و خیالات کا ایک حسین مرقعہ پیش کیا ہے،اس لحاظ سے اس کی حیثیت تاریخی ہونے کے ساتھ مذہبی عقائد پر بھی منحصر ہے۔یہ کتاب انہوں نے اس وقت لکھی، جب وہ فیض آباد کے فاربس کالج میں درس وتدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے۔اس کتاب کا مقصد صوفیا کرام کے حالات زندگی اور ان کے افکار وخیالات اور ان کے پیغامات کی تبلیغ و اشاعت ہے۔اس کتاب میں انہوں نے دعوتِ اسلام،اخلاق و کردار اور تہذیب و معاشرت کے میدانوں میں صوفیا کے اہم رول اور ان کے کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ڈاکٹر عبدالباری لکھتے ہیں:

''یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آزادیٔ ہندوستان سے قبل انگریز حکمرانوں نے اور
آزادی کے بعد اس ملک کے جمہوری حکمرانوں نے جو نظام تعلیم رائج کیا اس میں اس
بات کی گنجائش نہیں باقی رکھی گئی کہ ہماری تعلیم یافتہ نئی نسلیں اپنے بزرگوں کے کارناموں
سے پوری طرح واقفیت حاصل کرسکیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ انہیں اپنے
تابناک ماضی اور نامور اسلاف سے ناواقف رکھنے کا پورا اہتمام کیا گیا۔''۳

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر عبدالباری کا یہ سوانح عمری لکھنے کا مقصد صرف اور صرف نئی نسل سے جہانگیر اشرف سمنانی کا تعارف کرانا اور ان کے پند ونصائح کی تبلیغ کرنا ہے۔اس کتاب میں انہوں نے اس عہد کے بزرگوں کی کرامات اور معجزات کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی شخصیت اور ان کی تبلیغ کو

خاص محور و مرکز بنایا ہے۔ جس سے نئی نسل تک ان کی حیاتِ مبارکہ، ان کے کارنامے اور اس کی حقیقتیں سامنے آ سکیں۔ ڈاکٹر عبدالباری لکھتے ہیں:

> ''بدقسمتی سے اب تک بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ پر جو کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں ان میں اس بات پر زیادہ زور دیا جاتا رہا ہے کہ ان کی کرامات اور خوارق عادت کو بہت بڑھا چڑھا پیش کیا جائے۔ گویا ان اللہ والوں کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا۔ اور شاید اسی کے بل بوتے پر انہوں نے ہندوستان میں اسلام کی ترویج و اشاعت کی۔ میں اس اندازِ فکر کو ان عظیم المرتبت بزرگوں کے ساتھ ان کے عقیدت مندوں کی بہت بڑی بے انصافی سمجھتا ہوں اس لئے کہ ان خدا رسیدہ شخصیتوں نے اس سرزمین میں جس کے چپہ چپہ سے شرک و گمراہی کی بو آتی تھی بڑی محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کے ساتھ اسلام کی خوشبو سے فضا کو معطر بنایا ان عظیم المرتبت ہستیوں نے اسلام کی تبلیغ کے لئے اپنی پوری پوری زندگیاں قربان کر دیں۔ وہ حسن اخلاق کا ایک جیتا جاگتا پیکر بن کر لوگوں کے سامنے آئے اس کے لئے صدہا ریاضتیں کیں کہ اسلام کی تعلیمات کا ایک زندہ مرقع بنا کر خود کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ چنانچہ ان کی انسانیت، رحم دلی، جذبۂ خدمت خلق، درد مندی، سخاوت و دریا دلی، وسیع القلبی، اور ایثار و قربانی کی آنچ سے کفر کی چٹانیں موم کی طرح پگھل گئیں۔[۴]

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس تصنیف کا مقصد اس اقتباس میں بیان کر دیا ہے، جس میں انہوں نے حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کے حالات اور ان کے ارشادات کو آپ کے ملفوظات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ مخدوم اشرف سمنانی کا کردار ایک ایسا مثالی کردار ہے جو انسان کے ذہنی اور اخلاقی کردار کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کو لکھنے کے بعد مخدوم اشرف سمنانی کی درگاہ کچھوچھہ شریف کے سجادہ نشین اور اس خانوادے سے تعلق رکھنے والے سبھی افراد سے اس بات کی گزارش بھی کی کہ ان کی درگاہ کو سجانے اور مزین کرنے اور عرس کی بے کار اور فرسودہ روایت سے بہتر یہ ہوگا کہ مخدوم اشرف سمنانی کی تعلیمات اور ان کے مقصد حیات کی تکمیل کے لئے جد و جہد کریں تاکہ دین کو سربلندی حاصل ہو سکے، جو ان کی زندگی کا خاص مقصد اور محور و مرکز تھا۔

اس سوانح عمری میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے مخدوم اشرف سمنانی کی زندگی سے متعلق تمام واقعات کو

بڑی محنت و مشقت سے پیش کیا ہے،جس میں انہوں نے ان کی زندگی کے ابتدائی حالات کی تفصیل لکھتے ہوئے،ان کے آبا واجداد کا ذکر کیا ہے اور پھر ان کے والد محترم جو اس وقت سمنان کے بادشاہ تھے، کے انتقال کے بعد حکومت کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر آ پڑی۔ جب مخدوم اشرف وہاں کے بادشاہ مقرر ہوئے،اس وقت کی رعایا کے حالات اور ان کے عدل و انصاف کو مصنف نے خاص موضوع بنایا ہے۔۲۰ سال تک وہ کامیابی سے حکومت کا نظم نسق دیکھتے رہے،اس کے بعد ان پر شریعتِ محمدی کی تبلیغ اور سیاحت کا ایسا جوش چڑھا کہ وہ حکومت ترک کر کے ہندوستان کے سفر کے لئے روانہ ہو گئے۔ دورانِ سفر انہیں کن کن مراحل سے گزرنا پڑا اور کہاں کہاں کس مقام پر وہ ٹھہرے،ان سب واقعات کی تفصیلات اس سوانح میں پڑھنے کو ملتی ہے۔ پنڈوہ کا سفر اور وہاں عالی مقام بزرگ شیخ علاؤالدین گنج بنات نے ان کا استقبال جس انداز میں کیا تھا اس کی ذکر بھی تفصیل سے پڑھنے کو ملتا ہے،اسی طرح جونپور اور پھر وہاں سے عراق کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے حجاز اور یمن کے سفر کی تفصیل بھی ملتی ہے اور پھر واپسی کے بعد کچھوچہ شریف میں تشریف آوری اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں عوام وخواص کو راہ حق پر چلنے کی تلقین کا ذکر بھی وضاحت کے ساتھ ملتا ہے۔اس طرح ان کے دوبارہ سفر کعبہ اور واپسی میں دکن میں سکونت اختیار کرنا اور پھر وہاں سے فلسطین اور عرب وغیرہ پھر چوتھی مرتبہ کا سفر جو ملکِ شام، فارس اور روم کا تھا ان سب کی روداد انہوں نے بیان کی ہے اور حافظ شیرازی سے ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے۔شیراز سے واپسی کے دوران انہوں نے اپنے آبائی وطن سمنان کا رخ کیا،مگر اس وقت وہاں کے حالات کافی تبدیل ہو چکے تھے،ان کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہاں سے واپسی کے بعد وہ پھر پنڈوہ اور جونپور رکتے ہوئے کچھوچہ شریف میں آ کر مستقل سکونت اختیار کرتے ہیں اور یہیں ان کو وصال بھی میسر ہوتا ہے۔ جہاں آج بھی لاکھوں عقیدت مند ان کی درگاہ پر سر جھکاتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے حصے میں انہوں نے ان کے حالات زندگی ان کی سیرت،ان کے رہن سہن، عادات واطوار اور ان کی زندگی سے جڑے ہوئے بہت سے واقعات کی تفصیل ضروری حوالوں کے ساتھ بیان کی ہے۔اس ضمن میں ان کے کرامات اور خرق وعادات کا بھی ذکر کیا ہے،مگر عبدالباری نے زیادہ تر توجہ انسانی دردمندی، سادگی،خلوص، ایثار وقربانی، حیرت انگیز قوتِ عملی ،جذبہ خدمتِ خلق اور ان کے بلند خیال وافکار پر بالخصوص مرکوز کی ہے۔اس تصنیف کے دوسرے حصے میں عبدالباری صاحب نے مخدوم اشرف سمنانی کی مجلسوں اور اس میں ہونے والی علمی اور روحانی موضوعات پر گفتگو کا ذکر کیا ہے،اس حصے میں انہوں نے ان کے مفلوظات سے جا بجا حوالہ بھی پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ

علم وتفکر، اس کی اہمیت اور مخدوم اشرف نے جو کچھ نصیحت آمیز باتیں بیان کیں ہیں، ان سب کا ذکر ملتا ہے، توحید، خدمتِ خلق کی جو اہمیت آپ کی نظر میں تھی خود انہیں کے اقوال و اعمال کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ امر بالمعرفت اور نہی عن المنکر کی فضلیت، عارف کا مقام، ارباب اقتدار کی اصلاح، رزق حلال کی فضلیت، کرامت فروش کی مذمت اور شیخ یا داعی حق کی خصوصیت آپ کے بیانات کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ پڑھنے کو ملتی ہیں جو قارئین کی دلچسپی کا باعث بھی ہے۔

غرض ڈاکٹر سید عبدالباری کی سوانح مخدوم اشرف سمنانی کی زندگی کے بیش تر واقعات، مسائل، ان کے افکار و خیالات اور نصیحت آمیز باتوں سے پر معلوم ہوتی ہے۔ جس میں ان سے متعلق ہر واقعہ اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے۔ عبدالباری نے ان واقعات کو اتنی خوبصورتی اور سلیقے سے ایک لڑی میں پرویا ہے، جس سے ان کی زندگی کا پورا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ سوانح نگاری میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر واقعہ بیان کیا جائے بلکہ سوانح نگار کو اس مرحلے میں کردار سے متعلق اہم یا غیر اہم واقعوں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے پھر اسے ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کرنا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں وہ اسی واقعے کو اہمیت دیتا ہے جو کردار کی زندگی کی بھرپور عکاسی کر سکے۔ خواہ وہ واقعہ اس کے لئے غیر اہم کیوں نہ ہو۔ ڈاکٹر عبدالقیوم اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے نپولین اور سرسید کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نپولین کی زندگی میں عام لوگ اس کے فتوحات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں لیکن اس کے سوانح نگار کے لئے وہ چھوٹے چھوٹے اختلافات اہم ہیں جو نپولین اور اس کے بھائی کے درمیان پیدا ہوئے۔ یا سرسید کا نوکر کو مارنا، کسی شخص کا گفتگو کرنا یا دوستوں کی بے تکلف باتیں زندگی کی حقیقتوں کا آشکارہ کر دیتی ہیں۔''۵

اس نقطہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی کہ عبدالباری صاحب نے اس مرحلے میں بڑی دیانتداری سے کام لیتے ہوئے تمام واقعات کو اس سلیقے سے پیش کیا ہے، جس سے مخدوم اشرف سمنانی کی زندگی کا مکمل عکس آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتا ہے۔

سوانح نگاری کی دوسری سب سے بڑی صفت اس کو بے جا طویل نہیں کرنا چاہئے۔ سوانح نگار کے لئے

ضروری ہے وہ جو کچھ بھی جانتا ہے اسے وہ من وعن بیان نہ کرے، اس طریقے کے بیان سے اس شخص کی سوانح عمری کافی طویل ہو جائے گی، جس سے قارئین کی دلچسپی آخر تک باقی نہیں رہتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنی سوانح نگاری میں اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے اور انہوں نے صرف ۱۱۴ صفحات پر مشتمل اپنے کردار کے حیات و کارنامے، افکار و افعال، کردار و ذہن کی نشو نما کا مرقع پیش کر دیا ہے۔ انہوں نے اس سوانح میں نہ صرف مخدوم اشرف سمنانی کے افکار و خیالات کو اہمیت دی ہے بلکہ ان کے خارجی ردعمل اور داخلی احساسات کی کہانی بھی پیش کی ہے۔ ان واقعات کی بہترین ترتیب اور انتخاب کے ذریعے انہوں نے اپنے کردار کے تمام مثبت پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

غرض یہ کہ ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس سوانح میں مخدوم اشرف سمنانی کی پیدائش سے لے کر وصال تک کے تمام افعال و کردار کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں ان کے داخلی اور خارجی دونوں حالات کے ساتھ ان کے جذبات و احساسات کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔ ان سبھی حالات کو بیان کرنے کے سبب سوانح نگاری کا فن کبھی کبھی اپنی طوالت کے سبب داستان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر حالی کی سوانح نگاری جس میں حیات جاوید کی ضخامت سے ہر کوئی واقف ہے مگر عبدالباری نے طوالت سے دامن بچاتے ہوئے، کم جملوں میں زیادہ کام کی باتیں کی ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے حافظ شیرازی سے مخدوم اشرف سمنانی کی ملاقات کا ذکر کم الفاظ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا اس ملاقات سے بھرپور لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''آپ شیراز بھی تشریف لے گئے اور حافظ شیرازی سے ملاقات کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معرفت آمیز شعر و ادب کی آپ کتنی قدر و منزلت کرتے اور دنیا کے جس گوشے میں بھی کوئی شخص دین محمدی کی خدمت میں مصروف ہو آپ وہاں جا کر اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے مشتاق رہتے۔''۶

صرف ایک جملے میں عبدالباری صاحب نے اس واقعے کا ذکر کیا اور پھر آگے بڑھ گئے اور وہاں بھی مختصراً گفتگو کرتے ہوئے، دین کی تبلیغ میں ان کے کارنامے کو بیان کر دیا۔ اس طرح انہوں نے طوالت سے دامن بچاتے ہوئے واقعات کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا، کہیں بھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جو غیر ضروری معلوم ہوتا

ہو۔اس ضمن میں انہوں نے بڑے بڑے واقعات کو بیان کرنے کے بجائے چھوٹے چھوٹے واقعات کو ترجیح دی ہے۔ان واقعات کا انتخاب اور ترتیب اس انداز میں انہوں نے پیش کی ہے، جس سے مخدوم اشرف سمنانی کی زندگی کے حالات کو پڑھتے ہوئے قارئین کو کسی بھی قسم کے عدم تسلسل کا احساس نہیں ہوتا ہے۔سوانح نگاری میں واقعات کی اسی ترتیب و تنظیم کی صفت اسے تاریخ سے مختلف کرتی ہے اور واقعات نگاری کے اسی ترتیب اور تسلسل کی وجہ سے ادب میں سوانح نگاری کو ایک اہم مرتبہ حاصل ہے۔سوانح نگاری میں ادبیت کا پایا جانا لازمی جزو ہے اگر یہ نہیں ہے تو وہ سوانح نگاری کے بجائے تاریخ کی کتاب بن جاتی ہے اس لئے سوانح نگار کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ جو بھی واقعہ بیان کرے اس میں حسن ترتیب کا خاص خیال رکھے، سوانح نگاری میں اس کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی ہے، اسی اندازِ بیان پر سوانح نگاری کی مقبولیت کا دار و مدار ہوتا ہے۔اس پس منظر میں ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں:

''نقادفن سوانح میں صداقت اور سچائی پر بہت زور دیتے آئے ہیں لیکن محض صداقت اور خشک واقعات ہی سوانح میں دلچسپی نہیں پیدا کر سکتے ہیں۔ بلکہ اظہارِ بیان کی خوبی اور خوش اسلوبی کو بہت دخل ہے۔ڈاکٹر جانسن نے سوانح کو ادب کی کی ایک شاخ قرار دیا ہے اگر چہ اس میں شعوری طور پر ایک فرد کی زندگی کو مربوط کیا جاتا ہے اس لئے شعور میں تاریخ سے مدد لی جاتی ہے لیکن اس کی تخلیقی صفت اور دلچسپی پیدا کرنے کی ضرورت نے ادبی اصناف سے اس کا دامن باندھ دیا اس لئے ایک سوانح میں تاریخ، فرد واحد اور ادبی چاشنی تینوں کی آمیزش ہوتی ہے اور یہی حسن ترتیب کا سبب بن جاتی ہے۔''[۷]

مذکورہ بالا سطور کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سوانح نگاری میں ادبیت کا ہونا لازمی ہے، اس سے سوانح اور تاریخ کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس پر خاص توجہ مرکوز کی ہے کہ یہ سوانح محض تاریخ بن کر نہ رہ جائے کیوں کہ اس میں انہوں نے ایک ایسی شخصیت کو کردار کے طور پر پیش کیا ہے جو مذہب کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ کا ایک اہم حصہ بھی رہ چکی ہے۔اس لئے انہوں نے اس مرحلے میں کافی احتیاط سے کام لیا ہے، جس کے سبب ان کے ہر جملے سے ادبی لطافت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے مثال کے طور پر ان کا یہ اقتباس خاص طور سے ادبیت کی چاشنی سے پر نظر آتا ہے:

''ابھی حصرت اشرف جہانگیر اکتسابِ علم سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ۱۵سال کی

عمر میں آپ کے والد محترم کا انتقال ہو گیا اور نظام سلطنت کو سنبھالنے کی ذمہ داری آپ کے کاندھوں پر پڑی اور آپ تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوئے۔ رعایا کی فلاح و بہبود اور عدل وانصاف کی ان روشن روایات کو آپ نے برقرار رکھا جو آپ کے والد قائم کر گئے تھے،آپ کے عدل و انصاف کا اندازہ مؤلف لطائف اشرفی کے ان اشعار سے ہوتا ہے۔''۸

اس اقتباس کے بعد انہوں نے فارسی کے چند اشعار پیش کئے ہیں جس سے ان کی سوانح نگاری کا حسن اور بھی نکھرا ہو معلوم پڑتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عبدالباری نے تاریخ کے ان واقعات کو کس خوش اسلوبی کے ساتھ ادب کے پیکر میں ڈھال کر پیش کیا ہے اور مخدوم اشرف سمنانی کی ذہنی کیفیت تک پہنچ کر ان کے نشیب وفراز کو اپنے انداز بیان سے گرفت میں لے کر ان کی زندگی کی تمام پیچیدگیوں اور الجھنوں کو بڑی خوبصورتی ، ایمانداری اور بے باکی سے بیان کرتے ہیں، جو ایک اچھا سوانح نگار ہونے کی دلیل بھی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کی سوانح نگاری کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اس میں کہیں بھی اپنے کردار سے متعلق ذاتی تاثرات نہیں پیش کیے ہیں بلکہ انہوں نے غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے حقائق کو ذاتی خیالات پر ترجیح دی ہے۔ اردو سوانح عمریوں میں یہ خامی زیادہ تر دیکھنے کو ملتی ہے، جس میں عقیدت مندی اور ذاتی تاثرات نے فنی خوبیوں کو پس پشت ڈال دیا۔اس خامی کے شکار سبھی سوانح نگار ہوئے ہیں۔

سوانح نگاری میں موضوع کے انتخاب کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی ہے۔ اس ضمن میں عبدالباری اپنے موضوع کا انتخاب کرنے کے لئے بہت ہی احتیاط اور باریک بینی سے کام لیتے ہوئے غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی سوانح نگاری کا کردار ایک ایسا فرد ہے، جس کا اس زمانے کے لحاظ سے دور دور تک ان سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں ان کو مواد کی فراہمی کے لئے کئی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا اور مختلف کتابوں اور کتب خانوں کی چھان بین کرنی پڑی۔ انہوں نے اس مرحلے میں ان کے ملفوظات اور خطوط کو اپنے مواد کا ذریعہ بنایا اور ان سے خوب معلومات فراہم کر کے سوانح میں پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

''میں نے یہ حقیر کوشش اس غرض سے کی ہے کہ قدوۃ الکبرہ حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کے ان حالات وارشادات کو آپ کے ملفوظات کی روشنی میں پیش کر دوں جن میں

انسان کے ذہن و کردار کو بدل دینے کی طاقت پوشیدہ ہے۔آپ کے حالات وارشادات میں نے لطائف اشرفی مرتبہ نظام یمنی مترجمہ امیر احمد سے اخذ کئے ہیں اور بعض مقامات پر حضرت کے مکاتیب سے بھی استفادہ کیا ہے۔صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی تصنیف ''بزم صوفیہ'' سے بھی چند اقتباسات اخذ کئے گئے ہیں'' ۹

غرض مواد کی فراہمی کے لئے ڈاکٹر سید عبدالباری نے کافی محنت و مشقت کی ہے اور مخدوم اشرف سمنانی کے متعلق مختلف مآخذ کا سہارا لیتے ہوئے اس کتاب کو مستند بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔اس مرحلے میں اشرف جہانگیری کے مکتوبات کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس کے بعد ان کے ملفوظات نے ان کی شخصیت کو نمایاں کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔جس سے اشرف جہانگیری کے بہت سے رفقا، افکار وخیالات اور پند و نصیحت کا ہمیں علم ہوتا ہے۔یہ تمام مواد عبدالباری کے لئے کافی اہم ثابت ہوئے جس سے انہوں نے اپنی سوانح نگاری کے فن کو مزید تقویت بخشی ہے۔عبدالباری نے مخدوم اشرف سمنانی کے مکتوبات اور ملفوظات سے واضح تفصیلات اخذ کر کے سوانح میں قارئین کی دلچسپی کا سامان مہیا کر دیا ہے۔جس سے قاری جب اس سوانح کا مطالعہ کرتا ہے اس میں اسے اشرف جہانگیر کی زندگی سے متعلق کوئی ذاتی دلچسپ بات مل جاتی ہے جس سے اس کی طبعیت بشاس ہو جاتی ہے اور وہ کھل اٹھتا ہے۔

ہر تخلیق میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور در آتا ہے، اسی طرح ڈاکٹر سید عبدالباری کی اس کتاب میں بھی ایک طرح کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔انہوں نے مخدوم اشرف سمنانی کے حالات زندگی اور ان کے افکار وخیالات کو زیادہ اہمیت دی ہے اور ان کے عہد کے تاریخی، سیاسی معاشی اور معاشرتی پس منظر کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔اس تشنگی کا احساس قاری کو شدت سے ہوتا ہے اور بقول ڈاکٹر عبدالقیوم اس کے بغیر کوئی سوانح مکمل نہیں ہو سکتی۔دراصل جو شخصیت جس ماحول میں پیدا ہوتی ہے اس کے اثرات، زندگی پر خاص طور سے نمایاں ہوتے ہیں۔اس لئے کسی بھی فرد کی ذہنی نشو و نما بغیر اس کے سماجی و معاشرتی پس منظر کو جانے نہیں سمجھی جا سکتا ہے۔عبدالباری صاحب نے اسے بالکل نظر انداز کیا اور اس کمی نے ان کی سوانح نگاری کے فن کو ضرور مجروح کیا ہے۔دوسری بات یہ کہ انہوں نے یک رخی اور مداحی سوانح عمری لکھی ہے، جس میں انہوں نے حضرت مخدوم اشرف سمنانی کی حیات مبارکہ کے کارناموں کو مدلل انداز میں پیش تو کیا ہے، جب کہ سوانح نگاری کا تقاضا یہ بھی ہے اس میں شخصیت کے منفی کردار و واقعات پر بھی روشنی ڈالی جائے۔مگر عقیدت مندی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے

ہوئے انہوں نے اسے ضروری نہیں سمجھا۔ دوسری بات کسی صوفیا یا اولیا کی جتنی بھی سوانح عمریاں ملتی ہیں ان میں کہیں بھی منفی پہلو کا ذکر نہیں ملتا بلکہ ان کے سبھی اچھے اوصاف ہی گنائے جاتے ہیں کیوں کہ صوفیا کا مقام و مرتبہ خدا اور رسول کے بعد سب سے اہم تصور کیا جاتا ہے اور ان کو خدا کا سب سے قریبی مانا جاتا ہے۔ اس لئے ان میں خامیاں تلاش کرنا مذہب کی رو سے غلط اور معیوب بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے عبدالباری صاحب نے بھی اپنی سوانح نگاری میں صرف ان کے اوصاف اور محاسن پر ہی روشنی ڈالی ہے جبکہ سوانح نگاری کے لئے عقیدت مندی کا جذبہ کافی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالقیوم رقم طراز ہیں:

> ''فنی اعتبار سے یک رخی اور یک طرفہ سوانح یا مداحی خواہ کتنی بھی مدلل اور مربوط کیوں نہ ہو، بے جان سوانح ہے۔ عقیدت مندی، فنی اعتبار سے سوانح کے لئے سب سے زیادہ مہلک چیز ہے۔ اگرچہ عقیدت کے اس جذبے میں عزت و احترام کا جذبہ پوشیدہ ہوتا ہے لیکن احترام کے یہ معنی نہیں کہ حقائق سے آنکھیں بند کرلیں جائیں۔'' ۱۰

مگر یہاں ڈاکٹر سید عبدالباری ایک مذہبی اور صوفی شخص کی سوانح عمری قلم بند کر رہے ہیں اس لئے ان میں ان کی زندگی سے متعلق کوئی ایسی بات بیان کرنے پر وہ مجبور ہیں، جس سے ان کی اہانت ہوتی ہو۔ دوسری اہم بات صوفیا کرام خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے لوگ ہوتے ہیں جن کی زندگی کا مقصد اللہ اور اس کے اسلام کی تبلغ و اشاعت کرنا ہوتا ہے وہ لوگ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور زیادہ تر وقت عبادات میں صرف کرتے ہیں اور خالی وقتوں میں پند و نصیحت کرتے ہیں اس لئے ان کی زندگی سے منفی پہلو نکالنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اگر سوانح نگار ایسا کرتا ہے تو وہ مذہبی اعتبار سے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سوانح نگاری یک رخی اور مداحی ہے جو صرف مذہبی اعتبار سے دیکھا جائے تو قابل معافی بھی ہے۔

فن سوانح نگاری میں موضوع، مواد، شخصیت کے انتخاب اور ان کی ترتیب کے بعد اسلوب اور اندازِ بیان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ادب کی دوسری اصناف کی مانند سوانح نگاری کا بھی اپنا ایک الگ رنگ روپ اور آہنگ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنی سوانح نگاری میں جو اسلوب اختیار کیا ہے اس سے نہ صرف ان کی شخصیت جلوہ گر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے بلکہ ان کی صلاحیت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ عبدالباری نے اپنی صلاحیت کے مطابق واقعات کے انتخاب اور ان کی ترتیب میں جو مہارت دکھائی ہے اس سے ان کی ذہانت کا بخوبی

اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔کسی بھی واقعے میں کہیں بھی بے ربطی یا کسی طرح کی الجھن کا سامنا نہیں ہوتا ہے بلکہ ان میں روانی اور سلاست کی حد درجہ فراوانی دکھائی دیتی ہے۔مثال کے طور پر ان کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''حضرت اشرف جہانگیر نے جب ہندوستان میں قدم رکھا تو ابھی اسلام کی روشنی ملک کے چپے چپے میں نہیں پہونچی تھی اور جو لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے تھے وہ عقائد کے اعتبار سے طرح طرح کے توہمات کے شکار تھے۔شرک و بدعت، گمراہی و ضلالت کا ہر قدم پہ ڈیرا تھا۔ایک خدا کے بجائے لوگ ان گنت خداؤں، طاقتوں اور مظاہرِ فطرت کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور ان کے خوف سے لرزاں و ترساں رہتے۔ان حالات میں دیگر بزرگانِ دین کی طرح حضرت اشرف نے توحید کی صدا پوری قوت کے ساتھ بلند کی۔آپ کے ملفوظات میں سب سے زیادہ گفتگو جن اسرار و رموز پر کی گئی ہے وہ توحید کے اسرار و رموز ہیں۔'' ١١

سوانح نگاری کا اسلوب دیگر نثری اصناف سے مختلف ہوتا ہے۔یہ تاریخ کی طرح خشک زبان کی متحمل نہیں ہوسکتی ہے اور نہ ہی اس میں ڈرامے، ناول اور افسانے کی طرح تخیل کی آمیزش کی جاسکتی ہے۔اس فن میں تخیل کی کارفرمائی کی گنجائش بالکل نہیں ہوتی ہے۔اس نکتے سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر سید عبدالباری کے اسلوب میں روکھا پن کہیں بھی نظر نہیں آتا، اس میں دلکشی اور شگفتگی ہر جگہ دیکھنے کو ملتی ہے۔دوسری بات تخیل کی ہے، اس ضمن میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں باقی رہتی کیوں کہ عبدالباری نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ انہوں نے جو بھی واقعات بیان کئے ہیں وہ حقائق کی روشنی میں لکھے ہیں اس لئے ان کی سوانح میں حقائق پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں ان میں کہیں بھی تصور کی آمیزش نظر نہیں آتی ہے۔اسلوب میں اگر عقیدت مندی کے عنصر شامل ہو جائیں تو وہ سوانح نگاری کے لئے کافی مضر ہوتا ہے۔مگر عبدالباری صاحب نے یہاں بھی اپنے فن کے مظاہرے میں کمال کے جوہر دکھائے ہیں، سوانح کا مطالعہ کرتے وقت کہیں بھی ان کی عقیدت کے سبب فن پر کوئی آنچ نہیں آئی ہے بلکہ ان کے اسلوب میں جو تازگی اور شگفتہ بیانی پائی جاتی ہے وہ ہر جگہ نمایاں ہے اور ان کے اسلوب میں کہیں بھی کس طرح کی جانبداری کا احساس بھی نہیں ہوتا۔اس ضمن میں ڈاکٹر عمر رضا لکھتے ہیں:

''دراصل تخیل کی بلند پروازی اور جذبے کی آمیزش ناول کو بے حد پرتاثیر بنادیتی

ہے، جبکہ سوانح نگاری کے لحاظ سے اس کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سوانح نگار کو
اپنے موضوع سے محبت یا نفرت ہوسکتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ غیر جانبدار کے ساتھ
ہیرو کی زندگی کو پرکھتا ہے اور ادبی سانچے میں ڈھال کر اسے پیش کرتا ہے۔'' ۱۲

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے شعور کے ذریعے سوانح کی تخلیق میں عمدہ جوہر دکھائے ہیں ۔اس میں انہوں نے موضوع کا انتخاب اور اس کے حدود کا تعین ، واقعات اور مواد کی فراہمی اور انہیں حقیقت کی کسوٹی پر پرکھ کر منظّم انداز میں پیش کیا ہے۔ غرض عبدالباری نے مخدوم اشرف سمنانی کی سوانح عمری میں معمولی سے معمولی مگر نتیجے سے پر عمل کو ان کی شخصیت اور سیرت کے مرقعے میں بخوبی پیش کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے واقعات کو من وعن پیش کرنے کے بجائے ایسی بصیرت اور ذہانت کے ساتھ پیش کیا ہے، جس سے ان کی فنکارانہ صلاحیت کا اندازہ بخوبی لگتا ہے ۔مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں ڈاکٹر عبدالباری نے سوانح نگاری میں مخدوم اشرف سمنانی کی زندگی کا بھرپور عکس پیش کیا اور ان کی زندگی کے اہم واقعات اور نفسیاتی کیفیت کو دلچسپ ادبی پیرائے میں پیش کر کے مخدوم اشرف کے افکار وخیالات کی اشاعت بڑے موثر انداز میں کی ہے، جو اس سوانح کے لکھنے کا اصل مقصد بھی تھا۔ انہوں نے اپنے مقدمے میں یہ بات واضح طور پر لکھی بھی ہے:

میں نے یہ حقیر کوشش اس غرض سے کی ہے کہ قدوۃ الکبریٰ حضرت اشرف جہانگیر
سمنانی کے حالات وارشادات آپ کے ملفوظات کی روشنی میں پیش کردوں جن میں انسان
انسان کے ذہن وکردار کو بدل دینے کی طاقت پوشیدہ ہے'' ۱۳

غرض اس سوانح نگاری کا مقصد واضح ہے کہ عبدالباری نے اس کی اشاعت محض اخلاقی و مذہبی نقطۂ نظر سے کی ہے۔ جس میں انہوں نے صرف مخدوم اشرف سمنانی کی مذہبی زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ جنہوں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ اسلامی تعلیمات اور اس کی تبلیغ میں صرف کیا ہے۔ جس سے ہندوستان میں ان کے لاتعداد عقیدت مند پیدا ہوئے ،اور ان کے جذبات ہمیشہ کے لئے مخدوم اشرف سمنانی سے وابستہ ہو گئے۔ ان عقیدت مندوں میں ایک نام ڈاکٹر سید عبدالباری کا بھی ہے جنہوں نے اس عظیم صوفی منش شخصیت کی سوانح عمری ان کی عقیدت مندی کے جذبے سے سرشار ہوکر لکھی ہے۔ ظاہر ہے جب انہیں ان سے جذباتی لگاؤ ہے تو وہ صرف اوصاف حسنہ ہی بیان کریں گے اور ان کے عیوب کو یکسر خارج کر دیں گے۔ جس کا نتیجہ اس سوانح میں عیاں ہے کہ باری صاحب جذبات کی رو میں بہہ کر جانب داری کا پہلو اختیار کرتے ہوئے نظر آتے

ہیں۔اس لئے اس میں زیادہ تر باتیں مذہبی امور پر ملتی ہیں۔حالانکہ اس سوانح میں انہوں نے اشرف جہانگیری سے متعلق دیگر حالات بھی بیان کئے ہیں مگر وہ صرف ہلکے پھلکے اور سرسری انداز میں پس منظر کے طور پر کیے ہیں، جس کی تصویریں واضح نہیں ہو پاتیں۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کی اس سوانح کی ایک قابل توجہ بات یہ بھی ہے ان کا نظریہ اور مخدوم اشرف سمنانی کا نظریہ حیات دونوں میں بڑی مطابقت دکھائی دیتی ہے۔دونوں کا ایک ہی مقصد اسلام کی سربلندی ہے۔عبدالباری صاحب پوری زندگی اسی نظریہ کے ساتھ جیتے رہے اور انہوں نے جو کچھ بھی لکھا اسی کے آئینے میں لکھا۔ان کی کوئی بھی تحریری ہو اس میں اسلامی ادب کا عکس صاف نظر آتا ہے۔اس سوانح میں ان کے نظریات کی یکسانیت کے سبب مخدوم اشرف سمنانی کی حیاتِ مبارکہ میں چار چاند لگ گیا ہے اور اسی باعث سوانح کے حسن میں دلکشی اور رعنائی کے عنصر نمایاں ہوئے ہیں۔غرض ڈاکٹر عبدالباری صاحب کو اس موضوع سے دلی وابستگی، لگاؤ، دلچسپی اور ہمدردی کا جذبہ موجود تھا اس لئے انہوں نے مخدوم اشرف سمنانی کی مداح سرائی میں اپنے قلم کے جوہر آزانہ طور پر کھل کر دکھائے ہیں۔

عمومی طور پر دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر سید عبدالباری کی یہ تصنیف نہ تو مکمل سوانح ہے اور نہ ہی تاریخ بلکہ یہ مذہبی اور تاریخی سوانح نگاری کے درمیان کی کڑی ہے، جس میں انہوں نے مذہبی شخصیت کی زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے تاریخی اعتبار سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔یہی وجہ ہے مخدوم اشرف جہانگیری کی یہ سوانح عمری مقصدیت اور مذہب کی تبلیغ اور جوش وخروش کے بیان اور اس کی تشہیر تک محدود ہو کر رہ گئی۔

☆☆☆

حواشی:

(۱)ڈاکٹر عبدالقیوم، سوانح نگاری کا فن، از، اردو نثر کا فنی ارتقا، فرمان فتح پوری، ص۔۳۱۸

(۲)ڈاکٹر ممتاز فاخرہ، بحوالہ، ڈاکٹر عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، ص۔۲۱۵

(۳)ڈاکٹر سید عبدالباری، مقدمہ، اشرف جہانگیر، ص۔۷

(۴)ڈاکٹر سید عبدالباری، مقدمہ، اشرف جہانگیر، ص۔۸۔۹

(۵)ڈاکٹر عبدالقیوم، سوانح نگاری کیا ہے، از، اردو نثر کا فنی ارتقا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص۔۳۱۹

(۶)ڈاکٹر سید عبدالباری، اشرف جہانگیر، ص۔۴۲

(۷)ڈاکٹر عبدالقیوم، سوانح نگاری کیا ہے، از، اردو نثر کا فنی ارتقا، فرمان فتح پوری، ص۔۳۲۰

(۸)ڈاکٹر سید عبدالباری، اشرف جہانگیر، ص۔۱۶

(۹)ڈاکٹر سید عبدالباری، مقدمہ، اشرف جہانگیر، ص۔۱۰

(۱۰)ڈاکٹر عبدالقیوم، سوانح نگاری کیا ہے، از، اردو نثر کا فنی ارتقا، فرمان فتح پوری۔ص۔۳۲۴

(۱۱)ڈاکٹر سید عبدالباری، اشرف جہانگیر، ص۔۶۳

(۱۲)ڈاکٹر عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب فن اور روایت، ص۔۲۲۸

(۱۳)ڈاکٹر سید عبدالباری، مقدمہ، اشرف جہانگیر، ص۔۱۰

باب چہارم (ج)

ڈاکٹر سید عبدالباری کے سفرنامے کا فنی و تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر سید عبدالباری نے ایک سفر نامہ ''جلوے ہیں بے شمار'' بھی تحریر کیا ہے۔ یہ سفرنامہ عام سفرناموں سے مختلف مذہبی قسم کا ہے، جوانہوں نے حج بیت اللہ کی سعادت پر گھر واپسی کے بعدتحریر کیا تھا۔ ڈاکٹرعبدالباری کو یہ سعادت ۲۰۰۵ء میں نصیب ہوئی تھی ،مگر اس کتاب کی اشاعت دو سال بعد ۲۰۰۷ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے ہوئی ۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے، ڈاکٹر عبدالباری صاحب نے اسے تحریر کرنے میں دوسال کا وقفہ لگایا ہے۔اس مدت میں کئی یادیں جو تازہ تھیں بھول گئیں ہوں گی ،مگراس سفرنامہ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات کہیں بھی ظاہر نہیں ہوتی کہ عبدالباری صاحب سے کہیں کوئی واقعہ بیان کرنے سے رہ گیا ہو۔انہوں نے ترتیب وار سبھی واقعات اور ارکانِ حج کی تفصیل سے منظرکشی اس سفرنامے میں بہترین اسلوب میں پیش کی ہے۔ڈاکٹرعبدالباری نے اس سفرنامے میں پسِ سفرتکنیک کو میں اپنایا ہے۔اس تکنیک میں مصنف اپنے ذہن میں سبھی واقعات ومشاہدات کومحفوظ کرلیتا ہے اور گھر واپسی کے بعد اپنی ذہنی گرہ کھولتا ہے اوراسے جو بھی منظر یا واقعہ یاد آتا ہے وہ اسے صفحۂ قرطاس پر ترتیب وار لکھتا چلا جاتا ہے۔سفر سے واپسی کے بعد مصنف کے پاس وقت بھی زیادہ ہوتا ہے،اس لئے وہ ہر منظراور واقعے کی تراش خراش میں خاصہ وقت صرف کرتا ہے اور اسے اپنے تخیل کے ذریعے پرکشش بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ عبدالباری کے اس سفرنامے کو منظر عام پر آنے میں کافی تاخیر ہوئی ۔یہی طریقہ کار عام طور سے حج کے سفرناموں میں زیادہ مقبول ترین بھی ہے۔اس تکنیک کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹرمحمد شہاب الدین لکھتے ہیں:

> ''اس تکنیک میں حج نامہ نگار مشاہدات وتاثرات سفرکچھ یادداشت کی شکل میں، اور کچھ اپنے ذہن میں محفوظ کرلیتا ہے۔اس طرح سفر سے واپسی پر اپنی یادداشت اور ذہنی حافظے کی مدد سے عموماً وہ اپنا منثور اور کبھی کبھی منظوم سفرنامہ ترتیب دیتا ہے''۔ا

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس پسِ سفرتکنیک کو بروئے کار لاتے ہوئے،اس سفرنامے کو مربوط انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے تسلسل کو خوبصورتی کے ساتھ برقرار رکھا ہے۔یہی دلکشی اور خوبصورتی اس سفرنامے کی دلچسپی کا باعث بھی ہے۔ یہ سفرنامہ دو سال کی تاخیر کے بعد منظرِ عام پر ضرور آیا،مگراس کی تازگی میں کمی کا احساس ذرا بھی نہیں ہوتا ہے۔ جب ہم اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے،سب کچھ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔دراصل عبدالباری نے جو کچھ بھی لکھا وہ اپنی یاد کو تازہ کرتے ہوئے صداقت کے ساتھ عقیدت کے جذبے سے سرشار ہوکر لکھا ہے،یہی حقیقت بیانی اس سفرنامے کی اصل جان ہے۔

سفر نامے میں عام طور سے جب کوئی شخص کسی سفر پر جاتا ہے تو وہ اپنے سفر کے دوران مختلف تجربوں، پریشانیوں اور تکلیفوں سے دوچار ہوتا ہے،اس کے علاوہ وہ کچھ مناظر اور کیفیات ومشاہدات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔مسافر اگر کوئی ادیب یا حساس شخص ہوتا ہے تو وہ اپنے ان تجربات ومشاہدات کو اپنے انداز میں بہترین اسلوب کے ساتھ تحریر کرتا ہے۔جو سفر نامے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔سفر نامے سے متعلق ڈاکٹر عمر رضا لکھتے ہیں؛

> ''سفر نامہ اس صنف کو کہتے ہیں جس میں سفر نامہ نگار کسی خاص مقام یا علاقے کی سیر کرنے کے بعد اس سے حاصل شدہ تجربات واحساسات کو کچھ اس انداز میں میں پیش کرتا ہے جس سے قارئین سفر نامہ نگار کے ساتھ خود کو سفر کرتا ہوا محسوس کریں۔''۲

غرض سفر نامے میں منظر کشی کو اہم مقام حاصل ہے،جس میں سفر نامہ نگار عمارتوں ،لوگوں کے رہن سہن ،ان کی سماجی اور اقتصادی زندگی کے بہت سے مسائل کو بیان کرتا ہے۔ان سب واقعات کی منظر کشی کرنے میں مصنف کے مشاہدے کی ایک الگ اہمیت ہوتی ہے،بغیر اس کے کوئی بھی سفر نامہ دلچسپ نہیں بن سکتا ہے۔جس کا مشاہدہ جتنا قوی ہوگا،اس کی منظر کشی اتنی ہی دلکش اور موثر ہوگی اور سفر نامہ اتنا ہی اہم اور معیاری سمجھا جائے گا۔اس ضمن میں انور سدید لکھتے ہیں؛

> ''سفر نامہ ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں مشاہدے کی قوت سب سے زیادہ روبہ عمل آتی ہے یہ صنف علم تاریخ اور علم جغرافیہ کے فنی مقاصد کے لئے میکانیکی انداز میں کوائف جمع نہیں کرتی ، بلکہ ایک مربوط ،دل چسپ اور خوش گوار بیانیہ مرتب کرنے کے لئے ان سب سے فائدہ ضرور اٹھاتی ہے۔سفر نامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھتا ہے اور زندگی کے مشاہدے کو سفر نامے میں یوں منتقل کر دیتا ہے کہ آنے والا زمانہ اس دور کی روح اور کا تحرک محسوس کر لیتا ہے۔اور اس میں کامیابی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب سفر نامہ نگار ادب کے جملہ تقاضوں سے بخوبی واقف ہو اور مشاہدے کو تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی قوت رکھتا ہو۔''۳

حج کے سفر ناموں میں مشاہدے کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے،مگر اس میں مذہب اور

عقیدت مندی کے عنصر شامل ہوتے ہیں اس لئے اس کی نوعیت اور مشاہدے عام سفرناموں سے ذرا مختلف ہوتے ہیں۔اس میں سفرنامہ نگار ایک دائرے میں مقید ہوتا ہے اور انہیں دائروں میں رہ کر اسے منظر کشی کرنی ہوتی ہے۔اس نکتے کے پیش نظر ڈاکٹر سید عبدالباری نے گھر سے روانگی سے لے کر واپسی تک کے سبھی واقعات کی منظر کشی کی ہے۔جس میں انہوں نے لکھنو ائیر پورٹ، پھر پرواز کے دوران ان کے جو خیالات و مشاہدے تھے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ پھر وہاں جدّہ ائر پورٹ اور اس کے بعد مکہ مکرمہ اور خانہ کعبہ،عرفات ومنی،رمی ،مزدلفہ اور مدینہ سبھی مقامات کے آثار قدیمہ اور اس کا پس منظر، جنت البقیع کی زیارت ان سب کے احوال اس سفرنامہ میں تفصیل وتسلسل کے ساتھ قلم بند کئے ہیں۔عام طور سے سبھی حاجیوں نے اپنے سفرناموں میں انہیں چند مقامات کی منظر کشی کی ہے،جس کے سبب حج سفرنامے کا موضوع ایک دائیرے میں سمٹا ہوا معلوم ہوتا ہے۔اسی لئے حج کے سفرناموں کو عام سفرناموں سے ذرا مختلف سمجھا جاتا ہے۔

ان متعین مقامات میں یکسانیت ہونے کے باوجود لکھنے والوں کے تجربات ومشاہدے مختلف ہوتے ہیں ۔ہر سفرنامہ نگار ان ہی مقامات ومناظر کی منظر کشی اپنے انداز میں کرنے کی آزادی رکھتا ہے۔وہ اپنے جذبات اور نقطۂ نظر سے ان مقامات اور مشاہدات کو رقم کرتے ہوئے اپنا الگ تاثر اپنے مخصوص انداز و پیرائے میں پیش کرتا ہے۔یہی وجہ ہے ایک ہی مقام وملک کو بار بار موضوع بنائے جانے کے باجود اس میں تکرار نہیں دیکھنے کو ملتی۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے بھی اپنے اس سفرنامے کو اپنے مخصوص نظریات، خیالات اور مشاہدات کی روشنی میں تحریر کیا ہے۔انہوں نے وہاں کے پر کشش مناظر،مقامات، وہاں کی طرزِ معاشرت کی تفصیل اپنے مخصوص انداز میں پیش کی ہے۔اس طرح مقامات حج کے مشاہدات وتاثرات،مکہ کے حالات ومعاشرت کے بیان اور خانۂ کعبہ ومسجدِ نبوی کے روح پرور تذکرے کے ساتھ ساتھ انہوں نے متبرک مقامات وزیارات کا ذکر بھی اس سفرنامے میں کیا ہے۔جب ہم ان مقامات کا ذکر پڑھتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے عبدالباری کے ساتھ ہم بھی ان مقامات کی زیارت کر رہے ہوتے ہیں،ایک اچھے سفرنامے کی یہی خصوصیت بھی ہے کہ قاری مصنف کے ساتھ محوِ سفر ہو جائے۔

گویا ’’جلوے ہیں بے شمار‘‘ میں منظر کشی اس کی نمایاں صفت ہے۔جب آپ اس کتاب کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اس کے اندر صرف جلوے ہی جلوے نظر آئیں گے۔ڈاکٹر عبدالباری نے ہر منظر ہر واقعے کی تصویر کشی بہترین انداز میں صداقت کے ساتھ کی ہے،جس میں کہیں بھی ان کے تصور کی آمیزش نظر نہیں آتی

ہے۔ان مناظر کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے سفرنامے میں واقعات کے ربط و تسلسل کا بطورِ خاص خیال رکھا ہے، جس سے کہیں بھی بدمزگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔انہوں نے ہر منظر کو موقع محل کے لحاظ سے مناسب الفاظ اور اسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے، جس سے اس ماحول کی تازگی اور شگفتگی کا احساس آج تک قارئین کو اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے ہے۔مثال کے طور پر جب ان کی نظر خانہ کعبہ پر پہلی بار پڑتی ہے، اس کی منظر کشی جس انداز میں کرتے ہیں پڑھنے والے کو احساس ہوتا ہے، وہ بھی کعبۃ اللہ کی زیارت کر رہا ہے:

''عبدالسلام میں داخل ہوئے تھے کہ وہ وقار پر جلال و پرشوکت گھر ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ہمارے قدم ٹھہر گئے۔سیاہ غلاف سے ڈھکے ہوئے اس مرکز جاہ وجلال پر نظر پڑتے ہی ہمارے دست دعا بلند ہو گئے، اس گھر کے مجد و شرف کی بے شمار داستانیں بچپن سے سنتے آئے تھے۔آج یہ آنکھوں کے سامنے تھا۔سیاہ پتھروں سے بنا ہوا نہایت سادہ سودہ چوکر گھر کمرہ جس میں نہ روشن دان ہے نہ کھڑکیاں ایک دروازہ وہ بھی مقفل۔مگر اس کی سادگی میں بھی یہ دل کھبا جا رہا تھا، عجب وقار، عجب عظمت، عجب نورانیت گویا فرشتوں نے اس عرش بریں سے لاکر انسانوں کی دلجوئی کے لئے زمین پر رکھ دیا ہے۔

یہ سیاہ پتھروں سے بنا ہوا چوکور کمرہ حرم شریف کی عالیشان دومنزلہ عمارت کے درمیان اس طرح مسندنشیں ہے جیسے کسی قیمتی انگوٹھی میں کوئی بیش قیمت سیاہ پتھر آویزاں ہو جس سے بے شمار کرنیں پھوٹ رہیں ہوں ۔''۵

ایک اور منظر کشی ملاحظہ ہو، جس میں انہوں نے عرفات کے میدان اور حج کے ایک اہم رکن کی منظر کشی کی ہے۔اس اقتباس میں منظر کشی کا انداز پہلے سے زیادہ پرکشش معلوم ہوتا ہے۔اس مقام پر مصنف نے اپنے جذبات اور عقائد کی روشنی میں حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے سادگی اور شگفتگی کے ساتھ اپنے مشاہدات کی منظر کشی میں ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ تحریر میں دلکشی کے عنصر اور زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں:

''احرام کی حالت میں منیٰ کے خیمے تک سفر پھر منیٰ سے میدان عرفات میں حاضری ایک عجیب پر کیف سفر تھا۔عرفات خیموں اور شامیانوں کا ایک بہت بڑا شہر نظر آیا جہاں ۳۰،۴۰ لاکھ انسان مرد عورتیں اللہ اکبر کی صدا بلند کر رہے تھے۔تحرک اور قیام دونوں سے حج مرکب ہے۔طواف، سعی اور جمرات کی رمی تین ارکان حرکت کے متقاضی ہوتے ہیں باقی منیٰ مزدلفہ اور عرفات میں قیام ہی قیام۔سامنے جبل عرفات کی بلند

چوٹیاں اوراس کے سائے میں جبل رحمت ایسا محسوس ہور ہا تھا کہ مشیت نے اپنے محبوب پیغمبر کے آخری اور تاریخ ساز خطبہ کے لئے اسٹیج تیار کر رکھا ہے کہ وہ آ کر اپنا پہلا اور آخری خطبہ یہاں سے ارشاد فرمائے اوراس کے سامنے ۴،۵ مربع میل کا میدان ۔لوگ چیخ رہے تھے دعائیں مانگ رہے تھے، آرزوئیں اور تمنائیں بیان کر رہے تھے۔کسی پر خوشی اور کسی پر خوف کی کیفیت طاری تھی۔عجب عالم اضطراب تھا۔مگر نہ جانے کیوں مجھ پر سکون و اطمینان کی کیفیت طاری تھی۔عرب جو سخاوت میں طاق کہے جاتے ہیں مختلف خیموں میں ٹھنڈی مشروب کی بوتلیں اور کھانے پینے کی چیزیں تقسیم کر رہے تھے۔لوگ انہیں لپک لپک کر حاصل کر رہے تھے مگر ہم لوگوں پر بے نیازی طاری تھی۔نگاہ بار بار جبلِ رحمت کی طرف اٹھ رہی تھی جہاں بے پناہ ازدحام تھا۔''۶

منظر کشی کے حوالے سے ایک اور اقتباس پیش کیا جا رہا ہے جس میں انہوں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی فضا کا موازنہ کرتے ہوئے اپنے مشاہدے کی روشنی میں دونوں شہروں کی بہترین مرقعہ کشی کی ہے۔جس میں ذات نبوی کی قربت اوران سے وابستگی کے سبب یہاں ان کے اسلوب میں پہلے سے کہیں زیادہ تازگی اور رعنائی نظر آتی ہے:

''مدینہ کی فضا کافی خوش گوار تھی۔بادل آسمان پر آتے تھے اور گاہے گاہے بارش ہوتی تھی۔مکہ کی فضا میں عجب جاہ وجلال تھا۔چٹانوں اور پہاڑوں ،وادیوں اور گھاٹیوں کے بیچ میں کھردرے سیاہ پتھروں کے نہایت سادہ سودہ گھر کے سامنے سارے انسان حقیر نظر آتے ہیں جو والہانہ اس گھر کا طواف کرتے ہیں۔بڑے بڑے کج کلاہوں اور ارباب جبہ ودستار کی پگڑیاں یہاں اتر جاتی ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس گھر کے مالک کو تزک و احتشام اور شان وشوکت اپنے کسی بندے کی پسند نہیں۔ایسا لگتا ہے کہ اسے فقر سے بے حد انس ہے اور فقر کے جلوے اس کے گھر کی در و دیوار سے جھلکتے ہیں۔لیکن مدینہ میں انسان خود کو ہر طرح کے بوجھ (tension) سے آزاد اور ایک عجیب دوستانہ ماحول میں خود کو محسوس کرتا ہے۔ ہر شئے سے انس ومحبت کی خوشبو آتی ہے ہر طرف لطافت اور خوشگواری کے منظر نظر آتے ہیں۔''۷

منظر کشی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ایک کامیاب سفر نامۂ حج ہے۔''جلوے ہیں بے شمار'' میں ڈاکٹر

سید عبدالباری نے منظر کشی کے ساتھ اپنے داخلی احساسات، جذبات اور کیفیات کا اظہار کرنے میں بھی پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہ کسی واقعے یا منظر کی عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں، اس کے فوراً بعد اپنے اندر جو خیال پیدا ہوتا ہے، اس کی بھی وضاحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سفرنامے میں اپنے اندر سے ابھرنے والے انہی خیالات کے اظہار کو داخلی کیفیت یا قلبی تاثرات کہتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنی داخلی کیفیت کا اظہار منظر کشی کے سہارے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے یہ احساس سفرنامے پر پوری طرح قادر ہے۔ اس سفرنامے سے ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے، جس میں عبدالباری نے نفلی حج اور کچھ ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جو وہاں دھما چوکڑی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں گویا وہ حج نہیں بلکہ کوئی دینی پکنک منا رہے ہوں۔ ایسے لوگوں پر وہ اپنے داخلی اور قلبی تاثر کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نصب العین اگر بلند نہ ہو تو انسان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں الجھ کر بڑے مقاصد اور مشن کو بھول جاتا ہے۔ اب حج ہی کو لیجئے۔ اسے کچھ لوگوں نے سوداگری بنا لیا ہے۔ سوداگری اور وہ بھی خدا سے۔ نفلی حجوں کا اس قدر دولت مند انسانوں کو جنون ہے جس طرح ہمارے ممبر پارلیمنٹ پیرس، لندن اور دیگر ممالک میں عیش کرنے کے مختلف بہانے تلاش کرتے ہیں اسی طرح حج کے لئے ہزار بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں اور اس رقم سے کوئی ایسا کام کر جانے کی اہل ایمان کو فکر نہیں ہوتی جو اسلام کو سر بلند اور ان کی شخصیت کو تابناک بنا سکے۔ یہی لوگ مدینہ میں جنت کی کیاری اور حرم میں ملتزم اور میزاب رحمت کے قریب چبوترے اور حجرِ اسود کے نزدیک عبادت کے لئے وہ دھما چوکڑی کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ حرم شریف میں انسان کو سوداگر بن کر نہیں جانا چاہئے مگر کچھ لوگ اس انداز سے جاتے ہیں گویا کوئی فٹ بال کا کھلاڑی گول کرنے کے لئے آگے بڑھ رہا ہو۔ وہ دوسروں کو دھکا دے کر اگر بہشت ملے تو اسے حاصل کرنے میں تامل نہیں کرتے حالانکہ وہ ایسے مذہب کے پیرو ہیں جو تعلیم دیتا ہے کہ دل بدست آوری کہ حج اکبر است۔ کچھ لوگ کو کھانے کی فکر، کسی کو پانی کی طرح بہتے ریال کی فکر کسی کو زیادہ سے زیادہ تحائف جمع کرنے کی فکر۔ اگر فکر نہیں تو کسی انسان کا دل جیتنے کی فکر۔ اپنے نفس اور اپنے ذوقِ تلذذ کے اہتمام میں جو گرفتار ہوتے ہیں وہ ماحول سے کٹ جاتے ہیں۔ ہر وقت یہی فکر کہ کون سا ہوٹل اچھا ہے۔ پاکستانی مرغ لذیذ ہے یا ترکش ڈشیں اچھی ہیں۔ حالانکہ اسی شہر میں سستی اور لذیذ پکی روٹیاں اور سبزی و دال بھی بہ کثرت قابلِ حصول ہے۔ کاش حرم شریف کی دیوار تلے بیٹھ کر چٹنی روٹی کھانے میں لوگوں کو وہی مزہ آتا جو حرم شریف کے اندر رکوع و

سجود میں آتا ہے۔''[۸]

ڈاکٹر سید عبدالباری کی حیثیت اسلامی ادب ونظریات کے حامل اسکالر کی ہے، اس لئے انھوں نے جو کچھ بھی لکھا اسی کے دائرے میں رہ کر لکھا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کو مغربی تہذیب وتمدن اس کی مادیت پرستی اور عریاں زندگی سے حد درجہ نفرت تھی اور وہ زندگی بھر مادیت، کفریت اور اہلِ مغرب کے طرزِ تمدن کے خلاف ڈٹ کر لکھتے رہے، یہاں تک کہ ادب میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت اور ساختیات کی بھی مخالفت کرتے رہے، اس کے برعکس اپنے اداریوں میں بھی اس کا اظہار کیا ہے۔ غرض ہر ادیب یا فکشن نگار کا اپنا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے، جو اس کی ہر تحریر میں کسی نہ کسی شکل میں واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عبدالباری صاحب کا یہ نقطۂ نظر ان کی ہر تحریر میں صاف طور پر نمایاں ہو ہی جاتا ہے۔ اس سفرنامے بھی انھوں نے اپنے قلبی تاثرات میں مکہ کی طرزِ معاشرت اور اس کی تہذیب کا موازنہ مغربی تہذیب سے کیا ہے۔ ان کا یہ نقطۂ نظر اس تصنیف میں مختلف مقامات پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس حاضر ہے:

''ہم کھلی آنکھوں سے اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے فرق کو دیکھ اور محسوس کر رہے تھے۔ طواف میں نماز میں، سعی میں بازاروں مکہ میں عورت اور مرد دونوں ساتھ ساتھ مگر بقول ممتاز مفتی یہاں عورت نہ جنس ہے نہ حسن ہے اور نہ جسم بلکہ ایک پاکیزہ روح۔ اسلام کے اندر عجب طاقت ہے کہ وہ نگاہوں کی طہارت اور قلب کی پاکیزگی سے انسان کی قلب ماہیت کر دیتا ہے۔ حرم میں ہمیں صرف ایک محبوب نظر آتا ہے اور وہ ذات وحدہ لاشریک۔ مومن کا دل حرم کی مانند ہے جس میں صرف اسی کی گنجائش ہے۔ یہاں ۳۰، ۴۰ لاکھ انسانوں کا ہجوم صرف ایک خیال ایک آرزو ایک تمنا سے سرشار نظر آیا یعنی اپنے پروردگار کو کس طرح خوش کیا جائے، ۴۰، ۵۰ لاکھ دل صرف ایک آرزو ایک جذبہ سے دھڑکتے نظر آتے ہیں کہ وہ جو سب سے زیادہ جمیل وکریم مگر سب سے بڑا قہار وجبار بھی ہے اسے کیسے خوش کیا جائے۔ اگر مغرب ہوتا تو یہاں عورتوں کا یہ سارا ہجوم غلاظت کا ڈھیر بن کر سامنے آتا۔ بقول ممتاز مفتی مغربی عورت گویا ایک نشر گاہ ہوتی ہے جس میں ایک ٹرانسمٹر لگا ہوتا ہے جو نشر کرتا ہے میری طرف دیکھو، میں کس قدر جنسی کشش (sexy) رکھتی ہوں۔ مردان عریاں عورتوں کو گلی کوچوں پارکوں میں درندوں کی طرح گھورتے ہیں اور اس پر ٹوٹ پڑنا چاہتے ہیں، ان کے ادب ان کی صحافت، ان کی فلمیں ان کے جتماعی مراکز جنس زدہ انسانوں کی جنسی دھماچوکڑیوں کا ایک عبرتناک منظر پیش کرتے ہیں حیرت

ہے کہ حیوانی تہذیب آج اسلامی تہذیب کا فرد کی آزادی کے نام پر مذاق اڑا رہی ہے۔شاید یہ مسلمانوں کی عسکری کمزوری اور قوت و جبروت سے محرومی کا نتیجہ ہے کہ ان کا سونا بھی مٹی بن گیا ہے اور دوسروں کی غلاظتیں بھی ہیرے جواہرات کی قیمت بک رہی ہیں۔'' ۹

اس سفر نامے میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے جا بجا ممتاز مفتی کے حج سفر نامے ''لبیک'' اور عبدالماجد دریا آبادی کے سفر نامے ''سفرِ حجاز'' سے استفادہ کیا ہے۔بعض اوقات انہوں نے اپنی بات پوری کرنے کے لئے ان کے جملوں یا ان کے اقتباس کا سہارا لیا ہے، جس کے سبب سفر نامے کو دلکش بنانے کی پرزور کوشش کی گئی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔حج کے سفر ناموں میں عازمین حج کی حیثیت ایک عام سفر ناموں کے مقابلے میں ایک زائر کی ہوتی ہے یہاں وہ نہ سیاح ہے اور نہ مسافر۔البتہ ایک زائر میں یہ دونوں صفات ضرور موجود ہوتی ہے۔ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسافر اس معنی میں کہ اس کی منزل متعین ہوتی ہے، وہ ایک مقصد سے بندھا ہوا ہوتا ہے اور اس سے انحراف نہیں کر سکتا ہے۔جب کہ سیاح اس شکل میں ہوتا ہے کہ خود پر مسافرت کی کیفیت طاری ہونے کے باوجود وہ ایک عام مسافر سے الگ ، اپنے فارغ اوقات میں سرزمین حجاز میں قیمتی آثار موجودات کی تلاش میں معلوم و نامعلوم منزلوں کی طرف پھرتا نظر آتا ہے۔'' ۱۰

اس سفر نامے میں ڈاکٹر سید عبدالباری ایک زائر کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کا مقصد صرف حج اور عبادات ہے۔اس کے علاوہ وہ تاریخی مقامات کی زیارت کے آرزومند بھی ہیں۔اپنی اس خواہش کی تکمیل میں وہ سبھی تاریخی مقامات پر جاتے ہیں اور ہر منظر کو بڑے شوق اور حیرت سے دیکھتے ہیں۔سفر نامے میں ان مقامات کی منظر کشی کرتے ہوئے، اس کے پس منظر کو واقعات کو روشنی میں مختصراً بیان کیا ہے۔مثال کے طور پر جب وہ خانہ کعبہ کو دیکھتے ہیں تو ان کے ذہن میں حضرت ابراہیم اور ان کے سعادت مند بیٹے حضرت اسماعیل کا پورا واقعہ تازہ ہو جاتا ہے اور وہ اس کی پوری تفصیل لکھ کر قارئین کو اس واقعے سے روشناس کراتے ہیں۔پورے سفر نامے میں جن مقامات کا بھی ذکر آیا ہے، اس کی پوری تاریخ انہوں نے کم لفظوں میں بیان کر دی ہے۔یہ اس سفر نامے کی ایک اور اہم خصوصیت ہے۔جس سے قاری کو اگر اس کا علم نہیں ہوتا تو اس سفر نامے کے مطالعے سے

اس کے علم میں ایک نئی بات کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً جب وہ مسجدِ قبا میں جاتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اس مسجد کے پس منظر کا واقعہ وہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنے کا اجر عمرہ کے اجر کے مساوی ہے۔ اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی یہی مسجد ہے جو رسول اکرمؐ نے تعمیر کی۔ مکہ سے ہجرت کر کے جب آپ مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے قیام اسی مقام پر فرمایا اور اس مسجد کی تعمیر شروع کر دی اور صحابہ کرام نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ مفسرین کا خیال ہے قرآن حکیم میں جس مسجد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر ہے وہ یہی مسجد ہے۔ حضور اکرمؐ ہر دوشنبہ کو اس مسجد میں تشریف لے جاتے تھے۔ یہ مسجد نبوی سے ۴ء۳ کیلومیٹر کی دوری پر ہوگی۔''۱۱

اس طرح ڈاکٹر سید عبدالباری ایک زائر کی مانند پورے سفر نامے میں سفر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور معلوم اور نا معلوم مقامات کی زیارت کرتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ وہ مکہ مکرمہ بیت اللہ، عرفات، غارِ حرا، غارِ ثور، مسجدِ قبا، مسجدِ نبوی، گنبدِ خضریٰ، منیٰ اور متعدد مقام کی زیارت کرتے ہوئے غیر معمولی روحانی سرور اور وجد و حال کی کیفیت سے سرشار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے، دورانِ حج جن مقامات اور آثارِ قدیمہ کی زیارت کے سبب جو روحانی انبساط اور سکون میسر ہوا ہے وہ انہیں اس دنیا میں کہیں اور نہیں حاصل ہوا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جو عام سفر ناموں کے سیاح کو کبھی نصیب نہیں ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس سفر نامے میں واقعات و مشاہدات کو بلا کسی آرائش و زیبائش کے ساتھ بے تکلفانہ انداز میں نہایت سادگی اور صداقت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کے اسی اندازِ بیان کی وجہ سے اس تصنیف میں موجودہ عہد کے حجاز کی حقیقی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے وہاں کے حالات ،قانون، انتظام و انصرام اور گھر لوٹنے تک کے سبھی واقعات کو پیش کیا ہے، جس سے آئندہ جانے والے زائرین کو رہنمائی بھی حاصل ہوگی۔ جن مشکلات اور مسائل سے عبدالباری صاحب دوچار ہوئے ہیں کم سے کم اس سفر نامے کو پڑھنے کے بعد وہ اس سے آگاہ ہو جائے اور آئندہ اس سے بچنے کے لئے کوئی تدبیر نکال ہی لے گا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے، انہوں نے اس حج سفر نامے کو ایک گائڈ یا ٹورسٹ کے انداز میں تحریر کیا ہے بلکہ یہ اس سفر نامے کی ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ انہوں نے اس میں اپنے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس سفرنامے میں سعودی عرب (حجاز) میں مقیم اپنے کچھ دوستوں اور شخصیتوں کا بھی ذکر کیا ہے اور ان سے ملاقات اور ان کی ضیافتوں کو بھی تحریر کیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنے سعادت مند بیٹے شارق ہلال کا بھی ذکر کیا ہے، جو وہاں پہلے سے مقیم تھے اور دورانِ حج اپنے والدین کے ساتھ وہاں ان کی خدمت میں ہر لمحہ موجود تھے۔جس کے سبب انہیں حج کے ارکان اور کئی مشکل مراحل میں کافی آسانیاں میسر ہوئیں، جس کی وضاحت عبدالباری نے اس سفرنامے میں رقم کی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے گھر سے رخصت ہوتے وقت اور لکھنؤ تک کے سبھی اہلِ خانہ اور رفقاء کی بھی ذکر کیا ہے۔جس میں ان کے بیٹوں، بیٹیوں اور داماد کا نام اور ان کی خدمات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔

''جلوے ہیں بے شمار'' میں عبدالباری صاحب کی زبان و اسلوب نہایت سادہ اور روانی سے پر ہے۔کہیں بھی کوئی الجھاؤ یا کوئی مشکل لفظ پڑھنے کو نہیں ملتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے سفرنامے میں موجودہ عہد کے عام قاری کو ذہن میں رکھتے ہوئے، اسی اسلوب کا اپنایا ہے، جسے وہ بہ آسانی سمجھ سکے۔ڈاکٹر عبدالباری نے اپنے موضوع کے اعتبار سے ایسی زبان واسلوب اختیار کیا ہے، جس سے روحانی کیفیت کی بھرپور ترجمانی ہو سکے۔یعنی مشاہدات و کیفیات کو پیش کرنے میں انہوں نے جو اسلوب اختیار کیا ہے، اس کے سبب سفرنامے کے حسن اور دلکشی میں اضافہ ہوا ہے، جس سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔اس کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے، انہوں نے اپنے تاثرات اور تجربات کے اظہار میں سادگی اور صداقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔کسی بھی مشاہدے یا واقعے اور داخلی تاثرات کا اظہار انہوں نے نہایت سادگی ،سلاست اور روانی کے ساتھ کیا ہے۔کہیں بھی اپنے تخیل کے ذریعے کسی بھی واقعے میں رنگ آمیزی نہیں کی ہے اور مبالغہ آرائی سے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے اپنے دامن کو پاک رکھا۔اسی سبب دس سال بعد بھی جب ہم اس سفرنامے کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے آج بھی اس کی تازگی برقرار ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈاکٹر سید عبدالباری کا یہ سفرنامہ منظر کشی کے حسن ،واقعات و مشاہدات کی حقیقت بیانی، زبان و اسلوب میں ادبی محاسن کی آمیزش اور اس عہد کے حجاز کی تصویر کشی کے نقطۂ نظر سے اردو ادب میں خاص اہمیت و مرتبے کا حامل ہے۔

☆☆☆

حواشی

(۱) ڈاکٹر محمد شہاب الدین، اردو میں حج کے سفر نامے، ص۔۴۳

(۲) ڈاکٹر عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، ص۔۷۵

(۳) ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب میں سفر نامہ، ص۔۵۹

(۵) ڈاکٹر سید عبد الباری، جلوے ہیں بے شمار، ص۔۱۴،۱۵

(۶) ڈاکٹر سید عبد الباری، جلوے ہیں بے شمار، ص۔۲۶

(۷) ڈاکٹر سید عبد الباری، جلوے ہیں بے شمار، ص۔۴۹

(۸) ڈاکٹر سید عبد الباری، جلوے ہیں بے شمار، ص۔۳۷

(۹) ڈاکٹر سید عبد الباری، جلوے ہیں بے شمار، ص۔۳۶

(۱۰) ڈاکٹر محمد شہاب الدین، اردو میں حج کے سفر نامے، ص۔۳۸

(۱۱) ڈاکٹر سید عبد الباری، جلوے ہیں بے شمار، ص۔۵۰

باب پنجم

سید عبدالباری کی صحافتی خدمات

ڈاکٹر سید عبدالباری کی ایک شناخت دیدور صحافی کی بھی ہے۔انہوں نے تنقید اور تحقیق کے بعد جس صنف پر سب سے زیادہ توجہ مرکوز کی وہ صحافت ہے۔صحافت سے انہیں کافی دلچسپی تھی، تاعمر اس میدان میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ڈاکٹر سید عبداالباری نے بڑی محنت ومشقت، مسلسل مشق اور جدو جہد کی بدولت اس میدان میں اعلیٰ مقام ومرتبہ حاصل کیا۔انہوں نے اپنے قلم سے جو کچھ بھی لکھا جرأت اور حوصلہ مندی کے ساتھ لکھا، دیانتداری کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ڈاکٹر عبدالباری نے صحافت کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے نہیں اختیار کیا تھا بلکہ قوم وملت کی فلاح و بہبود اور ان کی اخلاقی ومعاشرتی اصلاح ان کا اصل مقصد تھا جس کو وہ صحافت کے ذریعے انجام دے رہے تھے۔صحافت ایک ایسا میدان ہے، جہاں ڈاکٹر عبدالباری جیسا ذہین، حساس اور مخلص شخص ہی اپنے ان احساس وجذبات کی ترجمانی بہترین انداز میں کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، وہ قوم کے مخلص تھے اس لئے ان کی اصلاح کے فکر میں ہمیشہ ڈوبے رہتے تھے۔اس کے ہر دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے۔اپنے آس پاس کے حالات سے انہیں گہری واقفیت تھی۔لہذا انہوں نے اپنے انسانی واخلاقی فرائض کو انجام دیتے ہوئے اپنے اداریوں اور صحافتی مضامین کے ذریعے لوگوں کو بیدار کرنے کا کام کیا اور انہیں راہِ راست پر لانے کے لئے مختلف رسالوں اور اخبارات میں تسلسل کے ساتھ مضامین قلم بند کرتے رہے۔ایک اچھے صحافی کے لئے قوم سے ہمدری، معاشرتی زندگی سے انسیت اور ملک میں ہونے والے ہر چھوٹے بڑے واقعات سے واقفیت بے حد لازمی ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے اندر یہ ساری خصوصیات بدرجۂ اتم موجود تھیں۔یہی وجہ ہے انہوں نے اپنی صحافتی زندگی میں جتنے اداریے اور مضامین لکھے ہیں ان کے موضوعات لاتعداد اور مختلف ہیں۔شاید ہی کوئی ایسا سیاسی یا ملی موضوع ہو جس پر انہوں نے اداریہ نہ لکھا ہو۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کا شمار ان صحافیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی مسلسل کوشش اور خون جگر سے اس باوقار پیشے کو پروان چڑھایا اور اپنی صحافتی تحریروں اور مضامین کے ذریعے اس فن کو مجروح ہونے سے بچا لیا۔موجودہ عہد میں جس طرح کے مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں اس میں صرف تعصب اور جانبداری کی بو آتی ہے، اس میں ایک دوسرے پر الزام تراشی اور چھینٹا کشی کے علاوہ کسی مضمون نگار کو کچھ اور لکھنے کو نہیں ملتا۔ڈاکٹر عبدالباری نے اپنی تحریروں کو اس سے دور رکھا۔تعصب، حسد اور بغض کی پرچھائی تک ان کی تحریروں میں کہیں نظر نہیں آتی۔انہوں نے جو بات لکھی نہایت سلیقے اور استقلال کے ساتھ منطقی انداز میں سگفتگی کے ساتھ اسے پیش کیا۔جس سے قاری بآسانی ان کی باتوں کا قائل ہو جاتا ہے اور یہی ایک بہترین صحافی کا منصب بھی

ہے کہ وہ اپنے قاری کو اپنے نظریہ کا بہترین انداز بیان اور مدلل بحث کے ذریعے قائل کر لے۔ دراصل عبدالباری صاحب قلم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے، اس لئے کبھی انہوں نے اپنے قلم کا سودا نہیں کیا اور جو کچھ بھی لکھا پوری آزادی کے ساتھ لکھا۔ کسی سیاسی جماعت یا کسی رہنما کے دباؤ میں آ کر انہوں نے کبھی اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ انہوں نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے حق اور شر کے درمیان امتیاز کو اپنے کالم یا اداریوں میں ہمیشہ واضح کیا۔ ان کے اندر فرض شناسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لئے اپنے منصب کا خیال کرتے ہوئے کبھی حق اور باطل کو آپس میں خلط ملط نہیں کیا۔ حق کے لئے برابر آواز اٹھاتے ہوئے انہوں نے قوم کو بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

ڈاکٹر سید عبدالباری طالب علمی کے زمانے سے ہی صحافت سے منسلک ہو گئے تھے۔ جب انہوں نے ۱۹۵۵ء میں لکھنو یونیورسٹی میں بی اے میں ڈاخلہ لیا، اس وقت م نسیم کی ادارت میں رسالہ ''نئی نسلیں'' کی اشاعت ہوئی۔ یہ اپنے زمانے میں اعلیٰ درجے کا ادبی رسالہ تھا، جو ادب میں صحت مند قدروں کا ترجمان تھا اور تعمیری ادب کے ترجمان کی حیثیت سے شائع ہوتا تھا۔ م نسیم نے عبدالباری کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے ادارتی بورڈ میں شامل کر لیا اور وہ اپنے قلمی نام شبنم سبحانی سے آزاد نظم کے نگراں مقرر ہوئے۔ اب انہیں اپنے قلم کا جوہر دکھانے کا موقع فراہم ہوا اور اس وقت ان کی کچھ آزاد نظمیں اور کچھ مضامین رسالے کی زینت بننے لگے۔ اس سے قبل بھی ان کے کئی مضامین متعدد رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکے تھے، مگر ابھی تک انکی کوئی شناخت نہیں تھی۔ نئی نسلیں سے وابستگی کے بعد ادبی حلقوں میں ان کی ایک الگ پہچان بن گئی اور ادبی حلقے بہت جلدی ان سے مانوس ہو گئے۔

رام پور قیام کے دوران وہ ۱۹۵۷ء میں ادارۂ ادب اسلامی ہند کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس فریضے کو انجام دیتے ہوئے انہوں نے اسلامی ادب کے ترجمان کی حیثیت سے ایک رسالہ ''دانش'' کا اجرا کیا، جس کے لئے انہیں کافی محنت و مشقت کرنی پڑی اس محنت اور دوڑ دھوپ میں ان کے رفیق اور ادارہ الحسنات کے مالک عبدالحئی نے ان کا پھر تعاون کیا۔ ''دانش'' میں ڈاکٹر سید عبدالباری ''منزل بہ منزل'' کے عنوان سے دو سال تک متواتر پابندی سے کالم لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین اور شاعری بھی اس میں شائع ہوتی رہی۔ دانش کی اشاعت میں اس وقت کے تمام تعمیر پسند ادیبوں نے اپنا قلمی تعاون دیا اور ان کے اس کام کو کافی سراہا۔ اس رسالے میں مسلسل لکھنے والوں میں م نسیم، عبدالمغنی، ابنِ فرید، سید زین العابدین، عروج

قادری، اصغرعلی قادری کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ان مایہ ناز شخصیتوں کے علاوہ ملک کے اور بہت سے ادیب وشعرا اس رسالے کی زینت بنتے رہے،جس کے سبب پورے ملک میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی مگر دو سال بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔

رام پور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے گورکھپور یونیورسٹی سے ۱۹۶۳ء میں ایم اے انگریزی میں پاس کیا اور اس زبان پر خاصہ عبور حاصل کیا۔یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی زبان میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے والوں کو ملک میں بڑی اہمیت حاصل ہوا کرتی تھی۔اس وقت عبدالباری کی بھی اہمیت کچھ ایسی تھی۔ان کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے دہلی سے سے انہیں محمد یوسف صدیقی نے تقرری کے لئے ایک خط ارسال کیا۔جس میں انہیں انگریزی ہفتہ وار میگزین ریڈینس میں کام کرنے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔عبدالباری صاحب کو نوکری کی تلاش پہلے ہی سے تھی،اس لیے انہوں نے موقعے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ۱۹۶۳ء میں دہلی آ کر ریڈینس کے نئے ادارتی اسٹاف میں شامل ہو کر صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ریڈینس کا دفتر پرانی دہلی کے جامع مسجد کے پاس تھا،اس وقت رسالے کے مدیر انگریزی کے تجربہ کار صحافی ''اے رؤف'' تھے۔ڈاکٹر عبدالباری ان کے ساتھ تقریباً ایک سال تک کام کرتے ہوئے انگریزی زبان میں نیوز ومضامین لکھتے رہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری بہت جلدی انگریزی صحافت کی اس مشقت اور دشواریوں سے گھبرا گئے اور اس پیشے سے مستعفی ہو گئے۔یہاں سے نکلنے کے بعد کچھ دن وہ سیاسی مضامین لکھتے رہے۔یہ وہ دور تھا جب ۱۹۶۴ء میں پنڈت نہرو کا انتقال ہوا تھا اس وقت وہ دہلی میں ہی مقیم تھے اور ان کے آخری رسوم تک سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ان کے انتقال کے بعد ملک کی جو سیاسی صورت حال اور اتھل پتھل تھی،ان سب موضوعات کو انہوں نے اپنے متعدد مضامین میں قلم بند کیا اور کئی اخباروں اور رسالوں میں یہ شائع بھی ہوئے۔کچھ ہی دنوں بعد اسی سال اکتوبر کے مہینے میں انہیں آندھر پردیش سے نکلنے والے رسالے''افق''میں کام مل گیا اور وہ اس کے ادارتی بورڈ میں شامل ہو گئے اور پھر اس میں انہوں نے بعنوان''منزل بہ منزل'' کالم لکھتے رہے۔

فیض آباد کی ملازمت کے دوران انہوں ایک رسالہ اسلامی ادب کے ترجمان کی حیثیت سے نکالنے کا منصوبہ بنایا۔اس وقت ان کے بچپن کے دوست مختار احمد مظاہری ادارۂ اسلامی ہند کے صدر تھے اور ٹانڈہ میں مقیم تھے۔چنانچہ نومبر ۱۹۶۷ء میں ٹانڈہ سے مختار احمد مظاہری اور ڈاکٹر عبدالباری کی ادارت میں رسالہ''دوام'' کی اشاعت شروع ہوئی۔یہ رسالہ نئی نسلیں،معیار اور دانش کا تسلسل تھا۔اس وقت ٹانڈہ میں کوئی پریس نہیں تھا

اس لئے اس کی اشاعت لکھنؤ کے نامی پریس سے ہوتی تھی اور وہاں رسالہ ٹانڈہ آتا تھا۔اس کا اداریہ لکھنے کی ذمہ داری ڈاکٹر سید عبدالباری کی تھی ۔ یہ رسالہ دراصل ادارۂ ادب اسلامی کے ترجمان کی حیثیت سے نکلتا تھا اس لئے اس کے اداریہ میں انہوں نے اس عہد کے ادبی مسائل کو زیادہ موضوع بنایا ہے لیکن حالات کے پیشِ نظر انہوں نے سیاسی وسماجی مسائل پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے ۔ یہ رسالہ ہر مہینے بڑی پابندی سے شائع ہوتا تھا اس لئے اس نے تعمیر پسند اور مثبت نظریہ رکھنے والے سبھی ادیبوں ،شعرا اور قلم کاروں کو اپنی طرف بہت جلدی متوجہ کر لیا۔اس رسالے میں اس وقت کے سبھی معروف شعرا اور ادیبوں کی تخلیقات کو شائع کیا جاتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دوام اس وقت کے تعمیر پسند ادیبوں کا محور ومرکز بن گیا تھا۔مختلف موضوعات پر بحث ومباحثہ کا سلسلہ بھی چلا۔جس سے کسی موضوع سے متعلق نئی معلومات فراہم ہوا کرتی تھی اور قاری کو ان مضامین میں تازگی کا احساس ہوتا تھا۔اس کے علاوہ سیمینار وسمپوزیم کا بھی سلسلہ چلتا رہا اس رسالے کی اشاعت اور مقبولیت کے لئے انہوں نے سخت محنت کی ۔ اس کے لئے انہوں نے ملک بھر کا سفر کیا اور تمام ادیبوں اور شاعروں سے قلمی تعاون کے لئے مدد مانگی اور ان کے انٹرویوز بھی لئے ، جو دوام میں ہر مہینے پابندی سے شائع ہوتے رہے ۔ یہ رسالہ اسی آب وتاب کے ساتھ تقریباً چار سال پابندی سے نکلتا رہا۔پھر کسی وجہ سے ۱۹۷۱ء میں بند ہو گیا۔

دوام کی اشاعت کے بعد کچھ دنوں تک انہوں نے کسی رسالے میں کام نہیں کیا۔البتہ ان کے مضامین اخباروں اور رسالوں کی زینت بنتے رہے ۔کئی عرصہ گزر جانے کے بعد ڈاکٹر عبدالباری کے مشفق دوست م نسیم نے ۱۹۸۰ء میں نئی سلیں کی اشاعت دہلی سے ازسرِ نو شروع کی ۔جس میں یہ معاون مدیر کی حیثیت سے شامل تھے۔اس کے اداریے لکھنے کی ذمہ داری انہیں کے سر تھی ، چنانچہ ہر مہینے پابندی سے اداریہ لکھ کر سلطان پور سے مسلسل دہلی روانہ کرتے رہے۔فروری ۱۹۸۱ء میں اس کا دفتر علی گڑھ منتقل ہو گیا اور اس کے مدیر ابن فرید اور انجم نعیم ہو گئے حالانکہ ادارتی بورڈ میں عبدالباری کا نام بھی شامل تھا مگر اداریہ لکھنے کی ذمہ داری اب ان کی نہیں تھی ۔ یہ رسالہ دو سال نکلنے کا بعد ۱۹۸۳ء میں اس کی اشاعت بند ہو گئی ۔

اس کے تین سال بعد اکتوبر ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے ٹانڈہ سے نکلنے والے رسالے دوام کو ازسرِ نو ’’دوامِ نو‘‘ کے نام سے شائع کیا۔اس رسالے کی حیثیت ادبی اور صحافتی تھی ۔ یہ رسالہ پہلے سے کہیں زیادہ معیاری شکل میں نکلا۔اس وقت ٹانڈہ میں پریس بھی آ چکا تھا جس کی اشاعت اب ٹانڈہ کے نشاط پریس سے ہوتی تھی ۔ یہ پریس ان کا ذاتی تھا،جس کو ان کے بھائی چلاتے ہیں ۔مگر اس رسالے کا سرورق دہلی سے ہر مہینے

بن کر جاتا تھا۔اس طرح اس رسالے کو بڑی محنت ومشقت کے ساتھ ۱۹۹۰ء تک نکالتے رہے۔اس رسالے میں ادبی مضامین کے علاوہ سیاسی مضامین بھی شائع ہوتے رہے۔غرض اس رسالے کی اشاعت کا دائرہ پہلے سے زیادہ وسیع تھا جس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انگریزی رسالوں کی طرز پر نکالا جاتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ یہ رسالہ انگریزی کی میگزین کے ہم پلہ معلوم ہوتا ہے۔اس کا اداریہ وہ خود تحریر کرتے تھے۔اس کے اداریے نہ صرف ادبی ہوتے تھے بلکہ سیاسی موضوعات پر کھل کر لکھتے اور بعد میں اس پر بحث و مباحثہ بھی ہوتا۔مگر افسوس یہ معیاری رسالہ چار سال بعد بند ہو گیا۔

ڈاکٹر سید عبدالباری ۱۹۸۸ء میں ادارۂ ادب اسلامی ہند کے صدر منتخب ہوئے۔سلطان پور کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ دہلی میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر چکے تھے،مگر یہاں بھی انہوں نے صحافت کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔اگست ۱۹۹۳ء میں دہلی سے ادارۂ ادب اسلامی ہند کے زیر اہتمام پیش رفت جاری کیا۔اس رسالے کے پہلے مدیر عزیز بگھروی بنائے گئے۔جن کی ادارت میں یہ رسالہ کافی پروان چڑھا۔بعد میں ابنِ فرید،مغنی تبسم،منظر اعظمی،طیب عثمانی وغیرہ کئی لوگوں نے اس کے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔مگر اس رسالے کو عروج اس وقت حاصل ہوا جب ۲۰۰۲ء میں وہ خود اس کے مدیر منتخب ہوئے اور اس کی ساری ذمہ داریاں خود اپنے کاندھوں پر لے لیں۔دیکھتے ہی دیکھتے یہ رسالہ تعمیری ادب کے ترجمان کی حیثیت سے پورے ملک میں کافی مقبول ہو گیا۔آج بھی یہ رسالہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ بڑی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔اس میں ایسی تخلیقات شائع ہوتی ہیں جو اعلیٰ اقدار اور بلند مقاصد کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتی ہیں۔آج بھی یہ رسالہ ادب کے محاذ پر پاکیزہ اور صالح اقدار و افکار کے جن اعلیٰ مقاصد کے لئے جاری کیا گیا تھا اس کی روشنی چہار سو پھیلا رہا ہے۔اس رسالے میں ڈاکٹر سید عبدالباری ابتدا سے لے کر آخری سانس تک اہم ادبی، عصری مسائل پر اداریے تحریر کرتے رہے۔پیش رفت میں ان کے تحریر کئے ہوئے اداریوں کا مجموعہ ''روشنی بکھرتی ہے'' کے عنوان سے موجودہ معاون مدیر انتظار حسین نے مرتب کر کے شائع کیا ہے،جس میں عبدالباری کے اداریوں کے علاوہ اور بھی کئی شخصیتوں کے اداریئے شامل ہیں۔

پیش رفت کے علاوہ دہلی سے آل انڈیا ملی کونسل کے ترجمان کی حیثیت سے نکلنے والا رسالہ ''ملی اتحاد'' میں بھی عبدالباری صاحب ادارت کی خدمت انجام دیتے رہے۔ملی اتحاد میں انہوں نے ۲۰۰۴ء سے آخری عمر ۲۰۱۳ء تک سیاسی اور عصری مسائل پر اداریہ تحریر کرتے رہے۔مذکورہ بالا تمام رسالوں کے علاوہ وہ ملک کے

مختلف رسالوں اور اخباروں میں اپنا قلمی تعاون دیتے رہے۔قیام دہلی کے دوران روزنامہ راشٹریہ سہارا اور دعوت میں مسلسل موجودہ مسائل اور حالات حاضرہ پر کالم لکھتے رہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کی صحافتی تحریروں میں ادبیت پائی جاتی ہے۔اس میں سگفتگی کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی چاشنی اور لطافت دونوں موجود ہے۔وہ اپنی تحریروں میں کسی مسئلے یا موضوع پر لکھتے ہوئے اس کے پس منظر میں اشعار پیش کر کے اس کو اور بھی پر اثر بنا دیتے ہیں۔ڈاکٹر عبدالباری کے اس اندازِ بیان اور منفرد اسلوب ولب و لہجے کے سبب ان کے اداریوں کو اتنی زیادہ مقبولیت ومحبوبیت حاصل ہوئی ہے۔ان کے اداریوں پر آئندہ صفحات میں تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

الغرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ عبدالباری صاحب کی زندگی کا بیش تر حصہ تنقید وتحقیق اور درس وتدریس کے بعد صحافت میں گزرا ہے۔اگر ان کی صحافتی تحریروں کو یکجا کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر سکتی ہیں۔میری کوشش ہے کہ دوام،دوام نو اور ملی اتحاد کے تمام اداریوں کو مرتب کر کے شائع کروں،اس مرحلے میں ان کے کئی اداریئے حاصل بھی کر لئے ہیں انشااللہ پی ایچ ڈی سے فراغت کے بعد اسے شائع کرانے کی کوشش کروں گا۔خیر دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ عبدالباری صاحب اردو صحافت کی دنیا میں اپنا ایک الگ مقام ومرتبہ رکھتے ہیں۔آئندہ جب کبھی اردو صحافت کی تاریخ مرتب کی جائے گی اس میں انہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکے گا۔یہ الگ بات ہے کہ موجودہ عہد میں تعمیری ادب کا ترجمان ہونے کے سبب ان سے تعصب برتا جائے۔مگر ادب تو ادب ہوتا ہے خواہ کسی بھی نظریے کا حامل ہو۔اس بنا پر اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر سید عبدالباری اردو صحافت کو فروغ دینے اور اسے بامِ عروج تک لے جانے میں ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

باب پنجم (الف)

سید عبدالباری کے اداریوں کا تنقیدی مطالعہ

موجودہ عہد میں اداریوں کی بڑی اہمیت وافادیت ہے۔کسی اخبار یا رسالے کی ترقی اوراس کومقبول ترین بنانے میں ایک بہترین اداریہ اہم رول ادا کرتا ہے۔اداریئے کے ذریعے کسی اخبار یارسالے کی پالیسی اوراس کے نظریہ کا اظہار ہوتا ہے۔اس لئے اسے کسی اخبار یا رسالے کا ضمیر بھی کہا جاتا ہے۔رسالہ کسی ایک نظریہ کا حامی ہوتا ہے، جس میں اداریہ نگار اپنے مخصوص اندازِ بیان میں عوام کو روشناس کراتا ہے۔اردو صحافت کی دنیا میں اداریوں نے ملک کی آزادی میں بڑا اہم رول ادا کیا۔جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، ظفر علی خان، حسرت موہانی اور عبدالماجد دریا آبادی وغیرہ کے اداریئے ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دوراندیش اور جلیل القدر صحافیوں نے اپنے اداریوں سے ملک میں انقلاب برپا کر دیا تھا اور سیکڑوں مجاہدِ آزادی ان کے اداریوں کو پڑھ کر ملک کی خاطر جان دینے پر مجبور ہو گئے۔ڈاکٹر محمد شاہد حسین لکھتے ہیں:

> ''اداریہ کسی اخبار کی جان کہا جاتا ہے، تو کسی نے اس کا ضمیر، کسی نے اسے واقعات پر روشنی ڈالنے والی مشعل بتایا ہے تو کسی نے اسے عوام کی رہنمائی کرنے والا روشنی کا منارہ۔کسی کا خیال ہے کہ یہ ایک آئینہ ہی نہیں بلکہ ایسا ہتھیار ہے جس سے سلطنتوں کے فیصلے ہوتے ہیں اور تہذیب وتمدن کے کئی شعبوں میں انقلاب لایا جاسکتا ہے۔''[1]

اداریہ کسی اہم واقعے یا کسی ایسی خبر جو کافی اہم اور عوام کی توجہ کا مرکز ہو، اس موضوع پر مدیر کا مبسوط مضمون ہوتا ہے۔جو کسی اخبار یا رسالے کی پالیسی کو ذہن میں رکھ کر لکھا جاتا ہے اور اس واقعے سے متعلق اخبار کی کیا رائے ہے، اس کا اظہار اداریہ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔اس میں مدیر اپنی بات منوانے کے لئے انتہائی مدلل انداز میں بحث کرتا ہے اور جس تناظر میں وہ خود واقعے کو دیکھتا ہے اسی خاص تناظر میں عوام کو بھی اس سے روشناس کرانا چاہتا ہے۔اداریہ کے موضوعات لاتعداد ہوتے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر شاہد حسین مزید رقم طراز ہیں:

> ''اداریئے میں اہم خبروں کا تجزیہ بھی ہوتا ہے۔اس میں کسی مسئلے پر روشنی بھی ڈالی جاتی ہے۔کئی معاملات کی توثیق بھی ہوتی ہے، کئی واقعات کی تفسیر وتوضیح بھی ہوتی ہے۔اس میں کسی فیصلے کی اہمیت بھی بتائی جاتی ہے۔سمجھ میں نہ آنے والی باتوں کا تجزیہ مفہوم سمجھایا جاتا ہے وہ بھی مدیر یا اخبار کی رائے کے بغیر۔مزید یہ کہ اس میں کسی تجویز کا خیر مقدم بھی کیا جاتا ہے۔ملک یا سماج کے لئے غیر مفید منصوبے کی مذمت کی جاسکتی

ہے۔کسی مسئلے پر سوالات کئے جا سکتے ہیں کوئی خاص رویہ اختیار کرنے کی سفارش کی جا سکتی ہے۔اس میں تمام جائز مطالبات کئے جا سکتے ہیں۔غرض اداریہ اخبار کے پاس ایسا حربہ ہے جس کے صحیح استعمال سے زندگی کے ہر شعبے کی نگرانی کی ہو سکتی ہے اور سماج کے صحت مند عناصر کے فروغ میں مدد لی جا سکتی ہے۔‘‘۲

غرض اداریہ نگاری کے لئے موضوعات کی کوئی قید نہیں ہے۔کسی بھی موضوع پر اداریہ لکھا جا سکتا ہے،مگر اس کے لئے یہ شرط البتہ ہے کہ اس کا موضوع ایسا ہو،جس کی کوئی اہمیت و افادیت ہو اور جس سے کوئی نتیجہ نکالا جا سکتا ہو۔اداریہ نویسی کے لئے موضوع کا انتخاب کرنا دشوار ترین مرحلہ ہے۔اس میں اداریہ نگار کی ذہانت و ذکاوت کا امتحان ہوتا ہے۔اس لئے وہ اسی موضوع کا انتخاب کرتا ہے،جو زمانے میں عام و خاص کی زبان پر ہوتا ہے یا جس خبر یا واقعہ کا چرچا سب سے زیادہ ہوتا ہے۔مگر اداریہ نگار اپنے انداز بیان اور مدلل بحث و مباحثے سے ان باتوں میں دلکشی پیدا کر دیتا ہے اور اس میں ادبی جان ڈال دیتا ہے جس سے اداریئے کی ایک الگ پہچان بن جاتی ہے۔اداریہ میں یہی اندازِ بیان اور اداریہ نگار کے قلم کا جوہر اداریہ نگاری کا کمال ہوتا ہے۔

اداریہ نگاری کافی دشوار فن ہے۔جس میں اداریہ نگار کو صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے حالاتِ حاضرہ پر تمام پہلوؤں کو مدِ نظر رکھ کر اپنے خیالات و نظریات کا مظاہرہ ایک بندھے ٹکے اصول کے دائرے میں کرنا ہوتا ہے۔اداریے کی کامیابی میں اس کے اسلوب مقاصد،نظریات،خلوص اور سچائی کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔اردو ادب میں یوں تو بہت سے صحافیوں نے اپنی اداریہ نگاری کے ذریعے انقلاب برپا کیا ہے،جس میں سرسید کا نام سے سے اہم ہے۔انہوں اپنے اخبار علی گڑھ انسی ٹیوٹ گزٹ اور رسالے تہذیب الاخلاق کے ذریعے اداریہ نویسی کو نیا مقام اور سمت دی۔اس کے بعد اسی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد،مولانا محمد علی جوہر،حسرت موہانی،مولانا شوکت علی اور ظفر علی خاں نے اداریہ نگاری کے فن کو بلندیوں سے ہم کنار کیا اور اس سے ادب اور سیاست میں انقلاب برپا کرنے کا کام لیا۔موجودہ عہد میں بہت سے اخبارات و رسائل منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔جس میں بے شمار لوگ اداریہ نگاری میں طبع آزمائی کرتے ہوئے ملک و قوم کو نئی راہ دکھانے کا کام کرتے ہیں۔اسی تسلسل میں ایک اہم نام ڈاکٹر سید عبدالباری کا بھی ہے۔

پچھلے صفحات پر ڈاکٹر سید عبدالباری کی صحافتی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا،جس سے اندازہ ہوتا ہے

انہوں نے بے شمار اداریے قلم بند کئے ہیں اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں ہے۔اگر ان کے سبھی اداریوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جائے تو وہ ہزار کے اوپر پہنچ جائیں گے۔ڈاکٹر سید عبدالباری ایک تجربہ کار صحافی تھے اس لئے انہوں نے لاتعداد موضوعات پر سیکڑوں اداریے تحریر کئے ہیں۔اداریہ نگاری کے فن پر بات کرتے ہوئے اب اس باب میں ان کے اداریوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ اداریہ ایک ایسی تحریر ہے،جس میں کسی رسالے کے اصول وضوابط ونظریات کی ترجمانی کی جاتی ہے،اس نکتے سے اگر دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے ڈاکٹر سید عبدالباری نے جتنے بھی رسائل میں کام کئے ان کے نظریات تعمیری ادب یا عصری مسائل سے وابستہ ہوتے تھے اسی سبب انہوں نے جو بھی اداریے تحریر کئے ہیں ان میں موضوع زیادہ تر ادبی ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی وہ حالاتِ حاضرہ سے متعلق کسی خاص مسئلے پر بھی اداریہ لکھتے تھے۔وہ ایسا سیاسی موضوع منتخب کرتے تھے،جس سے عام وخاص ہر کوئی گہری واقفیت رکھتا تھا اور جب اس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے تو اس سے قاری کی ایک بڑی تعداد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی تھی۔وہ اداریوں میں موضوع سے متعلق حقائق کو بڑی چھان بین اور اعداد وشمار کی مدد سے پیش کرتے اور اداریہ میں جو مسائل بیان کرتے اس میں بحث ومباحثے کے ذریعے نتائج اخذ کر کے اشارے سے بات کرتے ہوئے قارئین کو مناسب مشوروں سے بھی نوازتے۔انہوں نے اپنے اداریوں میں بحث ومباحثے کے ذریعے ایک متوازن راہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔دوام کے ایک اداریہ میں اردو ادب کی خدمت اور اس کے وقار کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار اس طرح پیش کرتے ہیں:

''کہا جاتا ہے یہ دور صلاحیتوں کے زوال کا دور ہے اور انسان جس عالمگیر داخلی کرب،فکری بحران اور روحانی اضطراب میں مبتلا ہے اس کا یہ فطری تقاضا ہے۔مگر ہماری نگاہ میں بحران واضطراب کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔تاریخ میں اس طرح کے مدوجزر بارہا آئے ہیں۔درحقیقت انسان کی فطرت میں عجلت پسندی کا جو ایک پہلو موجود ہے وہی کبھی کبھی اس کے پورے وجود پر حاوی ہو کر طرح طرح کے کرشمے دکھاتا ہے۔اس صورت میں صرف سامنے کی چیزیں نظر آتی ہیں اور دور کے نفع ونقصان اور حسن وقبح تک نگاہ کی رسائی نہیں ہوتی۔آدمی اپنی اس بے بصیرتی کے سبب اپنی جگہ پر خود کو مکمل سمجھنے لگتا ہے اور اپنے قول وعمل،جذبہ واحساس کی تشہیر ونمائش اس کا مقصدِ حیات بن جاتی ہے۔اگر ہم بھی اپنے وجود کو انہیں خطرناک موجوں کے حوالے کرنے جا رہے ہیں اور جذبۂ احساس کی

> تہذیب وتربیت کے ساتھ ہی مشاہدہ غور وفکر اور مسلسل فنی ریاض سے دامن گیر ہوتے جا رہے ہیں تو ادب کو با مقصد اور باحیات بنانے کا ہمارا خواب۔۔۔شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا اور ہم اردو زبان وادب پر لایعنیت وسہل نگاری کی جو وبا منڈلا رہی ہے اس سے اپنے ادب کو نجات دلانے میں بھی کامیابی حاصل نہ کر سکیں گے۔۳

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اب تک جتنے بھی اداریہ تحریر کئے ہیں ان میں رسالے یا کسی نظریے کی ترجمانی کی ہے اس لئے انہوں نے جس موضوع کا بھی انتخاب کیا ہے بہت سوچ سمجھ کر کیا اور اس موضوع کے اعتبار سے اس میں کیا لکھنا ضروری ہے اور کیا نہیں۔اس کا بطور خاص اہتمام کیا ہے۔انہوں نے اپنے اداریوں میں ایک ایک سطر بہت احتیاط کے ساتھ لکھا ہے۔عبدالباری صاحب موضوع پر بہت غور وفکر کرنے کے بعد اسے واضح اور جامع الفاظ میں اس طریقے سے پیش کرتے ہیں جو ہر طرح کے جذبات سے عاری ہوتا ہے۔اس میں ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ انہوں نے جس موضوع پر لکھا اس پر غور وفکر کرنے کے بعد اس واقعے یا حادثے کی مکمل سچویشن کو پوری طرح ذہن میں رکھ کر متوازن انداز میں تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔مثال کے طور پر پیش رفت کا یہ اداریہ جس میں انہوں نے بابری مسجد کے بعد ملک میں پیدا ہوئے سنگین ماحول پر روشنی ڈالی ہے۔وہ ہندوستان کے مسلمانوں کا بدترین دور تھا۔بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہزاروں بے گناہ انسانوں کا قتلِ عام ہوا اور نہ جانے کتنے لوگ بے گھر ہو گئے۔اس سانحے میں جن لوگوں کو قتل کیا گیا ان میں ایک شخص عبدالباری کے قریبی دوست بھی تھے جو اس مسجد کے امام کے بیٹے تھے۔چنانچہ عبدالباری اسی واقعے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس وقت شاید ہم ہندوستان کی تاریخ کے المناک ترین موڑ پر کھڑے ہیں جہاں سب کچھ ٹوٹتا اور بکھرتا نظر آ رہا ہے اور جہاں ہماری اجتماعی زندگی میں کسی صحت بخش وفور اور کسی تعمیری ومثبت پیش رفت کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔اشتراکیت ،سیکولرزم،جمہوریت اور انسان دوستی جیسی ساری اصطلاحیں، سارے نظریات، سارے نعرے اور ساری طفل تسلیاں اپنی دلکشی ومعنویت کھو چکی ہیں اور ہر پردے سے فاشزم ،انانیت،انتشار وتخریب کے عفریتوں کے بھیانک چہرے ہمیں ڈراتے دھمکاتے نظر آ رہے ہیں۔ہر نظریہ و نظام ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان کو بے شمار ٹکڑوں میں بانٹنے اور انہیں باہم ٹکرا کر چور چور کر دینے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ایسے سنگین مرحلے میں

جب کہ اس خطۂ ارض میں انسانی تہذیب ہی نہیں پورا انسانی وجود خطرہ میں ہے سب سے زیادہ ذمہ داری کس پہ عائد ہوتی ہے اور کس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ رستے ہوئے ناسوروں پر نشتر چلائے گا اور انسانیت کی شریانوں میں تازہ وصحت بخش خون دوڑا سکے گا۔ جب اس سوال پر ہم غور کرتے ہیں تو ہماری نگاہ اپنے ماحول کے سب سے حساس اور سب سے باشعور وجود کی طرف اٹھتی ہے جو پیغمبروں اور نبیوں کی طرح ظلم وجبر کے خلاف اعلان جنگ کرنے اور خیر وصداقت کی فتح وکامرانی کے لئے جان جوکھم میں ڈال دینے کے لئے ہمہ تن تیار ہو اور ہم ایسے صاحب کردار اور صاحب بصیرت اہل زبان اور اہل قلم اور اہل دانش کو ڈھونڈتے ہیں جو ایک گم کردہ راہ قوم کی ذہنی تعمیر نو کرسکیں''۔۴

ڈاکٹر سید عبدالباری اپنے اداریوں میں جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو پہلے اس کا تعارف پیش کرتے ہیں اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے پیچیدہ مسائل کی معروضی تفصیل بیان کرتے ہیں پھر اس کا حل پیش کرتے ہوئے ماحصل پر اپنی گفتگو ختم کر دیتے ہیں۔ ان کے اداریوں کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں کہیں بھی کسی موضوع کو لے کر تضاد دیکھنے کو نہیں ملتا۔ جو بات کہتے ہیں دوٹوک انداز میں لکھتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر دوام کے اداریہ کا یہ اقتباس دیکھیں جس میں انہوں نے اپنے عہد کے ذہنی وفکری انتشار اور اخلاقی زوال پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''یہ دور ذہنی کرب فکری انتشار اور نظریاتی نراج کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا ہے۔ نظریہ سے محرومی اور عقیدہ سے تہی دامانی نے انسانی حیات کے ہر شعبہ میں عدم توازن پیدا کر دیا ہے۔ علم وادب پر بھی اس عدم توازن کے گہرے نقوش مرتب ہوئے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کی نئی نسل اپنے ماضی سے کٹ کر اور حال سے بیزار ہو کر اپنے مستقبل سے بھی مایوس ہو چکی ہے۔ قرطاس وقلم محسوس ہوتا ہے کہ فقط دل کے پھپھولے پھوڑنے اور دفتر نے معنی کا انبار لگانے کے لئے رہ گئے ہیں۔ اقدار وعقیدہ اور انسانیت کے مستقبل سے بیزاری ومایوسی کچھ لوگوں نے جدیدیت کے شوق میں خود پر مسلط کر لی ہے اور کچھ لوگ منظم طور پر الحاد وتشکیک کے زہریلے بیج نئی نسلوں کے ذہن ودماغ میں بو رہے ہیں۔ ہم تعمیر پسند ادیب اپنے دور معاشرہ اور اپنے ادب کو اس خطرناک صورت حال سے نجات دلانا چاہتے ہیں اور دوام کا اجرا ہماری اسی خواہش کا مظہر ہے۔''۵

ڈاکٹر سید عبدالباری نے زیادہ تر اداریے ادبی موضوعات پر لکھے ہیں۔ پیش رفت کے اداریے اسی نوعیت کے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں سیاسی مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے جس میں کسی اہم مسئلے کو موضوع بنا کراسے کو سلجھاتے ہوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔سیاسی موضوعات پر ان کے اداریے زیادہ تر ملی اتحاد، دوام اور دوامِ نو میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔عبدالباری صاحب کے اداریوں کا موضوع کچھ بھی ہو لیکن وہ اپنے مخصوص نظریات کے آئینے میں ہی لکھتے ہیں،جس میں صرف مسلم طبقے کی رہنمائی و پذیرائی اور تعمیری یا اسلامی ادب کے فروغ کی بات ہوتی ہے۔اس نوعیت کے اداریوں میں انہوں نے کبھی جانبدارانہ رویہ نہیں اختیار کیا، نہ کسی گروہ کی حمایت یا مخالفت میں کوئی ایسی بات لکھی جس سے کسی دوسرے مذہب یا ان سے مختلف نظریات رکھنے والے گروہ کی دل شکنی ہوتی ہو اور نہ کسی کو نشانہ بنا کر لعن طعن کیا ہے۔ بلکہ انہوں نے دیانتداری کا رویہ اختیار کرتے ہوئے مناسب مشوروں اور آرا سے قارئین کو متعارف کرایا اس طرح کے اداریئے لکھتے وقت بعض اوقات کچھ اداریہ نگار بے حد جذباتی ہو جاتے ہیں، وہ کسی مذہب یا ذات یا کسی گروہ کو لعن طعن کرنے میں ذرا سی جھجک محسوس نہیں کرتے۔عبدالباری صاحب کے اداریے ایسے جذبات و خیالات سے بالکل پاک ہیں۔ وہ جو بھی لکھتے ہیں اس میں کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی بلکہ اپنی بات کو اس طرح پیش کرتے ہیں جس سے پڑھنے والے کو ایک مثبت پیغام ملتا ہے۔غرض انہوں نے کبھی بھی کسی طرح کی بدکلامی نہیں کی جس سے کسی خاص گروہ یا مذہب کے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہو۔ یہ تمام خصوصیات وہ ہیں جس سے ان کے اداریوں کی اپنی ایک الگ شناخت قائم ہوئی ہے اور بحیثیت صحافی ان کی مقبولیت میں اضافہ بھی ہوتا گیا۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کے اداریوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کسی متنازعہ مسئلے کو موضوع بنا کر اس طرح پیش کرتے ہیں جس سے کوئی بیچ کا راستہ اختیار کیا جا سکے۔انہوں نے اپنے بعض اداریوں میں یہ کوشش کی ہے کہ کسی مسئلے پر آپس میں تنازعہ کرنے سے بہتر ہے سبھی مذاہب کے لوگ آپس میں بیٹھ کر اس کا حل نکال لیں جس سے ملک کی سالمیت کو کوئی خطرہ نہ ہو۔مثال کے طور پر انہوں نے اپریل ۱۹۸۷ء کے دوام نو کے اداریہ میں بابری مسجد کے مسئلے پر جو اداریہ تحریر کیا تھا وہ اس کی اعلیٰ مثال ہے۔اس اداریہ میں انہوں نے اشوکہ ہوٹل میں دو مذاہب کے بڑے رہنماؤں کے ذریعے پہلی بار آپس میں اس تنازعہ کو حل کرنے کی کوشش کا ذکر کیا ہے۔ اس اداریہ میں ڈاکٹر سید عبدالباری کا یہ خیال صاف واضح ہوتا ہے کہ گفت وشنید سے اس مسئلے کا حل تلاش کیا جائے مگر آخر میں اپنی متوازن رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے لئے ہٹ دھرمی اور بے بنیاد خیالات سے کنارہ کشی لازمی ہے اس کے بغیر کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر سید عبدالباری اپنے اداریوں کے اختتام میں پر مغز اور جامع الفاظ میں اپنی بات پیش کر کے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور کچھ دیر وہ اس کے حصار سے نکل نہیں پاتا ہے۔ دراصل ان کا رویہ اتنا صحت مند ،طاقت ور اور اتنا پرزور ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ان کی باتوں سے اثر قبول کر کے ان کا قائل ہو جاتا ہے اور اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے، اس اداریہ میں جو بات پیش کی ہے وہ حق ہے باقی سبھی غلط ہیں۔ مثال کے طور پر فروری ۱۹۶۹ء کے دوام کے اداریہ کا یہ اختتام دیکھئے:

''گزشتہ پندرہ بیس سالوں میں اس عظیم ملک میں جمہوریت کے سلسلے میں جو تجربات ہوتے رہے ہیں ان کے نتیجہ میں اگر چہ اب تک کوئی ٹھوس اور مثبت جمہوری روایت اور قومی مزاج فروغ پذیر نہیں ہو سکا ہے اور خاص طور سے گزشتہ چند سالوں سے میدان سیاست تشویشناک حد تک شکست وریخت ،انتشار و ابتری اور پیمان شکنی و نظریاتی قلاباری کی آماجگاہ بن گیا ہے مگر اس میں قصور جمہوریت کا نہیں بلکہ ان اہلِ فکر نظر اور قلم کا ہے جنہوں نے جمہوریت کی فکر وعمل کے ذریعے آبیاری کی ابھی تک ضرورت محسوس نہیں کی۔ انتخابات سے لے کر پارلیمانی سرگرمیوں تک ہر مرحلے کو ارباب سیاست کے سپرد کر دیا گیا ہے ان ارباب سیاست میں اکثریت ایسے سطحی اور فصلی لیڈروں کی ہے جن کی لغت میں سیاست کا فقط اتنا مفہوم ہے کہ عوام کو کچھ مراعات و مفادات کے سبز باغ دکھلا کر کسی نہ کسی طرح اسمبلی و پارلیمنٹ کی نشستوں تک رسائی حاصل کی جائے۔ چنانچہ اب فضا اس حد تک مکدر ہو گئی کہ شرفا انتخابی سیاست کے قریب آنا بھی اپنی توہین اور اپنی عزت و ناموس کے لئے خطرناک سمجھنے لگے ہیں۔ مگر دامن سمیٹنے اور عزت بچانے کی یہ پالیسی جمہوریت کے لئے، ملک کے لئے اور خود ان کے لئے مفید نہیں۔ ہم اس عذر کے تحت جمہوریت کے سلسلے میں اپنے فرائض کی جواب دہی سے نہ بچ سکیں گے۔ ہمیں اس پہلو پر غور کرنا ہوگا کہ اگر کل ہماری غفلتوں سے ملک جمہوریت سے محروم ہو گیا تو پھر جبر و استبداد کے جبڑوں میں گرفتار ہو جانے کے بعد شاید ایک عرصۂ دراز کے لئے ہم کسی بہتر مستقبل کی تعمیر میں اپنا رول ادا کرنے سے محروم کر دیئے جائیں''۔ ۶

اس اداریہ پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بات انہوں نے آج سے ۴۵ سال پہلے لکھی تھی، مگر آج بھی ان کی یہ پیشین گوئی لفظ بہ لفظ سچی معلوم ہوتی ہے۔ یہی ایک بہترین، دوراندیش اور تجربہ کار صحافی کی پہچان بھی ہے، وہ جو بھی بات کہے اس میں اس کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہو اور مستقبل میں اس کی اہمیت میں اضافہ ہوتا

رہےاوراس کی تازگی ہمیشہ قائم و دائم رہے۔اداریہ لکھنے کا کام اسی صحافی کو دیا بھی جاتا ہے جس کے اندر دوراندیشی، بلا کی ذہانت ہو اور جو متوازن نظریہ کا حامل ہو۔ظاہر ہے عبدالباری صاحب ایک کثیرالجہت شخصیت رکھنے والے انسان تھے۔ان کی نظر دنیا بھر کے تمام مسائل پر ہمہ جہت رہتی تھی اوران تمام مسائل کا وہ گہرائی و گیرائی سے مطالعہ بھی کرتے تھے یہی وجہ ہے ان کے اداریے کے موضوعات بھی لاتعداداور مختلف ہیں جن میں انہوں نے ادبی، سیاسی اورملی موضوعات پرخاص طور سے اداریے تحریر کئے ہیں ان تین موضوعات کے علاوہ معاشرتی اوراخلاقی اصلاح کو بھی انہوں نے اپنا خاص موضوع بنایا ہے مگران کا احاطہ بھی انہوں نے انہیں تین موضوعات کے اندر کردیا ہے۔

صحافت کا دارومدار حق گوئی و بیباکی اورایمانداری پر ہے۔ڈاکٹرسید عبدالباری نے اپنے اداریوں میں جن مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا ہے ان سب میں وہ ان اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔انہوں نے صبروتحمل کا ثبوت دیتے ہوئے اداریہ نگاری کا کام بڑی خندہ پیشانی سے انجام دیا۔

اداریہ نگاری میں زبان و بیان کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔اس لحاظ سے ڈاکٹر سید عبدالباری کے اداریوں کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زبان نہایت سادہ اوراسلوب عام فہم ہے۔مگرانہوں نے اپنی بات کو مدلل طریقے سے پیش کرتے ہوئے اشارے اور کنایوں کا بھی سہارا لیا ہے، تاہم یہ اشارے اور کنایے ایسے نہیں ہیں جن کو ایک عام قاری نہ سمجھ سکے۔یہی سبب ہے ان کے اداریے قارئین کے ذہن و دل میں بآسانی اترتے چلے جاتے ہیں۔اداریہ نویسی کم لفظوں میں زیادہ بات کرنے کا ہنر ہے۔گویا اداریہ نویسی کا فن کوزے میں دریا سمیٹنے کا نام ہے۔خالد محمود نے اپنے ایک مضمون میں اسے غزل کے فن کا مترادف قرار دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ’’اچھا اداریہ لکھنا غزل کے اچھے شعر کہنے کی طرح ہے۔اچھے شعر میں اختصاراور جامعیت کے ساتھ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہی جاتی ہیں۔اچھے اداریہ میں بھی اختصاراور جامعیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ شعر میں رمزو کنایہ سے کام چل جاتا ہےاوراداریہ میں نپے تلے الفاظ کی مدد سے اپنا مطمح نظر مدلل انداز میں واضح کرنا ہوتا ہے۔اداریہ کی زبان نہ تو ایسی مشکل ہو کہ ’’کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی‘‘ اور نہ ایسی آسان ہو بقول میر ’’پر مجھے گفتگو عوام سے ہے‘‘[۷]

غرض دیکھا جائے تو عبدالباری کے اداریے زبان و بیان کے لحاظ سے کافی اہم ہیں۔ان کے اسلوب میں ادبیت کے ساتھ زبان کی پاکیزگی اور اس کی چاشنی بھی موجود ہے۔مگر جہاں تک اختصار کی بات ہے ان کے اداریے اس خصوصیت سے عاری ہیں طوالت ان کے اداریوں کا خاص وصف ہے۔عام طور سے موجودہ عہد کے رسالوں میں جو اداریے لکھے جاتے ہیں وہ ایک صفحہ سے زیادہ نہیں ہوتے۔اس کے برعکس عبدالباری کے اداریے کافی طویل ہوتے ہیں جو ایک سے زائد صفحوں پر محیط ہوتے ہیں،ان کا کوئی بھی اداریہ ایک صفحہ کا نہیں ہے۔پیش رفت میں انہوں نے تین سے بھی زائد صفحات پر مشتمل اداریے لکھے ہیں اور جدیدیت پر لکھتے ہوئے اس حد کو بھی پار کر گئے ہیں۔طوالت ان کے اداریوں کا خاص وصف ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ وہ دلکشی اور جامعیت سے محروم ہیں۔وہ جس موضوع پر بھی گفتگو کرتے ہیں اس کو پوری دلیل کے ساتھ بحث ومباحثہ کرتے ہوئے اس کی واضح کرتے ہیں اور آخر میں اپنا کوئی نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔یہ کوئی عیب نہیں ہے اگر اداریہ نگار کوئی موضوع چھیڑتا ہے اور اس کی طوالت میں سبھی باتیں کام کی ہوں تو اس کی کشش میں کمی نہیں آتی ہے۔ دوسری بات رسائل کے اداریوں میں اگر طوالت آ بھی جائے تو وہ جائز ہے مگر اخبارات کے اداریے اس کے متحمل قطعی نہیں ہوسکتے ہیں۔غرض عبدالباری کے اداریے طویل ضرور ہیں مگر انہوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جو قارئین کے لئے کافی اہم اور دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں جس کو پڑھ کر قاری محظوظ ہوتا ہے اور اسے عجیب وغریب تازگی کا احساس کرتا ہے۔

آخر میں ان کے اداریوں سے متعلق ایک بات اور عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔سید عبدالباری اگر چہ اسلامی ادب کے ترجمان کی حیثیت سے اپنی ایک الگ شناخت رکھتے تھے۔مگر انہوں نے جو کچھ بھی لکھا عقل کی میزان پر پرکھنے کے بعد لکھا۔انہوں نے تعقل کی بنیاد، مذہب اور اس کی قدروں کا بغور مطالعہ کیا اور اس سے جو نتائج اخد کئے ان ہی کو اپنے اداریوں میں پیش کیا اور قوم وملت کے لوگوں تک ایک مثبت اور متوازن پیغام پہنچانے کا کام کیا۔دراصل ڈاکٹر سید عبدالباری نے صحافت کو کبھی وقت گزاری یا تفریح طبع کے لئے نہیں اختیار کیا بلکہ انہوں نے انسانی واخلاقی فرائض انجام دینے کے لئے اس میدان میں اپنا قدم مضبوطی سے جمائے رکھا۔

عمومی طور پر ڈاکٹر سید عبدالباری کے اداریوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اداریہ نگاری کے فن میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ان کی یہی اداریہ نگاری انہیں اردو صحافت کی دنیا میں ممتاز کرتی ہے اور وہ بیک وقت ایک عظیم صحافی کی شکل میں اردو ادب کی تاریخ میں اہم مقام ومرتبہ رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اگر صرف ان کے اداریوں پر تحقیقی مقالہ لکھا جائے تو یہ ایک نیا اور منفرد کارنامہ ہوگا۔کیوں کہ انہوں نے اتنی کثیر

تعداد میں اداریے لکھے ہیں اگر اس کو مرتب کر دیا جائے تو ایک مبسوط کتاب معرضِ وجود میں آجائے گی جو کئی کتابوں پر بھاری ثابت ہوسکتی ہے اور اس سے عبدالباری کے اداریوں کے مقام و مرتبے کا صحیح تعین ہوسکتا ہے۔ جب ہم ان کے اداریوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو بڑی حیرت ہوتی ہے وہ اتنی کثرت سے کیسے لکھتے تھے ۔میں نے ان کے ایک دوست جو جماعتِ اسلامی ہند میں رہتے ہیں ان سے اس بارے میں معلوم کرنا چاہا تو انہوں نے بتایا عبدالباری صاحب روزانہ چار پانچ صفحے جب تک لکھ نہ لیتے تھے انہیں نیند نہیں آتی تھی ۔عبدالباری صاحب کے ایک اور رفیق جناب انتظار حسین صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا، انہیں اداریہ لکھنے کا اتنا تجربہ تھا کہ جس دن رسالے کے اداریے کے لئے کسی موضوع کا انتخاب ہوتا تھا، اس کے دوسرے یا تیسرے دن وہ اداریہ لکھ کر دفتر میں چھوڑ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ملی اتحاد کے معاون مدیر جناب بسمل عارفی صاحب نے مجھے بتایا، جب بھی انہوں نے ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب سے فون پر اداریہ لکھنے کا تقاضا کیا انہوں نے کبھی منع نہیں کیا اور ہمیشہ خوش اسلوبی کے ساتھ ایک دو دن میں دفتر آکر اسے دے جاتے۔ ان سب باتوں سے عبدالباری کی اداریہ نگاری کے فن پر عبور حاصل ہونے کی دلیل ملتی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے، صحافت کی دنیا ان کے لئے بازیچہ اطفال کے مانند تھی اور ان کے سامنے شب و روز جو تماشے ہوتے تھے اسے وہ اداریے کی شکل میں ڈھال کر پیش کر دیتے تھے۔

☆☆☆

باب پنجم (ب)

سید عبدالباری کے انٹرویوز

موجودہ عہد میں اردو صحافت کی دنیا میں انٹرویوز کی روایت بہت عام ہوتی جا رہی ہے۔ انٹرویو کرنا ایک فن ہے، یہ کام وہی شخص بخوبی انجام دے سکتا ہے، جسے صحافت کا کافی تجربہ ہو۔ اس کے ذریعے اس میدان میں وہ اعلیٰ مقام حاصل کرسکتا ہے۔ انٹرویو کی روایت اردو صحافت میں مغرب کے زیرِ اثر عام ہوئی اور آج نہ صرف اردو بلکہ مختلف زبانوں میں اس نے ایک اہم صنف کی صورت اختیار کرلی ہے۔ بقول ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی انٹرویو کا جنم صحافت کے میدان میں ہوا اور آج بھی اس میدان میں اس کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے لیکن اب ادبی صنف بھی ہے۔

انٹرویو کے ذریعے کسی شخصیت یا واقعے سے متعلق جانکاری حاصل کی جاتی ہے اور اس کا نقطۂ نظر معلوم کیا جاتا ہے۔ اس سے کسی شخصیت کے خد و خال اور اس کے افکار و خیالات کا پورا نقشہ سامعین کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ انٹرویو کے کئی طریقے رائج ہیں، جن میں آمنے سامنے بیٹھ کر جو باہمی گفتگو ہوتی ہے، وہ انٹرویو کی اہم شکل ہے۔ انٹرویو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیشِ نظر موجودہ عہد میں مختلف صحافیوں کے انٹرویوز کے مجموعے منظر عام پر آ رہے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے، اس کی مقبولیت اور اہمیت میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ امید ہے آنے والے عہد میں انٹرویو کی حیثیت اردو ادب میں باقاعدہ ایک صنف کی صورت اختیار کرلے گی۔

انٹرویو کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر سید عبدالباری نے صحافتی زندگی میں کچھ عظیم ہستیوں کے انٹرویو بھی لئے۔ ان کے انٹرویوز کا مجموعہ ''ملاقاتیں'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۳ء میں انسی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ جس میں انہوں نے اپنے رسالے ''دوام'' اور ''دوامِ نو'' کے لئے ہندوستان کی اہم شخصیتوں کا انٹرویو لیا تھا۔ ''ملاقاتیں'' میں جن لوگوں کے انٹرویوز شامل ہیں یہ وہ شخصیتیں جنہوں نے ملک کی آزادی کی جدوجہد اور ملک وملت کی تعمیر وترقی اور ان کو تباہی وانتشار سے بچانے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ جن کو آج کی تاریخ میں نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ عبدالباری نے ضروری سمجھا کہ انہیں اور ان کے کارناموں کو منظرِ عام پر لاکر ان کی خدمات سے عوام کو روشناس کرایا جائے۔ یہ شخصیتیں تو اس عہد میں موجود نہیں ہیں، مگر انہوں نے جو نمایاں کردار انجام دیا ہے، برصغیر کی تاریخ میں کبھی انہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ان شخصیتوں نے اپنے علم وفن کے جو چراغ روشن کئے تھے، اس کی روشنی آج بھی لوگوں کے دل و دماغ کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں جن شخصیات کے انٹرویوز پیش کئے گئے ہیں، ان کی فکر وعمل کے متعدد

گوشے اس عہد میں نوجوانوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان شخصیات کا انٹرویو خود ان کے گھر جا کر لیا ہے۔اس کے لئے انہیں دور دراز کے سفر کی مشقتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔مگر عبدالباری صاحب کی یہ خوش نصیبی ہے،انہوں نے ان عظیم شخصیات کے انٹرویو لے کر ہمیں ان سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ ان کی ذاتی زندگی کے بہت سے اہم واقعات سے روشناس کرایا۔ان انٹرویوز میں ان عظیم شخصیات کا جنگِ آزادی میں کیا کردار رہا اور انہوں نے اس جدوجہد میں کیا قربانیاں دیں ان سب باتوں کی وضاحت خود ان کی زبان سے پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے،ہم خود اس شخصیت کے ساتھ بیٹھ کر اس کی باتیں سن رہے ہیں۔ان انٹرویوز میں شامل بعض شخصیتیں ایسی ہیں جن کو گاندھی نہرو اور آزاد سے کافی قربت تھی بلکہ وہ لوگ ان کے شانہ بشانہ آزادی کی مہم میں شامل تھے اور آزادی کی جنگ میں ان کے ساتھ سبھی مشقتیں بھی برداشت کیں،مگر ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ان انٹرویوز کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی جدید تاریخ میں مسلمانوں کے کارناموں کو کس طرح نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ان انٹرویوز میں اس وقت کے کئی سیاسی عوامل ومحرکات اور اس کے اسباب سے پردہ اٹھتا ہوا ملے گا۔تقسیم کے وقت ملک کی کیا صورتِ حال تھی اور اس بٹوارے سے متعلق کیا مجبوریاں سیاسی رہنماؤں کے سامنے تھیں اس سے متعلق بھی کئی راز کھلتے ہوئے نظر آئیں گے۔اس مجموعے کے مطالعے سے بہت سی ایسی باتوں کا سراغ ملتا ہے،جس سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوگا اور وہ کئی طرح حقیقتوں سے ہم آگاہ ہوں گے۔

''ملاقاتیں''،میں جن شخصیات کے انٹرویوز پیش کئے گئے ہیں وہ سب شخصیتیں ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ برصغیر کی تاریخ کے ایک المناک دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان سے ملاقات کی اور ان کی بیش قیمتی آرا اور کچھ ایسے واقعات کا راز افشا کیا جو واقعی ہمارے علم میں اضافے کا باعث ہیں۔ڈاکٹر عبدالباری ان شخصیتوں کی ملاقات پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''راقم الحروف کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان شخصیتوں سے ملنے ،استفادہ کرنے،قریب سے دیکھنے اور ان میں کچھ حضرات کے ساتھ ان کی سیاسی ،سماجی ،تہذیبی،تعلیمی اور دینی مہمات میں کچھ حصہ لینے کی توفیق حاصل ہوئی۔یہ انٹرویوز ان تمام حضرات سے ان کے مستقر پر حاضر ہو کر لئے گئے تھے۔ان کے اندر یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان اہلِ علم اور قاعدین کی شخصیت کی ارتقائی منازل،ان کی جدوجہد کے مختلف پہلوؤں اور

ان کے عزائم اور خوابوں کو ان کے عہد کے تناظر میں پیش کیا جائے۔''۸

ان انٹرویوز میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے پہلے شخصیتوں کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کا خاکہ کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ منظر کشی اور زبان و بیان کے ذریعے رنگ آمیزی کر کے ان سے متعلق اہم گوشوں کو اجاگر کیا ہے، جس سے اس وقت کی تاریخ کا کوئی گوشہ، کوئی کڑی قاری کی نظر سے اوجھل نہیں ہو پاتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنے پرانے انٹرویوز کو ازسرِ نو مرتب کر کے ایک ایسی شمع روشن کر دی ہے جس کی روشنی میں ہم بیسوی صدی کی تاریخ کا بڑی تفصیل سے مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم جنگِ آزادی سے پہلے اور بعد کی تاریخ کے کچھ سنہرے واقعات اور کچھ سچے رہنماؤں کے افکار و خیالات سے روشناس ہونا چاہتے تو ڈاکٹر سید عبدالباری کی کتاب ''ملاقاتیں'' میں یہ بیش قیمتی لعل و گوہر موجود ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کی کتاب ''ملاقاتیں'' میں کل پندرہ شخصیتوں کے انٹرویوز شامل ہیں جو کافی طویل ہیں۔ ایک ایک شخص کا انٹرویو ۳۰ سے ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، جناب محمد اسماعیل، بیرسٹر یاسین نوری، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، قاری محمد طیب، مفتی عتیق الرحمٰن، بدرالدین طیب جی، محمد مسلم، مولانا ابواللیث اصلاحی، مفتی فخر اسلام، مولانا صدرالدین اصلاحی، الحاج ذوالفقاراللہ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے انٹرویوز شامل ہیں۔ ان میں زیادہ تر ڈاکٹر سید عبدالباری نے سبھی شخصیات کی حالات زندگی اور ان کی تعلیم و تربیت پر سوال کئے ہیں اور سبھی لوگوں نے نہایت اطمینان سے کافی تفصیل سے اپنے ابتدائی حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ جس کے مطالعے سے ان اہم شخصیات کی زندگی اور ان کے آبا و اجداد سے متعلق بہت ساری معلومات فراہم ہوتی ہے اور ان کے ذوق و شوق اور عملی زندگی کا پتہ ملتا ہے۔

حالات زندگی کے علاوہ ان کا سیاست میں کیا عمل دخل رہا ہے، اس کے بارے میں بھی لوگوں نے تفصیل سے قارئین کو متعارف کرایا ہے۔ بہت سی سیاسی، سماجی اور خاص طور سے ملی مسائل سے متعلق سوالات و جواب بھی ملتے ہیں۔ ملک میں مسلمانوں کی جو صورتِ حال ہے اس مسئلے پر بھی اظہارِ خیال ملتا ہے اور ان سے نمٹنے کے لئے ان عظیم شخصیات نے اپنے اہم مشوروں سے بھی نوازا ہے۔ تمام سیاسی، سماجی اور ملی مسائل پر گفتگو کے علاوہ اردو زبان و ادب پر بھی ڈاکٹر سید عبدالباری نے کچھ اہم سوالات کئے، جس کا انہوں نے معقول جواب بھی دیا۔ آیئے اب ڈاکٹر سید عبدالباری کے سوالات کے آئینے میں چند اہم شخصیات سے متعلق اہم

سیاسی وادبی پہلوؤں سے مستفیض ہوتے ہیں۔جس سے اندازہ لگایا جا سکے کہ ان انٹرویوز کی غرض وغایت اور نوعیت کیا تھی۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کے اس مجموعے میں پہلا انٹرویو ڈاکٹر سید محمود کا ہے۔جن کا شمار آزادی کی جنگ میں پہلی صف کے رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ان کی سیاسی جدوجہد اور کاوشوں کے نقوش قدم قدم پر ملتے ہیں۔ انہوں نے جنگ آزادی میں گاندھی جی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور جناح کی طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ملک کی آزادی کے پہلے اور بعد میں مختلف عہدوں پر فائز بھی تھے۔مگر تاریخ میں ان کا اب کہیں نام ونشان نہیں ملتا ہے۔جب ملک میں مسلمانوں کے ساتھ زیادتیاں ہوئیں، اس میں انہیں بھی نہیں بخشا گیا اور ان کو ملازمت سے محروم کر دیا گیا۔آزادی کے بعد سن ۶۰ کے بعد ملک میں جو فرقہ وارانہ فساد ہوئے اس سے بد دل ہو کر سید محمود صاحب نے پارٹی بدل لی اور بار بار اس فساد کی مخالفت کرتے ہوئے، اس بات پر اپنا افسوس ظاہر کرتے رہے کہ مسلمانوں کو ملک کا دوسرے درجہ کا شہری بنا دیا گیا ہے۔ڈاکٹر صاحب سے ڈاکٹر سید عبدالباری نے یہ انٹرویو ۱۹۷۰ء میں ان کے گھر دہلی جا کر لیا تھا۔

اس انٹرویو میں ڈاکٹر سید محمود نے اپنے حالات زندگی سے متعلق پیدائش سے لے کر تعلیم وتربیت اور ملازمت تک کے سبھی پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اس کے بعد عبدالباری صاحب نے سید محمود سے ان کی سیاسی خدمات پر سوالات کیے ،جس کا انہوں نے یک بعد دیگرے بڑی سنجیدگی ومتانت سے جواب دیا اور ایک ایک واقعے کو بیان کرتے ہوئے آزادی کی جنگ سے لے کر تقسیم ملک تک کے بہت سے واقعات جن سے ابھی تک ہم واقف نہیں تھے، اس سے پردہ اٹھاتے چلے گئے۔گاندھی جی ،محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور جواہر لعل نہرو سے ان کے اہم روابط تھے،انہوں نے ان شخصیات سے متعلق بہت سی بے تکلفانہ باتوں کا ذکر بھی کیا اور گاندھی جی کے ساتھ آشرم کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے گاندھی جی سے متعلق بہت سی باتوں کا انکشاف کیا۔ملک کی تقسیم پر انہوں نے بات کرتے ہوئے بتایا کہ گاندھی جی کسی صورت میں بٹوارہ نہیں چاہتے تھے، وہ ملک کی سالمیت اور اتحاد کو ہر حال میں برقرار رکھنا چاہتے تھے، جو ان کی زندگی کا اہم مقصد بھی تھا،مگر جب حالات سازگار نہ ہوئے اور ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا، اس وقت گاندھی جی کو افسوس سے کہنا پڑا کہ میری زندگی بھر کی محنت ایک گندے نالے میں پھینک دی۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے پوچھے جانے پر سید محمود صاحب نے بتایا کہ تقسیم کے سلسلے میں مسلم لیگ اور مسٹر جناح کا کوئی ہاتھ نہیں تھا بلکہ لارڈ ماؤنٹ اور چرچل نے پاکستان بنانے

کی راہ ہموار کی۔اس موضوع پر وہ تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے بتاتے ہیں، جناح قطعی اس تقسیم کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ کانگریس کے ساتھ عدم تعاون کی سخت روش کو اپنا کر مسلمانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ حقوق کا سودا کرنا چاہتے تھے۔ڈاکٹر صاحب نے بتایا میں بھی اس تقسیم کی سخت مخالفت کر رہا تھا،مگر سردار پٹیل اور نہرو بھی جب اس سمجھوتے پر راضی ہوگئے تو میری حیرانی کی کوئی انتہا نہیں رہی اور میں بھی خاموش ہوگیا۔

ڈاکٹر سید محمود نے بڑی تفصیل سے تقسیم کے اسباب و محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے ملک میں مسلم لیگ اور اس کے کارناموں پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ مسلم لیگ ہمیشہ خود کو منفی کاموں میں مصروف رکھتی تھی۔اگر وہ چاہتی تو ملک کی تعمیر و ترقی میں اچھا خاصہ کام کر سکتی تھی۔اس کے بعد تقسیم کے المیہ پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی بتایا کہ میں نے ان دونوں ملکوں کے آپسی رشتے بحال کرنے کے لئے بڑی کوششیں کی اور اس کے لئے میں نے چھ مقالے لکھے،اس موضوع پر پارلیمنٹ میں تقریر بھی کی اور مختلف لوگوں نے میری حمایت بھی کی، یہ خبر جب پاکستان پہنچی تو لیاقت علی اس متحدہ دفاع کے لئے تیار ہوگئے،مگر جواہر لعل نہرو کی عدم دلچسپی کی وجہ سے میری یہ تجویز ناکام ہوگئی۔

ڈاکٹر سید محمود نے ہندوستان کی تاریخ پر افسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری کی تائید میں فرماتے ہیں اسے دوبارہ لکھنے کی ضرورت ہے۔انہوں نے بتایا انگریزوں اور انتہا پسند مورخین نے مسلم سلاطین اور اسلامی تہذیب کی صورت مسخ کر کے پیش کی ہے اور ہماری تاریخ کو ہمارے لئے مضر بنا دیا ہے۔اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں:

> ’’ہماری تاریخ ہماری تہذیبی روایات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ایک طرف ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول اور متصوفین و بزرگانِ دین سے عوام کے گہرے ربط اور خدمت خلق کی شاندار مثالیں ملتی ہیں۔دوسری طرف مسلمان بادشاہوں کو الا ماشا اللہ اس طرح پیش کیا جاتا ہے جیسے کہ ہلاکو ہوں۔اورنگ زیب کو بدنام کیا جاتا ہے۔یہ نہیں دیکھتے کہ اورنگ زیب نے اپنی مملکت کی حفاظت اور دنیاوی اغراض سے ضرورت ہوئی تو مسجدوں پر بھی گولہ باری کی۔‘‘۹

ڈاکٹر محمود کے مطابق ہندوستان کی تاریخ پر منضبط طریقے سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔آزادی کے

بعد مسلمانوں کی صورتِ حال اور ان کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے، انہوں نے ان کے حل کی تجویز بھی اس انٹرویو میں بتائی ہے اور مسلمانوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کرتے ہوئے، ملک میں ایک اہم شہری ہونے کے سبب ان کی ذمہ داریوں کا احساس بھی دلایا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مسلمانوں کے حقوق کے لئے کام کرنے کی خاطر مسلم مجلس مشاورت وجود میں آئی مگر پنڈت نہرو کی سازشوں نے انہیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ مسلمانوں کے حالات بہتر بنانے کے لئے ملک بھر میں جو کوششیں ہوئیں اس پر انہوں نے بڑے افسوس کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور اس وقت کے مسلمانوں کی سیاست سے دوری کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا زندہ اور متحرک قوم کا ملت کے لئے سیاست سے کنارہ کشی ناممکن ہے۔ اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے یہ بھی بتایا کسی فرد کا اقتصادی، تعلیمی وسماجی حالت کی اصلاح کے لئے کام کرنا بھی ایک سیاست ہے۔ بدقسمتی سے مسلم طبقہ کے لوگ سیاست کا مطلب صرف الیکشن سمجھتے ہیں۔

ملک میں مسلمانوں اور ان کی خستہ حالی کے اسباب وعوامل پر بات کرنے کے بعد آزادی کے بعد مسلمانوں کی زبان پر جو آفت آئی اس پر انہوں نے بتایا کہ مسلم قائدین نے کوئی اس سلسلے میں ٹھوس قدم نہیں اٹھائے، جس کا نتیجہ یہ ہوا اردو کے ساتھ ایک تہذیب بھی اس ملک میں اجنبی بن کر رہ گئی ہے۔ عبدالباری کی اس بات پر غور کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ اردو کے سلسلے میں ہماری کوتاہیاں کچھ کم نہیں ہیں اور حکومت اتر پردیش نے اردو کو خاص طور سے نقصان پہنچایا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے حکومت کی اردو زبان سے متعلق جو پالیسیاں تھیں، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے بتاتے ہیں کہ سمپورانند جو اس وقت یو پی کے وزیر تھے، انہوں نے ایسی پالیسی بنائی کی ۳۰ سال میں اردو خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ان کی اس دوراندیشی کے اثرات آج ہم پر نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر سید محمود کا ماننا ہے کہ اردو صرف اخباروں کے ذریعے زندہ نہیں رہ سکتی بلکہ اس کے لئے تعلیمی اداروں سے اسے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اتر پردیش کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنت جی کی ایک تقریر کا حوالہ دیا، جس میں انہوں نے اردو پر سخت جملہ بولتے ہوئے کہا کہ ''اردو چوہیا ہے اور ہندی ہاتھی'' اس پر غیر ملکی اثرات غالب ہیں یہ ہمارے آزاد ملک میں کیا ترقی کرے گی۔ ڈاکٹر سید محمود نے اس تقریر کا منھ توڑ جواب دیا اور بتاتے ہیں کہ میں نے کہا کہ:

> ''پنت جی، اردو بہت سخت اور بری ہے اور لائق توجہ نہیں میں سب تسلیم کئے لیتا ہوں، آپ یو پی کے چیف منسٹر ہیں۔ اردو کے خلاف نفرت کے جذبات پھیلے ہوئے

ہیں چلئے آپ جو زبان اس وقت بولے ہیں اسی کو یہاں رائج کر دیجئے۔آپ سمجھتے ہیں کہ اردو شیریں وفرہاد اور لیلیٰ ومجنوں کے گیت گاتی ہے اس لئے قابل گردن زدنی ہے۔میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ لوگ (رستم وافراسیاب) مسلمان تھے۔آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ مسلمان نہیں تھے۔یہ تو مسلمانوں کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ جہاں گئے انہوں نے وہاں کے ہیروز کو اپنا لیا۔خود ہندوستان میں بھی ان کا یہی رول رہا ہے۔چنانچہ اردو نے رام اور کرشن کے نغمے اور یہاں کی روحانی قدروں کے ترانے دنیا کو سنائے ہیں۔یہ ایک جمہوری زبان ہے۔''۱۰

اس کے علاوہ انہوں نے اس صورتِ حال پر بات کرتے ہوئے پنڈت نہرو کو بھی اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہیں جو کوششیں کرنی چاہئے تھیں اس میں انہوں نے سستی اور کمزوری دکھائی۔انہوں نے اردو کے فروغ کے لئے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر اس کو زندہ رکھنا ہے تو یوپی اور بہار میں اردو کو دوسری زبان کی درجہ دیا جانا بہت ضروری ہے۔انہوں نے اردو کے مسائل پر سرکاری اور قومی حل پر بڑی مفید باتیں بتائیں۔اس کے علاوہ انہوں نے اس انٹرویو میں ملک کے نصابوں پر بات کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا اور کہتے ہیں جدید نصاب نے ہماری تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اور اس میں ہندوستان کی مخصوص تہذیب اور دیو مالا کو کتابوں کا حصہ بنائے جانے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔اسلام پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں اور ان کے مفکرین سے گزارش کی ہے کہ اسلام کی پوشیدہ توانائیوں کو منظر عام پر لانے کے لئے اور اس سے انقلاب برپا کرنے کے لئے ان لوگوں کو اپنی خاص توجہ مرکوز کرنی پڑے گی۔اس سلسلے میں انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور اقتصادی ترقی کے لئے اپنے روشن خیالات پیش کئے ہیں اور آخر میں اسلامیات اور مسلمانوں کے مسائل پر بات کرتے ہوئے بتایا کہ مستقبل میں ہندوستان میں اسلام کے افق پر انہیں امید کی روشن کرن نظر آ رہی ہے۔

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی

''ملاقاتیں'' میں دوسرا انٹرویو ہندوستان کے معروف طبیب اور ممتاز قائد ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کا ہے ۔جس میں ان کے ابتدائی حالات، تعلیم وتربیت اور ان کے سیاسی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔اس کے علاوہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں کون کون سے عوامل کارفرما تھے ، اس انٹریو میں تفصیل سے پڑھنے کو ملتے

ہیں۔ڈاکٹر فریدی صاحب کی پرورش، تعلیم وتربیت لکھنؤ میں ہوئی تھی اس لئے وہ وہاں کے ادبی ماحول سے بھی متاثر ہوئے۔اور خود بتاتے ہیں میں شعروشاعری کا کافی شوقین تھااور اردوشعرا کے صاف ستھرے کلام مجھے کافی پسند تھے،لکھنو کے مشاعروں میں جایا کرتا تھااوران کے کلام سے لطف اندوز بھی ہوتا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی سیاسی زندگی سے قارئین کومتعارف کراتے ہوئے بتاتے ہیں کہ میں تقسیم کا بالکل قائل نہیں تھا۔ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی سیاست میں سوشلزم نظریات کے قائل تھے اور چاہتے تھے کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد مخصوص حالات کے پیش نظر ایک خاص قسم کا ہندوستانی سوشلزم روبہ عمل میں آئے،جس کی ایک نئی تھیسس لکھی جائے اور فرقہ وارانہ سطح سے اٹھ اوپراٹھ کر مساوات کی بنیاد پر ایک پرامن سماج کی تعمیر کی جائے۔ڈاکٹر فریدی اس ملک میں مسلمانوں میں اتفاق واتحاد نہ ہونے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے مسلمانوں کے قائدین اور علما کونشانہ بناتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ’’اتحاد واتفاق کس طرح قائم ہو جب کہ بہت سے ذہنوں پر پیسے کی لالچ اور عہدہ ومنصب کی ہوس مسلط ہے۔انسانی قدروں کی کسی کوفکر نہیں۔کسی کے سر میں منسٹر بننے کا سودا ہے۔کہیں شہرت وقیادت کا شوق ہے اوران سب سے زیادہ گمراہ کن دولت کی ہوس ہے۔چنانچہ میں مسلمانوں کے قائدین علماء میں سے بہتوں کواس مرض میں گرفتار پاتا ہوں‘‘[11]

اس صورتِ حال میں ڈاکٹر عبدالباری نے مسلمانوں کی فکر کرتے ہوئے،ان کے مستقبل کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے بتایا کہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمان دونوں کا مسقبل کافی روشن ہے،اگر چہ موجودہ حالات ان کے لئے سازگار نہیں ہیں۔اس طرح بہت سی سیاسی باتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندوستان میں سوشلزم، فاشزم اور کمیونزم کے کیا اثرات مرتب ہوں گے اوران سے کیا فائدہ اور نقصان اس ملک کو ہوگا، اس موضوع پر اپنی سیاسی بصیرت سے بڑی گہرائی وگیرائی سے اپنی بات مکمل کی۔موجودہ عہد میں اسکولوں اور کالجوں میں نئی نسل کے اندر جو بدنظمی اور انتشار پیدا ہوا ہے،اس سے متعلق سوال پوچھنے پر انہوں نے بتایا اسکوں میں ڈسپلن کا ہونا بے حد لازمی ہے اوراس معاملے میں وہ عسکریت کے قائل ہیں۔مسجدِ اقصیٰ کے بارے میں پوچھنے پر انہوں نے مسلمانوں کے اتحاد پر زور دیا اور کہا اور سبھی مسلمان اگر خلوص کے ساتھ متحد ہو جائیں تو اسرائیل کا وجود صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔

مسلمانوں کی تعلیم وتربیت سے متعلق انہوں بتایا کہ ان کو دین اور دنیا دونوں طرح کے علوم حاصل کرنے

چاہئے ۔صرف عربی پڑھ کر مسلمان کہیں کا نہیں رہ جاتا ہے ۔اس لئے ٹیکنالوجی کے اس دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کو سبھی علوم کو حاصل کرنا چاہئے ۔اردو زبان کے سلسلے میں حکومت اتر پردیش کے رویہ پر انہوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اردو والوں کو اپنی جد و جہد سے غافل نہیں رہنا چاہئے ۔اس انٹرویو میں مزید سیاسی گفتگو ہوئی ،جس سے ہمیں سیاست کے کئی اہم پہلوؤں سے آشنائی ہوتی ہے ۔اس انٹرویو کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب کی سیاسی جد و جہد اور افکار و خیالات نئی نسل کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی

عبدالماجد دریا آبادی کی علمی و ادبی شخصیت سے ہر کوئی واقف ہے ۔مولانا ایک ممتاز فلسفی ، ماہرِ نفسیات، انشا پرداز، نقاد، صحافی، مفسر قرآن اور صوفی مزاج انسان تھے ۔اسلامی ادب سے ان کا گہرا تعلق رہا ہے، اسی سبب وہ اسلامی ادیبوں سے بہت خوش رہتے تھے اور ان کی برابر حوصلہ افزائی کرتے رہے ۔انہوں نے صحافت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اس بنا پر وہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم مقام و مرتبے کے حامل ہیں ۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے عبدالماجد دریا آبادی جیسی معزز شخصیت سے ۱۹۶۹ء میں ان کے وطن ضلع بارہ بنکی جا کر یہ انٹرویو لیا تھا جو ماہنامہ دوام میں شائع ہو چکا ہے ۔جس وقت یہ انٹرویو لیا گیا، وہ ان کی زندگی کا آخری دور تھا ۔اس انٹرویو کے دوراً ان کے داماد ماہرِ سیاسیات جناب ہاشم قدوائی بھی موجود تھے ۔

اس انٹرویو کی ابتدا عبدالماجد دریا آبادی کی ذاتی زندگی اور شخصیت کی ارتقا سے ہوتی ہے ۔جس میں ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے دوران وہ کون کون سی کتابوں اور شخصیتوں سے متاثر ہوئے تھے اور ان کی زندگی میں یہ سب چیزیں کس طرح اثر انداز ہوئی ہیں ان سب پہلوؤں سے ہمیں مولانا صاحب نے تفصیل سے روشناس کرایا ہے ۔عہد شباب میں وہ مذہب سے پھر گئے اور الحاد کی روش اختیار کر لی تھی ،اس واقعے پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے ،وہ بتاتے ہیں کہ وہ کس طرح اس بھنور سے نجات حاصل کرتے ہیں ۔اس سلسلے میں انہیں پہلی روشنی ہندو فلسفہ کے مطالعہ سے ملی ۔ بعد میں اکبر الہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر جیسی شخصیت کے مطالعے اور ان کے اثرات سے وہ پوری طرح مذہب کے دائرے میں آ گئے ۔ان تمام واقعات کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے ہم مولانا کی زندگی کے ایک نئے گوشے سے واقفیت حاصل کر رہے ہیں۔

مولانا نے ۱۹۱۵ء ''سچ'' کی اجرا کے وقت مسلم صحافت اور ملکی وملی مسائل کے سلسلے میں اس رسالے کا جو رول رہا، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سچ علمی وفکری اعتبار سے اسلامی افکار ونظریات کی تائید وترجمانی کی غرض سے نکالا گیا تھا اور یہ دور مسلم صحافت کا بڑا درخشاں دور تھا۔اس وقت وہ مولانا محمد علی جوہر کے سیاسی مشن سے کافی متاثر تھے۔عبدالماجد دریا آبادی کے رسالے ''صدق'' اور ''سچ'' نے اردو صحافت میں حق گوئی، بیباکی اور جرآتِ اظہار کی ایک روشن روایت قائم کی اور اردو صحافت میں ادبی چاشنی پیدا کرکے اس کے علمی وقار میں اضافہ کیا اور بحیثیت اردو رسالہ اسے خوب ترقی ہوئی۔اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں:

> ''جرآت اظہار تو کسی حد تک آج بھی مسلم صحافت میں پائی جاتی ہے۔مگر ادبی چاشنی اور علمی وقار کا فقدان ہے۔عملی وادبی اعتبار سے ادھر صحافت کا معیار بہت نیچے آ گیا ہے''۔۱۲

اس سلسلے میں مولانا نے اردو اخبارات کی بعض غلطیوں کی طرف اشارہ کیا جو موجودہ عہد میں عام ہوگئی ہیں۔صحافت کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری نے انٹر یو کا رخ سیاست کی طرف موڑ دیا اور مسلمانوں کے اتحاد واتفاق پر ان کی رائے جاننا چاہی۔مولانا کو اس میں مایوسی نظر آئی۔انھوں نے افسوس ظاہر کیا اور کہا آج مولانا محمد علی جوہر جیسی کوئی شخصیت موجود نہیں ہے، جو پوری ملت کے جذبات کو کسی مسئلے پر متحرک وہم آہنگ کر سکے۔

سیاسی گفتگو کے بعد مولانا نے اپنی ادبی زندگی سے متعارف کرایا اور بتایا کہ ترقی پسند تحریک، جس نے ادب کو کافی نقصان پہنچایا اسکی انھوں نے کھل کر مخالفت کی تھی۔موجودہ عہد میں فحش ادب کی گرم بازاری اور رنگ برنگے ڈائجسٹوں نے اردو ادب وصحافت کو کافی متاثر کیا ہے۔اس سے صاف ستھرے، معیاری اور صحت مند ادب کی ارتقا میں کافی رکاوٹ پیدا ہوئی ہے اور اس نے عوام کی ذوق کو سطحی بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔پھر بھی وہ اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ اردو ادب میں ایک حلقہ ایسا موجود ہے، جو اچھے اور صاف ستھرے ادب تخلیق کر رہا ہے۔مولانا ان ادیبوں کی دل سے قدر کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہی حلقہ اردو ادب کی بقا وترقی کا ضامن ہوگا۔عبدالماجد دریا آبادی کا اشارہ تعمیری ادب کے ادیبوں کی طرف معلوم پڑتا ہے۔گویا وہ ایسے ادب کی حمایت کرتے ہیں جس کا تاثر صحت مند ہو اور اس میں کسی طرح کی برائی یا فحاشی

کے عنصر شامل نہ ہوں۔

مولانا اچھے ادب کی تخلیق میں کسی نظریہ اور اقدار کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کسی نظریہ کی پاسداری کے بغیر اچھا ادب وجود میں نہیں آ سکتا۔ مولانا اسلامی ادب کی روشنی میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں میں کسی ٹھوس اور ہمہ گیر نظریہ کے بغیر اچھے اور آفاقی ادب کا تصور نہیں کر سکتا۔ جدید شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے، انہوں نے کہا کہ اس سے اردو ادب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ مولانا کے مطابق بہترین ادب کی تخلیق فکر وفن کے بہترین امتزاج کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ان دونوں کی آمیزش سے ہی شہکار تخلیقات منظرِ عام پر آتیں ہیں۔ مولانا نے اس ضمن میں اکبر آلہ آبادی کی شاعری میں ان خوبیوں کی نشان دہی کی اور بتایا اکبر کے بعد طنز ومزاح کی شاعری زیادہ ترقی نہیں کر سکی۔

صحافت کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے مولانا آزاد سے اختلاف کیا اور الہلال کی بھاری بھرکم خطیبانہ اور بلند آہنگ اسلوب وطرزِ ادا کو صحافت اور سنجیدہ خیالات کے اظہار کے لئے مضر بتایا۔ گویا مشکل پسندی انہیں کسی طرح گوارہ نہیں تھی، اس لئے مولانا اردو نثر میں غالب، سرسید، حالی اور شبلی کے اسلوب اور طرز ادا کو پسند فرماتے تھے جن کی نثر اپنی سادگی، پرکاری اور سلاست و بلاغت کے سبب مقبول ہے۔ حالی کی تنقید نگاری پر مغربی و یونانی فلسفہ کے جو اثرات نمایاں ہوئے ہیں اس پر ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان سے سوال کیا کہ حالی نے مغربی اور یونانی خیال لے کر تنقید کا جو ڈھانچہ بنایا ہے وہ بعد میں اس کے ارتقا میں گمراہ کن تو نہیں ثابت ہوا ہے؟ اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

> ''حالی کی تنقیدی خدمات اور بحیثیت نقاد ان کی عظمت کا انکار بڑی جسارت کی بات ہے۔ مگر انوکھی نہیں۔ کچھ دنوں کے بعد حالات بدل جانے سے جو چیز ٹھیک ہو اسی میں نقائص نظر آنے لگتے ہیں۔ چنانچہ آج کچھ لوگوں کو حالی کے اندر بھی بہت سی خامیاں نظر آنے لگی ہیں۔ لیکن تنقید کا یہ معتبر ومسلم اصول رہا ہے کہ ہر شخص کی خدمات کو اس کے دور کی ذہنی سطح اور علمی وفکری پیمانوں کے پس منظر میں ہی ناپنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ حالی کے اردو ادب وتنقید پر شعوری وغیر شعوری طور پر جو اثرات پڑے ہیں اس کے جائزہ کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔''۱۴

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے حالؔی کے بعد نیاز فتح پوری سے اپنے علمی معرکے پر گفتگو کرتے ہوئے

بتایا کہ نیاز نے پوری ایک نسل کو گمراہ کیا، مگر ان کی قابلیت کو دل سے قبول کرتے ہوئے کہتے ہیں، وہ اچھے ناقد تھے اور ان کا اسلوب بھی بہت دلکش تھا مگر ان کی فکر کا کوئی محور و مرکز نہیں تھا۔اس انٹرویو میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے اردو زبان کی بقا و ترقی پر ان کی توجہ مرکوز کی اس مسئلے پر غور کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا، اس کے لئے مہم چلانے کی ضرورت ہے اور والدین کو چاہئے وہ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم ضرور دلائیں۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کے اس انٹرویو میں عبدالماجد دریا آبادی کی ادبی، صحافتی اور تنقیدی بصیرت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے اور قارئین مولانا کی پوری زندگی اور نظریات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔اس انٹرویو میں مولانا نے ادبی گفتگو کے بعد ملی مسائل پر بات کرتے ہوئے مسلمانوں کی ترقی کے لئے دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔اس سلسلے میں انہوں نے علی گڑھ اور ندوہ کی جو خدمات رہی ہیں اس پر اختصار سے روشنی ڈالی۔اس کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے بہت سے مسائل پر تفصیل سے بات کی۔مسلمانوں کے اتحاد واتفاق پر بات کرتے ہوئے وہ قائدین کو اس کا قصوروار ٹھہراتے ہیں اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے اہم مشوروں سے بھی نوازتے ہیں۔اس طرح کے اور بھی مسائل تھے، جن پر مولانا نے طویل گفتگو کی اور صحافت کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی گفتگو ختم کی ہے۔ادبی اور صحافتی نقطۂ نظر سے یہ انٹرویو کافی اہم تھا اس میں ہمیں صحافت کی بہت سی باریکیوں سے مولانا نے روشناس کرایا ہے۔

بدرالدین طیب جی

بدرالدین طیب جی کا شمار ملک کی آزادی کے بعد ملت کے ممتاز دانشوروں، قوم کے ہمدردوں اور اسلامی فکر سے معمور دل و ذہن رکھنے والے رہنماؤں میں ہوتا ہے۔طیب جی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بے حد کامیاب وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔اس حیثیت سے انہوں نے بے حد اہم کردار ادا کئے۔خاص طور سے مسلمانوں کے لئے انہوں نے جو کیا اس کے لئے انہیں ملت کے لوگ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کا بڑا احترام کرتے ہیں۔بدرالدین طیب ہندوستان کے ایک بہترین سفیر بھی تھے۔اس کام کے لئے انہیں صرف ہندوستان نہیں بلکہ بیرونِ ملک میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔یہ انٹرویو اس وقت لیا گیا جب ۱۹۶۹ء میں مسلمانوں پر بڑے امتحان کا وقت تھا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اقلیتی کردار ختم کرنے کی بات ایوان سیاست میں چل رہی تھی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا جا رہا تھا کہ قومی دھارے میں بہنے کی کوشش نہ کریں۔

انٹرویو کی شروعات ان کے ابتدائی حالات زندگی سے ہوتی ہے، جس میں انہوں نے اپنی ذاتی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے تعلیم وتربیت اور شخصیت کی ارتقا سے متعلق تفصیل سے گفتگو کی۔ ان کی شخصیت کی تعمیر وترقی میں جن کتابوں نے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں ان میں ایک دیوانِ غالب بھی ہے۔ غالب کے بہت سے اشعار انہیں ازبر تھے۔ وہ غالب کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

> ''مجھے انگریزی وفرانسیسی شاعری سے بھی لطف اندوز ہونے کا کافی موقع ملا اور ان کے مقابلہ جب اردو کے شاعر غالبؔ کے کلام کو رکھتا ہوں تو اس کی عظمت کا مجھے پوری طرح اندازہ ہوتا ہے۔ غالب کی زبان روزمرہ کے محاورے پر مشتمل ہے۔ طرز ادا میں ندرت اور دلکشی ہے۔ ایک ایک فقرہ میں معنی کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ پرانی باتوں کے دہرانے کے بجائے نیا پن اور جدت پیدا کرنے کی وہ کوشش کرتے ہیں۔ بڑی شاعری اور بڑا ادب وہ ہے جو ذہن کو وسیع کرے اور خیالات میں کشادگی پیدا کرے یہاں تک کہ اسے پڑھنے والا خود کو پڑھنے کے بعد وسیع وعظیم محسوس کرنے لگے۔''[۱۴]

طیب جی کی زیادہ عمر سیاسی نشیب وفراز میں گزری ہے مگر غالب کے فن پر جس طرح اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے، اس سے ڈاکٹر عبدالباری حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ شعر وادب کا اتنا جامع اور متوازن تصور، صاف ستھرا ذوق اور نکھری ہوئی تنقیدی بصیرت انہیں کہاں سے حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں غالب صدی کے نام پر جو جشن منایا جا رہا تھا، ڈاکٹر سید عبدالباری نے طیب جی سے اس موضوع پر گفتگو کی، اس پر انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور تعجب کرتے ہوئے کہا کہ ایک طرف اردو مر رہی ہے دوسری طرف چراغاں ہو رہا ہے۔ اگر اردو نہیں رہے گی تو غالب کو سمجھنے والا کون ہوگا۔ اردو زبان کے مسائل پر انہوں نے ایک جملے میں بڑی بات کہہ دی۔ یہی بڑی شخصیت اور دانشوروں کی شناخت بھی ہوتی ہے۔ اردو زبان جس نازک دور سے گزر رہی ہے، اس کے تحفظ پر اظہارِ خیالات کرتے ہوئے بہت خوبصورت جملوں میں اپنی بات کہتے ہیں:

> ''اردو کسی خاص مذہب کے ماننے والوں کی زبان نہیں ہے۔ اس نے اسلامی کلچر بلکہ ہندوستانی کلچر کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ یہ ہمارا قومی ورثہ ہے۔ یہ ایک تہذیبی اثاثہ ہے۔ اس کی جڑیں ہندوستان کے ہر گوشہ میں پیوست ہیں۔ اردو ہمارے قومی ڈھانچے کا

ایک لازمی حصہ ہے۔اس کو مفلوج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سارے جسم کو معطل کر دیا جائے۔جس طرح ایک ڈینٹسٹ دانت نکالنے کے لئے مارفیا کا انجیکشن لگا کر سارے جسم کو معطل کر دیتا ہے۔ہمارے سیاست داں تاج محل باہر سے آنے والوں کے سامنے بڑے فخر سے پیش کرتے ہیں حالانکہ تاج محل سے زیادہ کامیاب نمونہ اردو زبان ہے جو ہماری ثقافت کے ہر پہلو کی بہترین ترجمان ہے۔اس کی حفاظت تاج محل سے زیادہ ضروری ہے۔''۱۵

موجودہ عہد میں اردو زبان پر ہورہی سیاست پر انہیں یقین ہے،کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا،کیوں کہ کوئی زبان کسی کے مٹانے سے نہیں مٹتی ہے اور نہ بنانے سے بنتی ہے۔یہ ایک فطری عمل ہے۔اس لئے وہ بڑے اطمینان بخش لہجے میں کہتے ہیں اس سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔اگر اردو میں دلکشی وتوانائی ہے،تو یہ خود بخود عروج حاصل کرے گی۔

اردو زبان وادب پر گفتگو کرنے کے بعد عبدالباری صاحب اپنے اصل موضوع پر آتے ہیں اور طیب جی سے مسلمانوں کے مسائل پر گفتگو کرتے ہیں،جس پر انہوں نے بڑے سلیقے سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے اہم مشوروں سے نوازا ہے۔موجودہ عہد میں نوجوانوں کے اندر جو بے چینی اور ذہنی انتشار کا عالم ہے،اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں،نوجوانوں اور ان کے سرپرستوں کے درمیان باہمی تبادلہ خیال ہو اور وہ ایک دوسرے کو زیادہ گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کریں اور ایک دوسرے کے مسائل ومشکلات کا اندازہ کریں ،جب ہی یہ مسلہ حل ہوسکتا ہے۔نوجوانوں کی موجودہ صورتِ حال پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

''افسوس ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان جو قومی وملکی ترقی کے آرزومند ہیں مذہب سے خود کو منقطع کر لیتے ہیں۔اس کے برعکس ہمارے علماء اور مذہبی لوگ صرف آئندہ کی زندگی کی فکر میں رہتے ہیں۔اور اس دنیا پر کم توجہ کرتے ہیں۔قرآن کے مطالعہ اور پیغمبر کی سیرت پاک کے مطالعہ سے سب سے بڑی چیز جو ہمیں ملی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان اس دنیا کی زندگی میں معاشی وتہذیبی ترقی سے لاپرواہ نہ رہیں۔اسلام اس زندگی کے جشن وخیر کو قطعی پس پشت نہیں ڈالتا۔اس دنیا کے مسائل سے بے تعلقی ولاپرواہی کا مزاج نئی نسلوں کے لئے وجہ بیزاری ہے۔ہماری ذمہ داری ہے کہ نوجوانوں کو اسلام کی

موٹی موٹی باتوں سے روشناس کرائیں۔''۱۶

ملک میں خاص طور سے جو عام اخلاقی بے راہ روی اور بگاڑ ہے، اس کو روکنے کے لئے طیب جی کی نظر میں کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جو اس فریضہ کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہر حال میں اس کے اقلیتی کردار کو قائم رکھنا چاہئے کیوں کہ یہ واحد ادارہ ہے جو مسلم قوم کے نوجوانوں کو صحیح راہ دکھانے میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔ بدرالدین طیب جی چاہتے تھے کہ صرف مسلم ہی نہیں بلکہ ہر قوم سکھ، عیسائی، بدھ اور پارسی کا بھی اپنا ایک ادارہ ہو اس سے پورے ملک کو فائدہ پہنچے گا۔ اس پر بات کرتے ہوئے وہ یہاں کی تہذیب وثقافت کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں، ہم لوگ خوش قسمت ہیں کہ ایک تہذیبی رنگارنگ والے ملک میں رہتے ہیں۔

بدرالدین طیب جی نہرو جی کے زمانے میں وزیر خارجہ کے اہم عہدے پر کافی مدت تک فائز رہے۔ انہوں نے اس عہد کی خارجہ پالیسی سے بھی قارئین کو روشناس کرایا اور ہندوستان کے ایک سفیر ہونے کے سبب اپنے غیر ملکی دوروں کا ذکر بھی کیا اور ان ملکوں سے ہندوستان کا موازنہ بھی پیش کیا۔ وہ بتاتے ہیں فرقہ وارانہ فسادات نے ہمارے ملک کے وقار کو کافی مجروح کیا ہے اور باہر کے لوگوں کی رائے ہمارے ملک سے متعلق اچھی نہیں ہے۔ آج کل ہندوستان میں بیف کے مسئلے پر بڑے ہنگامے ہو رہے ہیں، لوگوں کو صرف شک وشبہ کی بنیاد پر مار دیا جا رہا ہے، ان سب چیزوں سے ملک کی بدنامی ہو رہی ہے۔ طیب جی نے جاپان کی ترقی کے اسباب پر جو روشنی ڈالی ہے کاش یہی بات ہمارے عہد کے رہنماؤں کو بھی سمجھ میں آجاتی تو آج ملک کہیں اور ہوتا۔ جاپان کے بارے میں وہ بتاتے ہیں:

> ''جاپان میں قدیم ہندوستان کی بڑی عزت ہے۔ وہاں بدھزم کا اب بھی بڑا اثر ہے۔ مگر وہ لوگ ترقی پسند اور روشن خیال ہیں۔ جنگِ عظیم سے پہلے وہ لوگ گائے کا گوشت دودھ پنیر وغیرہ نہیں کھاتے تھے مگر اب یہ چیزیں عام ہوگئی ہیں اور عادتیں بدل گئی ہیں۔ اس وقت دنیا کے ہر ملک سے زیادہ اچھا گائے کا گوشت (BEEF) وہاں کھایا جاتا ہے۔''(۱۷)

طیب جی بتاتے ہیں جاپان میں اب پرانے فرقے اور قوموں کے نام ونشان مٹ چکے ہیں۔ اس وقت سب کے اندر نئی فکر نئی روشنی اور نئے تقاضوں کا شعور موجود ہے۔ اس آئینے میں ہندوستان کے سیکولرزم کی بات

کرتے ہوئے کہتے ہیں یہاں بہت سے مذاہب ہیں اور اگر یہ لوگ سیاسی معاملات میں دخل اندازی کرنے لگیں گے تو یہاں کی جمہوریت چل نہیں سکے گی۔

اختصار کے ساتھ پیش کی گئی مذکورہ بالا تمام باتوں کی روشنی میں بدرالدین طیب جی نے اس انٹرویو میں جس موضوع پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے، وہ کافی متوازن اور صحت مندرہا ہے اور ان کا یہ انٹرویو یقیناً نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا صدرالدین اصلاحی

مولانا صدرالدین اصلاحی ڈاکٹر سید عبدالباری کے استاد رہ چکے ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری کو رام پور میں تعلیم کے دوران ان سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا اور وہ ان کی شخصیت سے کافی متاثر ہوئے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے جس وقت یہ انٹرویو لیا، اس وقت وہ کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ان کا یہ انٹرویو ان کے آبائی وطن پھول پور میں ان کے مکان پر جا کر لیا۔اس انٹرویو میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے خود ہی ان کے حالات زندگی سے متعلق بہت سے ایسے واقعات جن سے وہ واقفیت رکھتے تھے سامعین کو روشناس کرایا ہے۔مولانا سے بہت کم سولات کئے گئے، کیوں کہ ان کی علالت بہت دیر تک گفتگو کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔حسبِ معمول اس انٹرویوں میں بھی مولانا صدرالدین اصلاحی نے اپنی حالات زندگی اور تعلیم وتربیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

مولانا نے اپنے اس انٹرویو میں بتایا ہے کہ انہیں مدرسہ اصلاح میں تعلیم کے دوران قرآن پاک سے کافی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور مضمون نگاری کا ذوق بھی اسی وقت پیدا ہوا۔اسی دوران انہوں نے دو مضمون لکھے اور ترجمان القرآن میں شائع کرنے کے لیے مولانا مودودی کے پاس ارسال کر دیا، جس کو انہوں نے بغیر کسی تبدیلی کے شائع کیا اور آئندہ کے لئے بھی مضمون کی فرمائش کی اور کچھ ضروری مشوروں سے نوازا بھی۔کچھ عرصے بعد مولانا کو مولانا مودودی کا ایک خط موصول ہوا، جس میں مودودی نے انہیں ترجمان القرآن میں کام کرنے کی دعوت دی تھی اور لکھا تھا اس کا دفتر اب حیدر آباد سے پٹھان کوٹ منتقل ہو رہا ہے تم اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد وہیں پہنچ جانا۔چنانچہ مولانا نے ان کی دعوت قبول کر لی اور وہ ۱۹۳۸ء میں جمال پور پہنچ گئے اور کئی سال تک ترجمان القرآن میں کام کرتے رہے۔

مولانا نے اپنے انٹرویو میں دینی مدارس کے نصابِ تعلیم اور اس کے معیار پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں، اس میں تبدیلی کی اہم ضرورت ہے اور اس بات پر علامہ شبلی کے زمانے سے ہی غور وخوص کیا جا رہا ہے، اس پر کچھ کام بھی ہو چکا ہے۔مولانا صدرالدین اصلاحی نے مدرسوں سے جڑے اور بہت سے

دینی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔اس کے بعد جماعت اسلامی ہند سے وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے میری وابستگی اول روز سے ہی ہے اور کئی بار میں مقامی امیر بھی رہا۔اس انٹرویو کے آخر میں انہوں نے جماعت اسلامی ہند کی سمت ورفتار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس کی رفتار سست ضرور ہے مگر جس ماحول میں وہ کام کررہی ہے اور افکار و اعمال کے جس تیز وتند دھارے کے ٹھیک سامنے والی سمت میں اسے قدم بڑھانا پڑ رہا ہے، اسے دیکھتے ہوئے اس کی جدو جہد کو بے وزن و بے ثمر خیال کرنا بڑے ظلم کی بات ہے اور اعتراف کرتے ہیں، اس کی سمت ورفتار اور جدو جہد کافی اطمینان بخش ہے۔اس انٹرویو کے شروع اور آخر میں ڈاکٹر سید عبدالباری نے مولانا کی شخصیت اوران کی خدمات پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے اس کے علاوہ انہوں نے مولانا پر ایک خاکہ بھی قلم بند کیا ہے جو ان کی کتاب ''انوکھے لوگ نرالی باتیں'' میں شامل ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مولانا ابوالحسن علی ندوی جنہیں عالم اسلام علی میاں ندوی کے نام سے جانتا ہے۔ان کی شخصیت ایک روشن دماغ، اسلامی مفکر، دور اندیش مورخ، دردمند معلم، سلیم الطبع قائد اور روشن ضمیر مربی و مصلح کی حیثیت سے پوری دنیا میں جانی پہچانی جاتی ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے مولانا علی میاں ندوی کا انٹرویو بریلی میں دوام کے لئے لیا تھا۔اس انٹرویو میں علی میاں ندوی نے اپنے ابتدائی حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اپنی تصنیف وتالیف سے متعلق کچھ اہم باتوں سے قارئین کو روشناس کرایا۔اپنی دینی خدمات پر کافی طویل گفتگو کی۔چونکہ مولانا کی شخصیت اسلامی تھی اس لئے اس انٹرویو میں زیادہ تر انہیں امور پر باتیں ہوئیں ہیں۔مولانا، اپنی تصانیف پر بات کرتے ہوئے اپنے اسلوب کے بارے میں بتاتے ہیں کہ میں جدید ترین اور دلکش اسلوب کا قائل ہوں اور اردو ادب میں '' آب حیات'' کے مصنف مولانا آزاد، شبلی اور نذیر احمد کے اسالیب سے کافی متاثر ہوا ہوں اور عصرِ حاضر میں ذہنی طور پر علامہ اقبال سے زیادہ کسی اور سے متاثر نہیں ہوا ہوں۔اقبال کی فکر، ان کا یقین و اعتماد اور خودنگری کا پیغام مولانا کی فکر میں پیوست ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے علی میاں ندوی کے شعور و بصیرت پر علامہ اقبال کے نظریات کا گہرا اثر اپڑا ہے۔علی میاں ندوی علامہ اقبال سے اپنی دو ملاقاتوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ان کی فکر وفن کے جس پہلو سے وہ زیادہ متاثر ہوئے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ان کے یہاں میں نے تین باتوں کی آمیزش پائی۔ایک تو عشق بالخصوص ذات نبوی سے عشق، دوسرے اسلام کی برتری اور صلاحیت پر یقین، تیسرے غلبہ وعظمت کی تلاش، یہ تینوں چیزیں نسلی اور موروثی طور پر خود میرے خمیر میں تھیں اور اسی وجہ سے اقبال میرے خوابوں کی تعبیر بن گئے۔''١٨

ادب کے ذریعے انقلاب لایا جاسکتا ہے،مولانا علی میاں ندوی اس خیال کو غلط تصور کرتے ہیں اور یہ بھی غلط تصور کرتے ہیں کہ ادب کو کسی انقلاب کی ضروت ہے۔ان کا ماننا ہے اس معاملے میں ادب میں تناسب و توازن کی ضرورت ہے۔ادبی گفتگو کے بعد مولانا سے سیاسی گفتگو ہوئی ،جس سے پتہ چلتا ہے مولانا کا کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔البتہ ذہنی طور پر جمیعۃ العلماء سے ایک لگاؤ تھا مگر کبھی اس کی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیا۔ان سب باتوں کے علاوہ مولانا نے عالم اسلام سے متعلق بہت سی باتیں فلسفیانہ انداز میں کیں۔ غرض ڈاکٹر سید عبدالباری کا یہ انٹرویو زیادہ تر اسلامی موضوعات پر بکھرا پڑا ہے۔

مولانا علی میاں ندوی کے علاوہ اس کتاب میں اور جن شخصیتوں کے انٹرویوں پیش کیے گئے ہیں سب کی نوعیت یہی ہے۔سب کی سیاسی اور ملی خدمات کا تذکرہ اس کتاب میں تفصیل سے پڑھنے کو ملتا ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے نہ صرف ان شخصیات کی ذہنی اور فکری بلندی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ عبدالباری کی سیاسی و ملی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور امت مسلمہ کا جو درد ان کے اندر پوشیدہ تھا وہ ان کے سوالوں کے ذریعے اس کتاب میں صاف عیاں ہوتا ہے۔جب وہ سبھی شخصیات سے مسلمانوں کے مسائل اور ان کی صورتِ حال پر سوال کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے، وہ قوم کے لئے کتنا بے چین و بے قرار ہیں اور معلوم ہوتا ہے وہ انہیں سوالات کی روشنی میں ان سب کا حل تلاش کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے یہ انٹرویوز ''دوام'' میں شائع کرنے کے لئے تھے اور رسالہ ''دوام'' اسلامی ادب کے ترجمان کی حیثیت سے نکلتا تھا،اس لئے اس میں انہوں نے انٹرویوز کے لئے ایسی شخصیتوں کا انتخاب کیا جن کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا اور جنھوں نے ملک میں مسلمانوں کی ترویج وترقی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔لہذا ڈاکٹر سید عبدالباری کے اس انٹرویو کی غرض وغایت یہ تھی کہ ہندوستان میں آزادی کے پہلے اور بعد میں مسلمانوں کی جو صورتِ حال تھی،اس کا احاطہ کرتے ہوئے ،اس سلسلے میں ان شخصیات کی خدمات سے عوام کو روشناس کیا جائے۔مسلمانوں کے مسائل کا حل تلاش کرنا ان انٹرویوز کا اصل مقصد معلوم ہوتا ہے۔عبدالباری نے دوام میں ان انٹرویوز کو شائع کرکے

عوام کو مسلمانوں کی حقیقی تاریخ سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کی کوشش بھی کی ہے۔

ان انٹرویوز کو ڈاکٹر سید عبدالباری نے جس اسلوب میں پیش کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ان شخصیات کے دیئے ہوئے بیان کو بعد میں الفاظ کا بہترین جامہ پہنا کر اس میں دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انٹرویو کی ابتدا میں انہوں نے شخصیات کے تعارف میں جو انداز بیانِ اختیار کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے انہیں منظر کشی پر عبور حاصل ہے۔ ان کی یہ خصوصیت انہیں خاکہ نگاری کے فن سے قریب کر دیتی ہے۔ ان کے انٹرویوز کا مطالعہ کرتے ہوئے بعض دفعہ ان میں خاکہ نگاری کی بھی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ انٹرویو بھی خاکہ نگاری کی ایک شکل ہے، جس میں شخصیت کے خد و خال، افکار وخیال اور زندگی کے تمام پہلوؤں سے قارئین کو بخوبی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ بات صحیح بھی ہے، جب ہم اس انٹرویوز کے مجموعے ''ملاقاتیں'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے اس شخصیت کی تصویر آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے لگتی اور ایسا محسوس ہوتا ہے، ہم خود ان کے سامنے بیٹھ کر ان کی زبانی ساری تفصیلات سن رہے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے واقعی یہ ایک اہم اور نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے، جس سے نہ صرف ان کی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ادب میں انٹرویوز کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ان کی دوراندیشی کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔

اس کتاب کے مختصر سے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان انٹرویوز کی نوعیت سیاسی، ملی اور غیر ادبی ہے ۔مگر جہاں جہاں اردو زبان و ادب پر ان شخصیات نے اظہار خیال کیا ہے، اس کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ ان انٹرویوں میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے علاوہ سبھی شخصیتیں غیر ادبی اور مذہبی ہیں۔ اس لئے اس میں زیادہ تر اسی موضوع پر گفتگو ملتی ہے۔ غرض ڈاکٹر سید عبدالباری کی اس کتاب کی اپنی ایک الگ اہمیت و افادیت ہے خصوصاً نئی نسل کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے، جس سے انہیں اپنا آئیڈیل تلاش کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

☆☆☆

حواشی

(۱) ڈاکٹر شاہد حسین، اداریہ نگاری، ابلاغیات، ص۔۱۵۴

(۲) ڈاکٹر شاہد حسین، اداریہ نگاری، ابلاغیات۔ ص ۱۵۵

(۳) ڈاکٹر سید عبدالباری، اداریہ، دوام، اپریل ۱۹۶۷ء

(۴) ڈاکٹر سید عبدالباری، اداریہ، پیش رفت، اگست ۱۹۹۳ء

(۵) ڈاکٹر سید عبدالباری، اداریہ، دوام، نومبر ۱۹۷۴ء

(۶) ڈاکٹر سید عبدالباری، اداریہ، دوام، فروری ۱۹۶۹ء

(۷) خالد محمود، اردو میں اداریہ نگاری: ایک جائزہ، اردو صحافت۔ ماضی اور حال، ۲۱۷۔۲۱۸

(۸) ڈاکٹر سید عبدالباری، مقدمہ، ملاقاتیں، ص۔۵

(۹) ڈاکٹر سید عبدالباری، ملاقاتیں، ڈاکٹر سید محمود کا انٹرویو، ص۔۴۲

(۱۰) ڈاکٹر سید عبدالباری، ملاقاتیں، انٹرویو، ڈاکٹر سید محمو۔ص۔۵۳

(۱۱) ڈاکٹر سید عبدالباری، ملاقاتیں، انٹریو ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، ص۔۸۳

(۱۲) ڈاکٹر سید عبدالباری، ملاقاتیں، انٹرویو، عبدالماجد دریا آبادی، ص۔۱۲۸

(۱۳) ڈاکٹر سید عبدالباری، ملاقاتیں، انٹرویو مولانا عبدالماجد دریا آبادی، ص۔۱۳۴

(۱۴) ڈاکٹر سید عبدالباری، ملاقاتیں، انٹریو بدرالدین طیب جی، ص۔۲۰۱

(۱۵) ڈاکٹر سید عبدالباری، ملاقاتیں، انٹرویو، بدرالدین طیب جی، ص۔۲۰۱

(۱۶) ڈاکٹر سید عبدالباری، ملاقاتیں، انٹرویو بدرالدین طیب جی، ص۔۲۰۵

(۱۷) ڈاکٹر سید عبدالباری، ملاقاتیں، انٹرویو بدرالدیں طیب جی، ص۔۲۰۷

(۱۸) ڈاکٹر سید عبدالباری، ملاقاتیں، انٹرویو مولانا ابوالحسن علی ندوی، ص۔۳۰۶

حاصل مطالعہ

ڈاکٹر سید عبدالباری کی شخصیت بیسویں صدی میں اردو تحقیق وتنقید کی دنیا میں ایک منفرد مقام ومرتبہ کے کی حامل ہے۔ وہ بیک وقت ایک ناقد، دیدہ ور محقق، پر مغز دانشور، فن شناس، کہنہ مشق شاعر اور بیباک صحافی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ سید عبدالباری نے جس وقت اردو ادب کی دنیا میں قدم رکھا، ترقی پسند تحریک اپنے نشیب وفراز سے گزر کر زوال کے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ وہی عہد تھا جب ترقی پسند تحریک سے وابستہ بیش تر ادیبوں کو چند بندھے ٹکے اصول اور مخصوص نظریہ کے تحت ادب کی تخلیق کرنا گراں گزر رہا تھا۔ اس عہد میں چند ادیبوں اور فنکاروں نے مادی اور خارجی مسائل سے قدرے آزاد ہو کر اپنے ذاتی تجربات اور انفرادیت کو ادب کا مرکز ومحور بنانا چاہا۔ دراصل ترقی پسند تحریک کا مقصد سماجی زندگی اور اس کے مسائل کو ادب سے ہم آہنگ کر کے زندگی اور معاشرے کو بہتر بنانا تھا۔ غالباً اسی سبب سے مذکورہ تحریک نے اجتماعی فکر اور مسائل کو زیادہ اہمیت دی۔ انہوں نے انسان کے ذاتی وانفرادی مسائل کو تقریباً نظر انداز ہی کر دیا، یہاں تک کہ انہوں نے قدیم ادبی ورثے کو بھی رد کرنے کی کوشش کی کہ اس میں انسان کی داخلی کیفیات، عشق ومحبت، گل وبلبل کی کہانیوں اور اس کی تنہائی کے ماسوا کچھ نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے قدیم ادبی وتہذیبی روایات سے انحراف کیا۔ جس کے سبب ادب کے فنی محاسن بھی پسِ پشت چلے گئے اور ادب پروپیگنڈہ یا محض نعرہ بازی کا ادب بن کر رہ گیا، لیکن انہیں ادیبوں اور فنکاروں کے متوازی کچھ شاعر وادیب اس بات کے قائل تھے کہ ادب کو سماجی تبدیلیوں کی ہمنوائی کے ساتھ ساتھ ادب میں نت نئے تجربوں، ہیئتی اور اسلوبیاتی تبدیلیوں کو بھی نظر میں رکھنا چاہئے۔ نتیجتاً تبدیلی کے خواہاں ان شاعروں اور ادیبوں نے ترقی پسند تحریک سے فاصلہ بنانا شروع کر دیا۔ حلقۂ اربابِ ذوق بھی ایسے ہی شاعروں اور ادیبوں کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا جو ادب میں ہر طرح کے تجربوں کا حامی، نیز ہر طرح کی بندشوں کا مخالف تھا۔ یہی حلقۂ اربابِ ذوق آگے چل کر جدیدیت کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوا۔

ادب کی مذکورہ تقسیم سے قبل ہندوستانی معاشرے پر ہم نگاہ ڈالیں تو بآسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے ساتھ مقامی، مذہبی، اثرات بھی نمایاں ہونے لگے۔ یہ اثرات صرف ادب تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ شعبۂ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ میں بھی ان کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جب تحریکِ آزادی اپنے آخری دور میں داخل ہوتی ہے تو معاشرے کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کے ساتھ ساتھ ادب بھی مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہوتا نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس کے موجد کے طور پر حالی اور سرسید کو شہرت حاصل ہے تاہم مختلف نظریوں سے تعلق رکھنے والوں نے حالی اور سرسید کے اسی مقصدی نظریہ کو مذہبی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش

کی۔مثلاً: مدن موہن مالویہ اور دیا نند سرسوتی وغیرہ نے ہندو ادب کے اصول وضوابط متعین کرنے کی کوشش کی۔ جس میں مذہبی بنیادوں پر تقسیم کے علاوہ نسلی تقسیم بھی واضح طور پر نظر آتی ہے۔دوسری جانب مولانا مودودی اور رفقاء کار نے اسلامی تحریک کی بنیادویں استوار کرنا شروع کیں۔

تحریک ادب اسلامی کا مقصد یہ تھا کہ اس وقت کے زیادہ تر فن کاروں اور ناقدوں نے مذہب کو ادب سے الگ رکھنے کی پر زور کوشش کی تھی ،اس کے برعکس اسلامی افکار پر مبنی ادب کی تخلیق کی جائے اور اسلامی سیرت کے مطابق شعراء وادبا کی کردار سازی کی جائے۔اوراس کی بنیاد پر ایک صالح انسانی معاشرے کا قیام کرنا تھا۔ان خیالات ونظریات کی اشاعت وتبلیغ کے لئے ملک بھر میں اس کی متعدد شاخیں قائم کی گئیں ۔رسالے اور اخبار بھی جاری ہوئے۔اس کے علاوہ مختلف رسالوں نے اس کی تائید کی۔خاص طور سے علی گڑھ میگزین نے نظریات نمبر شائع کر کے اس کے مقصد کی بالخصوص وضاحت کی۔اس تحریک کے سارے افکار و نظریات، علامہ اقبالؔ ،حالیؔ اور شبلیؔ کے قرآنی تصوارت پر مبنی تھے۔غرض یہ کہ تحریکِ اسلامی ادب کے علم برداروں نے مضامین، نظموں ،غزلوں اور افسانوں کے ذریعے اپنے نظریۂ ادب کی منہاج ومعیار کو پیش کرنے کی بھر پور کوشش کی اور اپنے تنقیدی نظریات کے ذریعے ادبی ذخیرے میں گراں قدر اضافے کئے۔

اس زمانے میں سید عبدالباری صاحب بھی تحریکِ اسلامی ادب سے متاثر ہوئے اور طالب علمی کے زمانے میں اس کی رکنیت حاصل کر لی تھی۔دراصل سید عبدالباری صاحب کا تعلق جس خاندان سے ہے وہ کافی حد تک مذہبی اور دیندار رہے۔آج بھی یہ خاندان نیکی اور پرہیز گاری کے اعتبار سے پورے شہر ٹانڈہ میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔ان کی تعلیم وتربیت مذہبی انداز میں ہوئی تھی۔بچپن سے ہی نیکی وپرہیز گاری ان کا جزومزاج بن گئی۔یہی وجہ ہے جب پورے ملک میں کئی تحریکیں ایک ساتھ چل رہی تھیں تو انہوں نے تحریکِ اسلامی ادب میں نہ صرف بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ اپنی کوششوں اور کاوشوں سے ادارۂ ادب اسلامی ہند کے صدر بھی منتخب کئے گئے۔حالانکہ انہوں نے جب ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا اس وقت ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کے نظریات وخیالات کی ہر طرف پزیرائی ہورہی تھی۔آپ کے ہم عصروں نے ہوا کے رخ کو محسوس کیا اوراس میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا ،لیکن آپ نے اس وقت بھی اپنے قلم کو اس کے سایے سے محفوظ رکھا۔دراصل سید عبدالباری صاحب مذہبی انسان تھے۔وہ کسی بھی حالت میں ایمان کا سودا کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔جیسا کہ سبھی ترقی پسندوں اور جدیدیت کے حامیوں نے کیا۔اس وقت نہ صرف ڈاکٹر عبدالباری بلکہ

ہندوستان کے زیادہ تر لوگوں کی ذہنیت مذہبی تھی اور سبھی ایک بھگوان یا خدا پر یقین رکھنے والے تھے۔ان کا ماننا تھا خدا ایک ایسی قوت ہے، جو پوری دنیا کو چلا رہی ہے اس کے برعکس اشتراکیت اور جدیدیت کے حامیوں نے مذہبی اقدار کو نہ صرف نظر انداز کیا بلکہ اس کا مذاق بھی اڑایا اور انسانی قوت اور اس کے مذہبی اقدار کو چھوڑ کر مادیت پر زور دیا۔انہوں نے ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرنے کی پرزور کوشش کی جو ہندوستان کی عام روایت کے بالکل مخالف تھا۔ جب روحانیت کے تصور کو کاری ضرب لگی اور اس کے تصور کو رجعت پسندی اور اوہام پرستی کا شاخسانہ قرار دیا تو اس وقت سید عبدالباری نے بڑی خاموشی کے ساتھ اس تحریک کی مخالفت میں اسلامی اصول پر مبنی ''تعمیر پسند ادب'' کے نظریات کو پیش کرتے رہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری پوری زندگی اسی زاویہ فکر کو اپنی تنقیدی و تحقیقی سرگرمیوں کی بنیاد بنا کر قوم کی رہنمائی اور اردو ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ان کی کوئی بھی تنقیدی تحریر ایسی نہیں ہے جو اسلامی فکر سے خالی ہو۔تنقیدی مضامین میں انہوں نے جو ذاتی نظریات و افکار پیش کئے ہیں ان میں اس فکر کی کارفرمائی ہر جگہ نمایاں ہے۔سید عبدالباری نے اپنے بیش تر مضامین میں اسی فکر کو اپنا محور تسلیم کر کے اپنے نقطہائے نظر کو واضح کرنے کی حتیٰ الامکان سعی کی ہے۔غرض یہ کہ انہوں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ اخلاقی اور تہذیبی اقدار و روایات کا خیال رکھتے ہوئے بڑی خاموشی سے اردو شعر و ادب کی خدمت میں صرف کر دیا۔

سید عبدالباری صاحب پاکیزہ اور صالح ادب کے ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ ادب برائے ادب اور ادب برائے بندگی کے قائل تھے۔یہی وجہ ہے کہ تہذیب، اخلاق اور اقدار کا پہلو ان کی تحریروں میں واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔اخلاقی اقدار کا یہ پرتو محض ان کی تحریروں میں ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت میں بھی واضح طور پر نظر آتا ہے۔انہوں نے سرسید، حالی، شبلی اور اقبال کی ادبی روایات اور فکری ورثہ کے تسلسل کو اپنی تحریروں میں ہمیشہ برقرار رکھا اور مشرق کے متعدد دانشوروں، نقادوں نے فکر و تنقید کے سلسلے میں جو نظریات قرآن و حدیث کی روشنی میں پیش کئے ہیں ان سے حتیٰ الامکان استفادہ کرتے ہوئے، کلاسکیت، رومانیت، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے درمیان فکر و تنقید کی ایک منفرد اور متوازن راہ قائم کی ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کا شمار ادب میں ایک محقق، ناقد اور صحافی کی حیثیت سے ہوتا ہے، مگر انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔انہیں شعر و شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا، مگر اس میدان میں وہ بہت

زیادہ کامیابی حاصل نہیں کرسکے، اس لئے انہوں نے بہت جلدی اپنا رخ موڑ لیا اور تنقید و تحقیق کی دنیا سے وابستہ ہوگئے۔ حالانکہ شعر گوئی کا ملکہ ان میں فطری تھا۔ اگر اس میں وہ اور محنت کرتے تو تعمیر پسند شعرا میں شاعری کے حوالے سے ایک اہم نام ہوتا۔ انہوں نے شاعری کو محض تفنن طبع کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ اسے اخلاقی و معاشرتی اصلاح کا وسیلہ اور انسانیت کی خدمت کا مستحسن ذریعہ بنایا اور اپنی شاعری کے ذریعے اقبال کی طرح اپنے عہد اور آنے والی نسل کو ایک مثبت پیغام دیا، لیکن غزل ہو یا نظم ہر جگہ فن کے تقاضوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ ان کی بعض نظمیں ایسی ہیں جو مختلف اور اہم واقعات سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کی شاعری بیسوی صدی کے نصف آخر میں رونما ہوئے تمام واقعات کا شعری پیکر اور تہذیبی اقدار، فکر و نظر، اور تہذیبی نشیب و فراز کا ایک بہترین مرقع ہے۔ ان کی شاعری میں ہوس پرستی اور نفس پرستی کے جذبات نہیں ملتے ۔انہوں نے اپنی شاعری میں اکبر، حالی، شبلی اور اقبال کی روایات کو حتیٰ الامکان برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے اور اردو شاعری کو مذہبی بنیادوں سے روشناس کرانے کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ غرض یہ کہ ان کی شاعری اسلامی محور پر گردش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری اپنی شاعری میں ہیئتی اعتبار سے کوئی نیا تجربہ نہیں پیش کر سکے۔ مگر پھر بھی موضوعاتی اعتبار سے اردو شاعری کا دامن تازہ مواد اور فکر سے وسیع ضرور کیا ہے۔ ان کی شاعری کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انہوں نے اردو شاعری میں تعمیری ادب کے نظریات کو فروغ دینے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے اور اسلامی ادب سے وابستہ سبھی شعرا کو ایک نئی راہ دیکھانے کی حتیٰ الامکان کوشش کی ہے۔ شاعری کے حوالے سے بھی ڈاکٹر سید عبدالباری کو ان کے مثبت پیغامات، فکر و فن اور تعمیری نظریات کی بنا پر ادب کی دنیا میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

شاعری سے کنارہ کش ہونے کے بعد انہوں نے تحقیق کی دنیا میں قدم رکھا۔ اس میدان میں بھی انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ خاص طور پر اردو زبان و ادب کی تاریخ کا تہذیبی مطالعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا، منفرد اور معرکتہ الآرا کارنامہ ہے۔ جس کو اہل ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تحقیق کے ذریعے اٹھارویں اور انیسویں صدی کا جائزہ بھی یہاں کی تہذیبی و معاشرتی تاریخ کے آئینے میں لیا ہے اور پہلی جنگِ آزادی کے بعد مشرق و مغرب کے باہم روابط اور دونوں کے نقادوں کے خیالات کی روشنی میں بڑی فکر انگیز گفتگو کی ہے۔ انہوں نے اپنے اس تحقیقی مقالے میں پوری دو صدی کے دوران اودھ کے اہم خطے خاص کر لکھنؤ اور فیض آباد کے علاقوں کی تہذیب و معاشرت کا بڑی سنجیدگی سے مطالعہ کرتے ہوئے ادب پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کی نشان دہی جس انداز سے کی ہے، اس سے

ادب کے ثقافتی وعمرانی مطالعہ کی راہ آسان ہو جاتی ہے۔اس سے پہلے بھی دبستانِ لکھنؤ اور ہندوستانی تہذیب و معاشرت پر متعدد تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں اور بہت سی کتابیں منظرِ عام پر آئیں ،مگر ابھی تک کوئی تصنیف اس کے ہم پلہ ثابت نہیں ہوئی ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے ان تحقیقی مقالوں سے نہ صرف لکھنؤ کے ادبی کارناموں کی تفہیم میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے بلکہ ان کی یہ کاوشیں پورے ادب کے مطالعے میں کافی اہم ثابت ہوسکتی ہیں۔

غرض یہ کہ سید عبدالباری نے اپنی تمام تصانیف میں معاشرتی اور تہذیبی عنوانات پر بہتر کام کیا ہے اور لکھنؤ کے شعر و ادب کا جس طرح سے تہذیبی ،ثقافتی اور سماجی پس منظر میں مطالعہ کیا ہے، اسے اردو ادب کی تاریخ میں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔دراصل دبستانِ لکھنؤ ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس موضوع پر محنت ، سچی لگن اور دیانت داری کے ساتھ اس کے مختلف پہلوؤں پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔اپنے ان تحقیقی کارناموں میں انہوں نے بڑے سلیقے سے فکری اور تنقیدی رویوں میں توازن برقرار رکھتے ہوئے اعتدال پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے ان مقالوں سے جو تاثرات مرتب ہوئے ہیں وہ مستقبل میں اردو اسکالروں کے لئے ایک نئے باب کا در وا کرتے ہیں۔

تحقیق کے علاوہ ڈاکٹر سید عبدالباری نے تنقید کی دنیا میں جو کارنامہ انجام دیا ہے، اسے کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ان کے تنقیدی مجموعوں کی کل تعداد آٹھ ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے پیش رفت میں جو اداریے تحریر کئے ہیں وہ بھی ان کی نظریاتی تنقید کا بہترین مظہر ہیں۔انہوں نے اپنی تنقید نگاری میں موجودہ عہد کی روش سے ہٹ کر ایک منفرد راہ اختیار کی ہے۔ادب میں مغرب سے درآمد نظریات سے احتراز کرتے ہوئے مشرقی روایت کی روشنی میں تنقید کے اصول وضوابط مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔تنقید کی دنیا میں ڈاکٹر سید عبدالباری کے مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔انہوں نے تنقید میں بھی تعمیری رجحانات کے ساتھ ساتھ عمرانی مطالعے کو زیادہ اہمیت دی ہے۔نظریاتی تنقید ہو یا عملی سبھی میں ان کا یہ نقطۂ نظر کارفرما نظر آتا ہے۔انہوں نے سبھی شعرا و ادباء کا جائزہ بھی معاشرتی وثقافتی اور تہذیبی اقدار کے آئینے میں پیش کرتے ہوئے عمرانیاتی تنقید کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے موجودہ عہد کے سبھی تنقیدی دبستان سے ہٹ کر ایک منفرد اور متوازن راہ اختیار کرتے ہیں وہ جدید نقادوں کی طرح صرف فن اور ہیت پر توجہ مرکوز نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ موضوع کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری نے ادب میں

مواد، موضوع اور فکر کو کافی اہمیت دی ہے۔ وہ ایک نقاد کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ فن کار کے فکر و احساس کے ساتھ ساتھ اس کے نظریوں کو بھی خاص اہمیت دے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری ترقی پسند نظریات اور جدیدیت دونوں کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے اپنی تنقید نگاری میں ان نظریات کی خوب مخالفت کی ہے۔ جنہوں نے ادب کو پروپیگنڈہ بنا کر رکھ دیا تھا اور وہ مذہب و اخلاقی اقدار کے مخالف بھی تھے۔ اس کے علاوہ جدیدیوں نے ادب کو فن اور لسانی ہیت تک محدود کر کے رکھ دیا تھا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے ان سب کے خلاف خوب لکھا اور اپنے قلم سے ان سبھی منفی نظریات کا مقابلہ کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے جس وقت تنقید کی دنیا میں قدم رکھا اس وقت مارکسی، تاثراتی، جمالیاتی، سائنٹفک، نفسیاتی، ہیتی، اور ساختیاتی نہ جانے کون کون سے دبستان منظر عام پر آ چکے تھے۔ مگر ڈاکٹر سید عبدالباری تا عمر اپنے نظریات و اصول پر قائم رہے اور ان سب تنقیدی دبستانوں کے بالمقابل تعمیری ادب کا نظریہ پیش کرتے ہوئے مثبت اور متوازن تنقید کی راہ اختیار کی اور اپنی تنقید میں حالی، شبلی، اکبر اور اقبال کی روایت کو آگے بڑھانے میں بیسویں صدی کے نصف آخر میں اہم رول ادا کیا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کے تمام تنقیدی مجموعوں کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا کوئی بھی مقالہ ایسا نہیں ہے جس میں تعمیری ادب کے متوازن اور مثبت رجحان کی جھلک نہ دیکھنے کو ملتی ہو۔ ان کی تنقید نگاری میں فکر و فن کا توازن اور کائنات کے بارے میں ایک تعمیری و مثبت اندازِ فکر ہمیں ادب کو ایک نئے زاویے سے غور و فکر کرنے اور پرکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اسلامی اقدار و روایت کی روشنی میں ادبی تنقید کی دنیا میں ایک منفرد و متوازن انداز اختیار کیا۔ نظریاتی تنقیدوں اور عملی تنقیدوں میں انہوں نے جادۂ اعتدال کی روش پر چلنا مناسب سمجھا۔ انہوں نے اپنے مجموعۂ مقالات میں ادب کی سبھی اصناف سخن، نثر ہو یا نظم پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ فن، ہیت، اسلوب اور زبان کے ساتھ ساتھ معاشرتی و ثقافتی معنویت اور ادیب کے اقدار کے شعور کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کی تنقید نگاری کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر بآسانی پہنچتے ہیں کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں، خاص طور سے تعمیری ادب کے حلقے میں ابھی تک ان جیسا ذی وقار اور ذی فہم ناقد نہیں پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ پروفیسر عبدالمغنی، ابن فرید، نعیم صدیقی، اسعد گیلانی اور نجات اللہ صدیقی وغیرہ بھی اس عہد میں اسلامی نظریات کو فروغ دے رہے تھے، مگر جو توازن واعلیٰ فکر ڈاکٹر سید عبدالباری کی تنقید نگاری میں دیکھنے کو ملتی ہے، وہ اس عہد کے کسی اور نقاد کے یہاں مشکل سے ملے گی۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ

ڈاکٹر سید عبدالباری بطور نقاد ادب میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص طور سے انہوں نے اسلامی ادب کی روشنی میں جو ادبی نظریات پیش کئے ہیں اس کی بنا پر انہیں موجودہ عہد میں ایک منفرد مقام و مرتبہ ملنا چاہئے، جس کے وہ حق دار بھی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کا تنقید اور تحقیق کے بعد جو سب سے اہم کارنامہ ہے وہ ادبی صحافت ہے۔ انہوں نے متعدد رسالوں کے اداریے تحریر کئے ہیں، جن میں ان کے تنقیدی مسلک کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے آبائی وطن ٹانڈہ سے ادارۂ ادب اسلامی ہند کا ترجمان ادبی ماہنامہ ''دوام'' جاری کیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کے بند ہو جانے کے بعد اسے پھر ''دوامِ نو'' کے نام سے ذاتی طور پر نکالنا شروع کیا، لیکن چند برسوں کے بعد یہ بھی بند ہو گیا۔ اس سے قبل ادارۂ ادب اسلامی ہند کے تحت نکلنے والے رسالہ ''نئی نسلیں'' سے منسلک رہے۔ ادارہ کے ترجمان ماہنامہ ''پیش رفت'' اور آل انڈیا ملی کونسل کے رسالہ ''ملی اتحاد'' جیسے ادبی، سیاسی اور ملی جریدے کی ادارت کی ذمہ داری آخری سانس تک نبھاتے ہوئے بامقصد صحافت نگاری کی خدمت انجام دی۔ اس کے علاوہ انگریزی ہفتہ وار ''ریڈینس'' سے بھی چند سال منسلک رہے۔ انہوں نے ملک کے اکثر و بیشتر جرائد و اخبارات میں تنقید و تحقیق کے علاوہ قومی و بین الاقوامی مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے مختلف سیاسی و ملی موضوعات پر سیکڑوں کالم، مضامین اور اداریے بھی قلم بند کئے ہیں۔ رسالہ پیش رفت میں انہوں نے بے شمار اداریئے قلم بند کئے ہیں، ان اداریوں کا مجموعہ ''روشنی بکھرتی ہے'' بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اپنی ادبی و صحافتی زندگی کے دوران انہیں اندرون و بیرونِ ملک کے مشاعروں اور کانفرنسوں میں جانے اور ملک کی عظیم ادبی و ملی شخصیات سے انٹرویو لینے کا موقعہ بھی ملا۔ ان کے لئے ہوئے انٹرویو پر مبنی کتاب ''ملاقاتیں'' بھی شائع ہو چکی ہے۔ جس میں عبدالماجد دریا آبادی، سید محمود، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، بدرالدین طیب جی، مولانا ابواللیث اصلاحی، مفتی فخر الاسلام، مولانا صدرالدین اصلاحی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی وغیرہ جیسی شہرۂ آفاق شخصیات سے لئے ہوئے پرمغز و بامقصد انٹرویو شامل ہیں جن کے مطالعے سے ہمیں اس زمانے کی اہم شخصیات کے خیالات و افکار اور ان کی ملی و سیاسی خدمات سے کما حقہ واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ صحافت سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ یہی سبب ہے زندگی کے ہر موڑ پر، آخری سانس تک صحافت سے جڑے رہے اور اپنی تحریروں کے ذریعے ادبی و ملی خدمات انجام دیتے رہے۔ غرض ڈاکٹر سید عبدالباری کی شناخت ادب میں ایک صحافی کی حیثیت سے بھی ہوتی ہے۔ انہوں نے صحافت کی دنیا میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں ان کی بنا پر اردو ادب کی تاریخ میں وہ ایک اہم و ممتاز صحافی کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

ان سب کے علاوہ غیر افسانوی ادب پر طبع آزمائی کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری نے بیسوی صدی کی کچھ عظیم شخصیتوں کے خاکے بھی تحریر کئے ہیں جو''انوکھے لوگ نرالی باتیں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ان خاکوں میں انہوں نے ملک کی عظیم اور جلیل القدر شخصیتوں اوران کے کارناموں کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔جو آنے والی نسل کے لئے یقیناً مشعل راہ ثابت ہوں گے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے یہ خاکے ہندوستان کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔جس میں انہوں نے شخصیتوں کے پس منظر میں گزشتہ ہندوستان کی سیاسی وسماجی تاریخ بھی مرتب کردی ہے۔غرض یہ کہ انہوں نے خاکہ نگاری کے فن کو مستقل طور پر اپنایا اوراس میدان میں بھی وہ اپنے پیش رو اور ہم عصر خاکہ نگاروں سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالباری نے سوانح نگاری کے فن پر بھی طبع آزمائی کرتے ہوئے''حیات جہانگیر اشرف سمنانی'' بھی تحریر کی ہے،جس میں انہوں نے مخدوم اشرف سمنانی کی مکمل حیات مبارکہ اوران کے اقوال وافکار کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سید عبدالباری کی ایک حیثیت سوانح نگار کی بھی ہے۔سوانح نگاری کے علاوہ انہوں نے ایک سفر نامہ''جلوے ہیں بے شمار'' بھی تخلیق کیا ہے۔جو سفر حج کی مکمل روداد ہے۔جس کو انہوں نے حج سے واپس آنے کے قلم بند کیا۔ڈاکٹر سید عبدالباری کا یہ سفر نامہ اگر چہ مذہبی نوعیت کا ہے،مگر یہ سفر نامہ منظر کشی کے حسن،واقعات ومشاہدات کی حقیقت بیانی،زبان واسلوب میں ادبی آمیزش اوراس عہد کے حجاز کی تصویر کشی کی بناء پر سے اردو ادب میں ایک خاص اہمیت ومرتبے کا حامل ہے۔

سید عبدالباری صاحب کی ادبی خدمات صرف تحقیق،تنقید،صحافت اور شعری روایات تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ انہوں نے ملی،تاریخی،دینی اور روحانی موضوعات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ان کی ایک پہچان اسلامی اسکالر اور اسلامی ادب کے ترجمان کی حیثیت سے بھی ہے۔نوجوانی میں ہی وہ جماعتِ اسلامی ہند سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۶۰ء کی دہائی میں سیاست میں شمولیت کی بنا پر جماعت سے ان کا تعلق برقرار نہ رہا۔اسی اثناء ۱۹۶۴ء میں آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت میں سرگرم عمل رہے اور ۱۹۹۲ء میں آل انڈیا ملی کونسل سے جڑ گئے اور تاحیات ایک اسلامی مفکر کی حیثیت سے مختلف خدمات انجام دیتے رہے۔ان سب کے باوجود جماعتِ اسلامی ہند سے گہری اور فکری وابستگی آخری لمحات تک قائم رہی۔جماعت کی تنظیم تصنیفی اکیڈمی کے سکریٹری رہے۔ان سب کے علاوہ ایک طویل عرصے تک ادارۂ ادب اسلامی ہند کے صدر بھی رہے۔انہوں نے جہاں تنقید وتحقیق پر مشہور کتابیں لکھیں وہیں اسلامی ادب پر مبنی''اسمائے حسنٰی اور کردار سازی''،''آزاد ہندوستان میں مسلم تنظیمیں''،''جمہوریت انسان دوستی اوراسلام''،''دہشت گردی اوراسلام''،''اسلام میں آدابِ اختلاف'' جیسی

اہم اور پر مغز کتابیں بھی تصنیف کیں۔غرض یہ کہ اسلامی فکر کے ترجمان کی حیثیت سے بھی عبدالباری صاحب کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے

ڈاکٹر سید عبدالباری کی جملہ ادبی خدمات کا تفصیل سے جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ اس عہد کی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں،جنہوں نے ادب میں تحقیق و تنقید،شاعری اور صحافت کے علاوہ ادب کی مختلف اصناف سخن میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں اور اپنی مخصوص فکر و نظر اور عمرانی مطالعے کی روشنی میں ادب کو ایک نئی راہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کا شمار موجودہ صدی کے ایک باشعور قلم کار اور نمایاں نقاد،دیدہ ور محقق،پر مغز صحافی اور قد آور شخصیت میں ہوتا ہے۔امید ہے آنے والی نسل ان کی ذہنی و فکری کاوشوں سے بھرپور تعاون حاصل کرے گی۔جس سے اردو ادب ایک نئے اور اہم موڑ سے روشناس ہوگا اور ان کی تحریروں سے کچھ ٹھوس نتائج برآمد ہو سکیں گے،جو آئندہ نسل کے لئے مثبت و متوازن ادب تخلیق کرنے میں کافی مددگار ثابت ہو سکتے ہیں،مگر افسوس ابھی تک ڈاکٹر سید عبدالباری کو ادب میں وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جس کے وہ حامل تھے۔امید ہے ان پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے بعد ان کی اہمیت اور افادیت میں کچھ اور اضافہ ہوگا نیز ادب میں ان کو وہ مقام بھی حاصل ہوگا جس کے وہ حقدار ہیں۔ڈاکٹر سید عبدالباری پر اس نوعیت کا یہ پہلا تحقیقی مقالہ ہے جس میں صرف ان کی جملہ ادبی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔امید ہے میرے بعد بھی اسکالر ان کے فکر و فن اور ان کی تنقیدی و تحقیقی خدمات پر نئے زاویئے سے تنقیدی جائزہ پیش کریں گے۔جس کے نتیجے میں ان کی فنی جہت،اہمیت اور مرتبے میں مزید اضافہ ہونے کے امکانات باقی ہیں۔

☆☆☆☆☆

کتابیات

کتابیات

بنیادی ماٰخذ

شعری مجموعے

طرب خیز (غزلوں کا مجموعہ)، ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۰ء

فکر انگیز (نظموں کا مجموعہ)، ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۰ء

خاکوں کا مجموعہ

انوکھے لوگ نرالی باتیں، ڈاکٹر سید عبدالباری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۹ء

تنقیدی مضامین کے مجموعے

آدابِ شناخت، ڈاکٹر سید عبدالباری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۸ء

ادب اور وابستگی، ڈاکٹر سید عبدالباری، دانش بک ڈپو، ٹانڈہ، امبیڈکر نگر، یوپی، ۱۹۸۵ء

افکارِ تازہ، ڈاکٹر سید عبدالباری، بھارت آفسٹ پریس، دہلی، ۱۹۹۷ء

تراوشِ خیال، ڈاکٹر سید عبدالباری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۳ء

کاوشِ نظر، ڈاکٹر سید عبدالباری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۱ء

مابعد جدیدیت کا تناظر، ڈاکٹر سید عبدالباری، ادارہ ادب اسلامی ہند، دہلی، ۲۰۱۱ء

نقدِ عیار، ڈاکٹر سید عبدالباری، نشاط آفسٹ پریس، ٹانڈہ، ۱۹۹۱ء

نئی خوشبو نئے خواب، ڈاکٹر سید عبدالباری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۰ء

تحقیقی مضامین

آزادی کے بعد اردو زبان و ادب، (مرتب) ڈاکٹر سید عبدالباری، انسی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسڈیز نئی دہلی، ۱۹۹۸ء

اردو ادب کا تہذیبی تناظر، ڈاکٹر سید عبدالباری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۲ء

بیسویں صدی کے اردو ادب کا جائزہ، ڈاکٹر سید عبدالباری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۲ء

عملی اردو، ڈاکٹر سید عبدالباری، دانش بک ڈپو، ٹانڈہ، ۱۹۸۳ء

لکھنؤ کا شعر و ادب، ڈاکٹر سید عبدالباری، الفلاح پبلیکیشنز ،نئی دہلی، ۱۹۹۶ء

لکھنؤ کے ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر، ڈاکٹر سید عبدالباری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۲ء

مغربی تہذیب کے اثرات اردو ادب پر، ڈاکٹر سید عبدالباری،

سوانح

حیاتِ جہانگیر اشرف سمنانی، ڈاکٹر، سید عبدالباری، دانش بک ڈپو ٹانڈہ، ۲۰۰۴ء

انٹرویو کا مجموعہ

ملاقاتیں، ڈاکٹر سید عبدالباری، انسی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹیڈ ز ،نئی دہلی، ۲۰۱۳ء

سفر نامہ

جلوے ہیں بے شمار، ڈاکٹر سید عبدالباری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۷ء

اسلامیات

اسمائے حسنٰی اور کردار سازی، ڈاکٹر سید عبدالباری، انسی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹیڈ ز ،نئی دہلی، ۲۰۰۹ء

اسلام میں آزادیِ رائے اور آدابِ اختلاف، ڈاکٹر سید عبدالباری، قاضی پبلشر اینڈ سٹری، ۲۰۰۸ء

انسان دوستی اور جمہوریت، ڈاکٹر سید عبدالباری، انسی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹیڈ ز ،نئی دہلی، ۲۰۱۳ء

دہشت گردی اور اسلام، ڈاکٹر سید عبدالباری، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز ،نئی دہلی،

آزادی کا سفر، ڈاکٹر سید عبدالباری، آل انڈیا ملی کونسل، دہلی،

مسلم تنظیمیں آزادی کے بعد، ڈاکٹر سید عبدالباری، انسی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹیڈ ز ،نئی دہلی،

فکرِ اسلامی کی عالم گیریت، ڈاکٹر سید عبدالباری، انسی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹیڈز ،نئی دہلی،

اداریوں کا مجموعہ

روشنی بکھرتی ہے، مرتب، انتظار نعیم، ادارۂ ادب اسلامی ہند، دہلی، ۲۰۱۲ء

ثانوی مآخذ

آل احمد سرور، مسرت سے بصیرت تک، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

ابوالکلام قاسمی، مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۲ء

ابوالکلام قاسمی، مرزا غالب فن اور شخصیت، اردو اکاڈمی، دہلی، ۲۰۱۱ء

ابوالکلام قاسمی، شاعری کی تنقید، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

ابوالکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء

ابوالکلام قاسمی، کثرت تعبیر، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء

ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، مکمل جلد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۰ء

ابن فرید، ادب داد طلب، ادارۂ ادب اسلامی ہند، ۲۰۰۲ء

احمد خان، اردو ادب میں اودھ، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۱۰ء

احمد سجاد، تعمیری ادبی تحریک، افکار و مسائل، قاضی پبلشرز و ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء

اعجاز حسین، اردو شاعری کا سماجی پس منظر، کارواں پبلیشرز، آلہ آباد، ۱۹۶۸ء

احتشام حسین، جدید ادب، منظر اور پس منظر، مرتبہ، جعفر عسکری، اتر پردیس اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۶ء

احتشام حسین، عکس اور آئینے، سرور پریس لکھنؤ، ۱۹۶۲ء

احتشام حسین، تنقیدی نظریات، مکمل جلد، اتر پردیش اردو اکادمی، ۲۰۰۹ء

احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۶ء

احتشام حسین، غالب کا تفکر، غالب انسی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء

احتشام حسین، روشنی کے دریچے، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۹ء

احتشام حسین اردو کی کہانی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

احتشام حسین، اعتبارِ نظر، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۱۰ء

احتشام حسین، افکار و مسائل، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۱۴ء

احتشام حسین، ادب اور سماج، کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی، ۱۹۴۸ء

اختر انصاری، غزل اور غزل کی تعلیم، قومی کونسل برائے گروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء

اختر بستوی، سیکولرزم اور اردو شاعری، اتر پردیس اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۶ء
اسدا ریب، اردو مرثئے کی سرگزشت، عاکف بک ڈپو، دہلی، ۲۰۰۸ء
افتخار عالم خاں، سرسید احمد خاں، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۸ء
الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، (مرتب) وحید الدین قریشی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۶ء
امام امداد اثر، کاشف الحقائق، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۸۲ء
امتیاز احمد، آل احمد سرور، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۵ء
انتظار نعیم (مرتب)، ڈاکٹر ابن فرید بے بدل انساں ۔ بے مثل قلم کار، ادارۂ ادب اسلامی، ۲۰۰۶
انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، کتابی دنیا، ۲۰۱۳ء
انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ایم آر پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء
انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ، ایم آر پبلیکیشن، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء
انور علی دہلوی (مرتب) اردو صحافت، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۳ء
اوصاف احمد (مرتب)، تبصرے اور تنقیدیں، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء
اوصاف احمد (مرتب)، اسلامی تہذیب کے ابعاد، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز، نئی دہلی، ؟؟
ایم حبیب خاں، انشاءاللہ خاں انشا، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۹۶ء
پرکاش چندر گپت، پریم چند، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۶ء
تابس مہدی، تنقید و ترسیل، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۱۱ء
تابس مہدی (مرتب)، میرا مطالعہ، مرکزی مکتبہ اسلامی ہند، دہلی، ۱۹۹۳ء
تحسین فراقی، غالب ۔ فکر و فرہنگ، غالب انسی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء
تنویر احمد علوی، اصول تحقیق و ترتیب متن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء
تنویر احمد علوی (مرتب)، اردو تحقیق، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۰ء
توقیر احمد خان، مومن خان مومن، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۷ء
جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، (مکمل جلد)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۳ء
جمیل جالبی، ارسطو سے ایلیٹ تک، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۲ء
حامد اقبال صدیقی، سیماب اکبر آبادی، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۹ء
خالد محمود، ادب کی تعمیر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء

خالد محمود، اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء
خالد محمود، سرور الہدا (مرتبین) اردو صحافت ماضی اور حال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء
خالد محمود، اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۲ء
خرم مراد، تحریک اسلامی کا عام کارکن، اسلامی ادب، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء
خلیل احمد الحامدی، تحریک اسلامی کے عالمی اثرات، اسلامی ادب، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء
خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۷ء
خواجہ اکرام الدین (مرتب)، اردو میڈیا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۲۰۱۴ء
خواجہ اکرام الدین (مرتب)، اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
نئی دہلی، ۲۰۱۴ء
خورشید احمد، جدید اردو افسانہ، ہیت و اسلوب میں تجربات کا تجزیہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۷ء
خورشید الاسلام، تنقیدیں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء
خوشحال زیدی، نئے تنقیدی زاویئے، بزم خضر راہ، دہلی، ۲۰۰۹ء
رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۷ء
زبیر رضوی (مرتب) نئی نظم، مکتبہ ذہن جدید، دہلی، ۲۰۰۷ء
زینت اللہ جاوید (مرتب)، عزیز بگھروی، شخصیت اور فن، ادارہ ادب اسلامی ہند، ۲۰۰۲ء
سردار جعفری، لکھنؤ کی پانچ راتیں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء
سلیم اختر، تنقیدی دبستان، بک کارپوریشن دہلی، ۲۰۰۹ء
سلیم اختر، اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۸ء
سید اسعد گیلانی (مرتب)، اسلامی نظریہ ادب، ادارہ ترجمان القرآن، اردو بازار لاہور، ۱۹۸۸ء
سیدہ جعفر، تفہیم و تجزیہ، (تنقیدی مضامین)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۸ء
سید شکیب ارسلان، فاروق بانسپاری، حیات و خدمات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۷ء
سید شکیل احمد انور، تحریک اسلامی مرحلے اور تقاضے، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء
سید عبدالباری (مرتب) م نسیم کے ادب پارے، ادارۂ ادب اسلامی ہند، نئی دہلی، ؟
سید عبدالباری (مرتب) آزادی کے بعد اردو زبان و ادب، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء
سید عبدالباری، امام شاہ ولی اللہ دہلوی، حیات و خدمات، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز، نئی دہلی، ؟؟

سید عبدالباری، سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین، دانش بک ڈپو، ٹانڈہ، ؟؟
سید عبداللہ، اشارات تنقید، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء
سید مجاور حسین، قومی یکجہتی کے عناصر، اتر پردیش اردو کادمی لکھنؤ، ۲۰۰۴ء
سید مسعود حسین رضوی ادیب، ہماری شاعری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۸ء
سید وقار عظیم، اردو ڈرامہ فن اور منزلیں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۵ء
سید وقار عظیم، فنِ افسانہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۹ء
شارب ردولوی، جدید اردو تنقید، اصول و نظریات، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۲ء
شارب ردولوی (مرتب)، معاصر اردو تنقید، مسائل اور میلانات، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۴ء
شارب ردولوی (مرتب)، آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۱ء
شاہ رشاد عثمانی، تعبیر و تشکیل، اپلائڈ بکس، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء
شاہ رشاد عثمانی، نظریاتی ادب، اپلائڈ بکس، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء
شاہ رشاد عثمانی، ادب کا اسلامی تناظر، اپلائیڈ پبلی کیشنز پرائیویٹ لیمیٹیڈ، ۱۹۹۹ء
شاہد ماہلی، داغ دہلوی، غالب انسی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء
شاہد ماہلی (مرتب)، کیفی اعظمی فن اور شخصیت، معیار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء
شاہد ماہلی (مرتب)، بیسویں صدی کا تخلیقی ذہن اور غالب، غالب انسی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء
شاہد ماہلی (مرتب)، مومن خاں مومن ایک مطالعہ، غالب انسی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء
شاہد ماہلی (مرتب)، داغ دہلوی، غالب انسی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء
سلیمان اطہر جاوید، رشید احمد صدیقی، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۶ء
شبلی نعمانی، موازنۂ انیس و دبیر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء
شبلی نعمانی، شعر العجم مکمل جلد جلد، دار المصنفین، آعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
شمش الرحمٰن فاروقی، اردو غزل کے اہم موڑ، غالب اکیڈمی دہلی، ۲۰۰۶ء
شمش الرحمٰن فاروقی، لفظ و معنٰی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء
شمش الرحمٰن فاروقی، شعر غیر شعر اور نثر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۵ء
شمش الرحمٰن فاروقی، تنقیدی افکار، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۸۲ء
شمش الرحمٰن فاروقی (متراجم)، شعریات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء

شمس الرحمٰن فاروقی، تفہیم غالب، غالب انسی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء
شمیم حنفی (مرتب) آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۹ء
شمیم حنفی، نئی شعری روایت، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء
شمیم حنفی، جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء
شہزاد انجم، خواجہ الطاف حسین حالی، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۷ء
شہزاد انجم، سید احتشام حسین، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۸ء
صابرہ سعید، اردو ادب میں خاکہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء
صدیق الرحمٰن قدوائی (مرتب)، غالب کی تفہیم وتعبیر کے امکانات، غالب انسی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء
ضیاالدین انصاری، جگر مرادآبادی، ساہتیہ اکاڈمی، دہلی، ۱۹۹۲ء
ظفر انصاری، جدید اردو مثنوی فن اور فکر العباد، کتابی دینا، ۲۰۱۳ء
ظفر حبیب، تفہیمات وتنقیدات، الاتحاد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
ظہیر احمد صدیقی، مومن خاں مومن، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۲ء
ظہیر رحمتی، غزل کی تنقیدی اصطلاحات، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۱۰ء
عائشہ بیگم، تاریخ اور سماجیات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء
عائشہ طلعت خلجی، اردو میں خاکہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ، ایم آر پبلیکیشن، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء
عبادت بریلوی، جدید شاعری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۵ء
عبادت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقاء، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۶ء
عبادت بریلوی، غزل اور مطالعہ غزل، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۴ء
عبادت بریلوی، تنقیدی زاوئے، جمال بک ڈپو، دہلی، ۱۹۵۷ء
عبدالرحمٰن بجنوری، محاسنِ کلامِ غالب، اتر پردیس اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۵ء
عبدالحلیم شرر، گزشتہ لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ؟
عبدالحق کمال، ہندو پاک میں ترقی پسند اردو شاعری، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء
عتیق اللہ، تنقید کی جمالیات، مکمل جلد، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۱۴ء
عتیق اللہ، محمد حسین آزاد، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۸ء
عزیز بگھروی، انتظار نعیم (مرتبین)، حفیظ میرٹھی، فن اور شخصیت، ادارہ ادب اسلامی ہند، ۱۹۹۳ء

عشرت رحمانی، اردو ڈرامہ کا ارتقاء، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۶ء
عشرت رحمانی، اردو ڈرامہ کی تاریخ وتنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۹ء
عفت آرا (مرتب)، نظری تنقید، مسائل ومباحث، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء
عفت زریں، لکھنؤ کا دبستان نثر، چوڑی والان، دہلی، ۲۰۰۰ء
عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم: نظریہ وعمل، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۲ء
عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب، فن اور روایت، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۱۳
علی جواد زیدی، دو اسکول، نسیم ڈپو لکھنؤ، پہلا ایڈیشن
علی جواد زیدی، میر انیس، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۶ء
علی سردار جعفری، پیغمبرانِ سخن، مکتبہ گفتگو، بمبئی، ۱۹۷۰ء
ف س اعجاز، نیاز فتح پوری، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۱۱ء
فراق گورکھپوری، اندازے، ادارۂ انیس اردو، آلہ آباد، ۱۹۰۹ء
فرمان فتح پوری، اردو نثر کا فنی ارتقاء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء
فرمان فتح پوری، اردو شاعری کا فنی ارتقاء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء
فضل امام، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء
مظہر احمد (مرتب)، منٹو خاکے، ایم آر پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء
فہیم الدین احمد (مرتب)، تحریک اسلامی ہند کی علمی وفکری کاوشیں، سنٹر فار اسٹڈی ریسرچ، ؟
قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، خواجہ میر درد، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۸ء
قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، تنقید وتفہیم، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۱۲ء
قمر رئیس (مرتب)، معاصر اردو غزل، مسائل ومیلانات، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۶ء
قمر الہدیٰ فریدی، اردو داستان تحقیق وتنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۰ء
کامل قریشی، (مرتب)، اردو غزل، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۱ء
کامل قریشی، اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۴ء
کمال احمد صدیقی، غالب کی شناخت، غالب انسی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء
کلیم الدین احمد، قدیم مغربی تنقید، اترپردیس اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۴ء
کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، بک امپوریم پٹنہ، ۱۹۸۳ء

کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، بک امپوریم پٹنہ، ۱۹۶۸ء
کلیم الدین احمد، تحلیل نفسی اور ادبی تنقید، الفیصل اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۱ء
کوثر مظہری، جدید نظم، حالی سے میراجی تک، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۸ء
کوثر مظہری، وحید اختر، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۸ء
کوکب قدر سجاد علی مرزا، واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۰ء
گوپی چند نارنگ، اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۲ء
گوپی چند نارنگ، ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۴ء
گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۱ء
گوپی چند نارنگ، فراق گورکھپوری شاعر، نقاد، دانشور، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۸ء
گوپی چند نارنگ، مابعد جدیدیت پر مکالمہ، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۸ء
گیان چند، اردو کی نثری داستانیں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۲ء
مبین مرزا (مرتب) اردو کے بہترین شخصی خاکے، مکمل جلد، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۱۵ء
متین طارق باغپتی، تحریک کے کارکنوں کے اوصاف اور ان کی ذمہ داریاں، اسلامی ادب، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء
محمد حسن، معاصر ادب کے پیش رو، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء
محمد حسن، ادبیات شناسی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۰ء
محمد حسن، قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، (اٹھارویں صدی تک) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۷ء
محمد حسن، دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۰ء
محمد حسن، اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۹۸ء
محمد حسن، مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ، انجمن ترقی اردو بیورو، دہلی، ۲۰۰۰ء
محمد حسن، طرزِ خیال، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۶ء
محمد حسن، ہئیتی تنقید، ہندوستانی زبانوں کا مرکز جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۷۳ء
محمد حسین عسکری، انسان اور آدمی، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۳ء

محمد حسین آزاد، آب حیات، اتر پردیس اردو اکادمی لکھنؤ،۲۰۰۳ء
محمد شاہد حسین، ڈرامہ فن اور روایت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۹ء
محمد شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۳ء
محمد شہاب الدین، اردو میں حج کے سفرنامے، یونی ورسل بک ہاؤس، علی گڑھ، ؟؟
محمد صادق، ترقی پسند اردو غزل، آغاز وارتقا، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۱۲ء
محمد نجات اللہ صدیقی، ادب اسلامی، نظریاتی مقالات، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء
محمد نجات اللہ صدیقی، تحریک اسلامی عصر حاضر میں، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء
محمد ہادی حسین، مغربی شعریات، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء
محمود الٰہی، اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، اتر پردیس اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۵ء
مرزا جعفر حسن، بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب، اتر پردیس اردو اکادمی، ۱۹۷۸ء
مسیح الزماں، اردو تنقید کی تاریخ، اتر پردیس اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۳ء
مظفر حنفی، میر تقی میر، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۹ء
مظفر حنفی، جدیدیت، تجزیہ اور تفہیم، (مرتبہ) نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۸۵ء
معین احسن جذبی، کلیات جذبی، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۶ء
ممتاز حسین، ادب اور شعور، اردو اکادمی سندھ، ۱۹۶۱ء
ممتاز حسین، ادبی مسائل، مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۵۵ء
ممتاز حسین، نئے تنقیدی گوشے، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۴ء
مناظر عاشق ہرگانوی، سہیل عظیم آبادی، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۹۲ء
منظر اعظمی، اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، اتر پردیس اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۹ء
منظر عباس نقوی، اردو تنقید مسائل ومباحث (مرتبہ) شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۹۳ء
منیجر پانڈے، ادب کی سماجیات، تصور اور تعبیر، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء
مولانا سلیمان ندوی، معارف، پریس اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء
مولانا سید احمد عروج قادری، تحریک اسلامی کا مزاج، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ادب، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تحریک اسلامی کامیابی کے شرائط، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء
مولانا عبدالسلام ندوی، شعرالہند، (حصہ اول) دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ؟
مولانا محمد یوسف، تحریک اسلامی کی اساس، اسلامی ادب، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء
مولانا صدرالدین اصلاحی، تحریک اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء
مولوی عبدالرحمٰن، میرأۃ الشعر، مطبع، یوسف برقی پریس، بلی ماران، دہلی، ۱۹۲۶ء
مہتاب حیدر نقوی، خلیل الرحمٰن اعظمی، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۱ء
ناصر عباس نیر، جدید اور مابعد جدید تنقید، انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان، ۲۰۰۹ء
نصیر احمد ناصر، جمالیات قرآن حکیم کی روشنی میں، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۴ء
نصیر احمد خاں، تاریخ زبان اردو، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۱۶ء
نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء
نعیم صدیقی، تحریک اسلامی، اسلامی ادب، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء
نورالحسن نقوی، فنِ تنقید اور تنقید نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۳ء
نورالحسن ہاشمی، دہلی کا دبستانِ شاعری، اتر پردیس اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۲ء
وحید اختر، فلسفہ اور ادبی تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۶۵ء
وقار عظیم، اردو ڈرامہ فن اور منزلیں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۵ء
وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۴ء
وزیر آغا، تنقید اور مجلسی تنقید، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۲ء
وزیر آغا، تنقید اور جدید اردو تنقید، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء
وزیر آغا، نظم جدید کی کروٹیں، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۸ء
وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء
وہاب اشرفی، تاریخ ادب اردو، مکمل جلد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۷ء
وہاب اشرفی، قدیم مغربی تنقید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۰ء
وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت، مضمرات وممکنات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء
وہاب اشرفی، معنیٰ کی تلاش، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۸ء
وہاب اشرفی، کلیم الدین احمد، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۱۲ء

ہمایوں اشرف (مرتب) اردو صحافت، مسائل اور امکانات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء

رسائل

پیش رفت، دہلی، ماہنامہ ۱۹۹۳ء سے تا حال تک سبھی شمارے

دوام، ٹانڈہ، ماہنامہ کے تمام شمارے

دوام نو، ٹانڈہ، ماہنامہ، کے تمام شمارے

عالمی سہارا، ماہنامہ، دہلی، ستمبر ۲۰۱۳ء

فانوس، ماہنامہ، لاہور، دسمبر ۲۰۱۶ء

ملی اتحاد، دہلی، ماہنامہ، ۲۰۰۴ سے ۲۰۱۳ تک سبھی شمارے

☆☆☆☆